اُردو غزل

مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

محمد رؤف

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
(غالبؔ)

عبدالرحمن

اُردو غزل

مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

محمد رؤف

روہی بکس

گلی نمبر 2، ماڈل ٹاؤن اے، کوتوالی روڈ، فیصل آباد

موبائل: 0342-7607239

روہی بکس کتابی سلسلہ نمبر ا

نام کتاب : اُردو غزل مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

مصنف : محمد رؤف

ناشر : محمد اکرم عارؔبی

سن اشاعت : جون 2015ء

کمپوزنگ : ابرار حسین

قیمت : -/450روپے

روہی بکس

گلی نمبر 2، ماڈل ٹاؤن اے، کوتوالی روڈ، فیصل آباد 0342-7607239

برانچ

عقب ہاکی سٹیڈیم بہاولپور 0307-8678667

انتساب

والد مرحوم محمد حسن بھٹی
کے نام

جن کے بغیر جی نہیں سکتے تھے، جیتے ہیں
پس طے ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ نہیں

می دہد رخنۂ دیوار زگلزار خبر
لطفِ اندامِ تو از چاک گریباں پیداست (صائبؔ)

"Is not the most erotic portion of a body where the garment gapes." (Rolan Barthes)

فہرست

تفصیل مشمولات

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

چند باتیں

میر تقی میرؔ کا ایک غیر معروف سا شعر ہے:

صُورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدّعا کچھ اور

یہ مقالہ اسی ''مدّعا کچھ اور'' کی رمز شناسی کے لیے ایک کاوِش ہے۔ جنگِ آزادی سے یوم آزادی تک کا عرصہ ہماری تہذیبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کا آغاز اگر صبحِ کاذب کی طرح کا ہے تو انجام صبحِ صادق سے کم نہیں، تاہم اسی دوران میں ہمیں برطانوی قوم کی براہ راست غلامی کے سیاہ ادوار بھی دیکھنا پڑے۔ ان حالات میں اردو ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ غزل بھی معاصر صورت حال سے پوری طرح ہم آہنگ رہی۔ بل کہ اگر یوں کہا جائے کہ نو آبادیاتی دور میں صنفِ غزل اُردو ادب کی دیگر تمام اصناف سے بڑھ کر مغرب مرکوز (Westo Centric) رہی اور اس کا اہم ترین سروکار سیاسی نوعیت کا تھا، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ نو آبادیات کی بنیاد مغربی مرکزیت کے قیام، قبولیت اور استحکام سے عبارت تھی، البتہ اس کی تعمیر میں خرابی کی اک مضمر صورت بھی مقامی کلامیے کے مزاحمتی تفاعل کی صورت میں موجود تھی۔ مابعد

نوآبادیاتی مطالعہ اس دور کے آئیڈیالوجیکل مؤثرات سے نکل کر اور مغربی مرکزیت کے تصوّر کو پس انداز کرتے ہوئے معروضیّت اور بے تعصّبی کے ساتھ اس عہد کا صحیح منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

نوآبادیاتی دور کی غزل ایسی تفہیمی کاوش کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس صنفِ سخن کو محض دل کو خوش رکھنے کے خالی خولی خیالات کا مجموعہ جان کر نظر انداز بل کہ نظر بند کرنے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں حال آں کہ یہ صنف تحریکِ آزادی کی نظریاتی تشکیل کا ایک اہم وسیلہ رہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بالعموم غزل کو شاعر کا کلام سمجھ کر پڑھنے کے بہ جاے عاشق کا کلام فرض کرلیا جاتا ہے اور اسی مفروضے کے تحت اس پر عشقیہ تعبیر مسلط کر کے بات ختم کردی جاتی ہے؛ اللہ اللہ خیر صلا!! ایسے میں یہ شکایت عام ہے کہ تحریکِ آزادی کے ہنگامہ خیز ادوار میں بالخصوص اردو غزل ہمارے معاشرتی اور سیاسی احساسات سے بے تعلق رہی۔ متغزّلین بے چارے بہتیرا اسٹپٹائے کہ:

تیری سمجھ کے آگے ناقص نہیں عبارت
گو ہم سے حرفِ مطلب لکھنے سے رہ گیا ہے (سوداؔ)

مگر مقتدر کلامیے کے انتدابی ایوانوں میں لکھنے سے رہ جانے والے حرفِ مطلب کی کہی ان کہی یعنی متن کے سکوت (Sileneces) اور غیابات (Absences) کے لیے کم ہی اعتنا برتا گیا۔ ظاہر ہے کہ آئیڈیالوجی کا نشہ ترشی سے ہوا نہیں ہوتا، دھیرے دھیرے اترتا ہے اور عالمِ خُمار کے معاملات و افکار کی صوابت معلوم۔ بات سُخن گسترانہ صحیح مگر مراد صرف اس قدر ہے کہ ہمارے کچھ تنقیدی تجزیے نظرِ ثانی کے محتاج ہیں اور ان سے صرفِ نظر کرنا ادبی دیانت کو اپنے ہاتھ سے دینے کے مترادف ہے۔ آج جب کہ ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پار کر آئے ہیں؛ برطانوی عہدِ غلامی سے تقریباً ایک صدی کا معروضی فاصلہ میسّر آچکا ہے؛ یوں بھی فی زمانہ ''زندہ قرأت'' کا طریق عام مروج ہو چکا ہے لہٰذا ایسے میں بڑی معقول بات ہوگی کہ ہم عہدِ غلامی کے جملہ متنی سرمائے اور اس کے متعینہ حاصلات و نتائج کا ایک آزاد قاری کی حیثیت سے مابعد نوآبادیاتی جائزہ مرتّب کریں تا کہ اس کی روشنی میں استعماری قوتوں اور مقامی لوگوں کے باہمی ثقافتی رشتوں یعنی مفاہمت، مزاحمت، مطابقت پزیری یا مصلحت پسندی وغیرہ جیسے رویّوں کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ

کیا جاسکے۔ زیرِ نظر تحقیق کا مقصد اردو غزل کے حوالے سے اسی نوع کے حاصلات ونتائج کی جمع آوری ہے۔ اس مقالے میں پیش کردہ تحقیقی حاصلات کے لیے حتی المقدور داخلی شہادتوں تک محدود رہنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم اگر کہیں مفروضے سے مدد لینا پڑی تو اس کے دست یاب مویدات بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مفروضات کی بنا پر حتمی فیصلے نہیں ہوتے مگر قانون کی نظر میں وقوعیاتی شہادت (Circumstantial Evidence) کی گنجایش بہ ہر طور رہتی ہے۔

اس تحقیقی کاوش میں معاونت فرمانے پر میں اپنے اساتذہ کرام بالخصوص ڈاکٹر محمد آصف اعوان (چیئر مین شعبۂ اُردو)، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر طارق ہاشمی اور ڈاکٹر محمد سعید کا بے حد شکر گزار ہوں۔ یہاں ڈاکٹر جمیل اصغر صاحب کا حوصلہ افزا تعاون بھی قابلِ حوالہ ہے۔ اُنھیں کی وساطت سے اس کتاب پر پروفیسر ڈاکٹر ابنِ کنول (صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی) کی وقیع رائے دستیاب ہوئی۔ مزید برآں کتاب کا ایک مضمون بھی جامعہ دہلی کے مؤقر جریدے میں طباعت کے لیے منتخب کیا گیا۔ محترم امجد طفیل اور ڈاکٹر روِش ندیم کی آراء بھی میرے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ میرے معاون دوست احباب میں شبیر احمد اسد، مقصود احمد اور محمد ارشد کی محبتیں بھی ہمیشہ یاد رہیں گی۔ اس وقت میرے لیے اپنی رفیقۂ حیات سعدیہ عندلیب اور بچوں، عبداللہ حمّاد اور فاطمہ کی یاد خوش گوار بھی ہے اور کسک آمیز بھی، کیوں کہ ان کی چھوٹی چھوٹی معصوم سی خوشیاں تحقیقی مصروفیات کی زد میں آتی رہیں تاہم اُمّید ہے کہ وہ مجھے اپنا سمجھ کر معاف کر دیں گے۔

محمد رؤف

شعبۂ اردو

گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج

سمن آباد، فیصل آباد

(۰۳۰۰-۷۳۰۶۹۹۲)

۳/اپریل ۲۰۱۵ء

تبریک

آدم تا ایں دم اس دنیائے آب و گل نے نہ جانے کتنے نشیب و فراز دیکھے، ترقی کی کتنی منازل طے کرتے ہوئے آج خلاؤں میں مختلف سیاروں پر یہ خاکی انسان کمندیں ڈالنے لگا۔ ہزاروں برسوں کی تاریخ میں نہ جانے کتنی زبانیں وجود میں آئیں اور تاریخ کا حصہ بن گئیں، نہ جانے کتنی تہذیبیں زیر زمین دفن ہوگئیں، نہ جانے کتنی صورتیں خاک میں پنہاں ہوگئیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تغیر یا تبدیلی وقت کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح عمر کے ساتھ انسانی جسم کی ساخت تبدیل ہوتی ہے، انسان کا مزاج بدلتا ہے، زبان یا لہجہ میں تبدیلی آتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ادب کی اصناف اور ان کا مزاج ماحول اور زمانے کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب داستان، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ مقبول ترین اصناف میں شمار ہوتی تھیں لیکن آج صرف تاریخ یا نصاب کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے۔ لیکن اس زبان کے قلم کاروں نے ہیئتی اور موضوعاتی اعتبار سے ہر طرح کے تجربات کیے ہیں۔ کبھی اس کے منفی اور کبھی مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔

اردو شاعری میں غزل ایسی صنف ہے جس کی مقبولیت ہر عہد اور ہر حال میں قائم رہی

ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ہر ماحول کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اندر تبدیلی اختیار کی ہے۔غزل کے دو مصرعوں نے عاشق کے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے اور جنگ آزادی کے مجاہد کو حوصلہ بھی بخشا ہے، امرا کے عیش ونشاط کا ذریعہ بھی غزل بنی ہے اور غربا کے درد کی آواز بھی غزل میں سنائی دی ہے۔محمد رؤف صاحب نے غزل کی اس انفرادیت کا اظہار اپنی اس کتاب میں کیا ہے۔یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے منفرد نظر آتی ہے۔اس کے مطالعہ سے مصنف کے مطالعہ کی وسعت کا علم ہوتا ہے۔گذشتہ تین صدیوں کے سیاسی انتشار اور شعری رویوں سے یہ کتاب متعارف کراتی ہے۔ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ادب کی ہر صنف متاثر ہوئی اور نئی اصناف وجود میں آئیں۔آزاد، حالی کی آواز غزل کی حکمرانی کو ختم کرنے کے لیے بلند ہوئی، لیکن غزل گو شعرا نے اپنی غزل کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کر کے غزل کی سربلندی کو قائم رکھا۔محمد رؤف صاحب نے نو آبادیاتی نظام کے بیچ غزل کے بدلتے رجحانات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔انھوں نے حسرت کی غزل گوئی کا بھی ذکر کیا اور وہ ترقی پسند غزل گو شعرا کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔بلاشبہ رؤف صاحب اس تحقیقی وتنقیدی کاوش کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ارباب ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر ابن کنول

صدر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

ابتدائیہ

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اردو تنقید میں نئے مباحث کا آغاز، اس اعتبار سے خوش آیند تھا کہ تنقید میں نئے تصورات، نئی اصطلاحات اور نئی لفظیات کا اضافہ ہوا۔ چالیس، پچاس سال تک جدیدیت اور نئی تنقید کے زیرِ اثر رہنے کے بعد اردو تنقید نئے نظری تناظر سے آشنا ہوئی۔ اس سے ساختیات، پسِ ساختیات، ردِ تشکیل، قاری اساس تنقید اور پھر مابعد جدیدیت کے مباحث ایک تسلسل سے اردو تنقید کا حصہ بنتے چلے گئے۔ جہاں ان مباحث نے نئے نظری و تنقیدی مسائل کی طرف ہمیں متوجہ کیا وہاں بعض اوقات ہمارے اندر شدّت سے اس احساس کو بھی اجاگر کیا کہ زیادہ تر یہ مباحث نظری سطح پر تو بہت دلفریب دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ان کے متن پر اطلاق کی باری آتی ہے ادبی متن کی تفہیم میں ان نظری مباحث کی نارسائیاں ہم پر آشکار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ویسے بھی میں اپنی کتاب ''ادب کا عالمی دریچہ'' میں اس موضوع اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔

نئے تنقیدی تصورات میں سب سے نیا بیانیہ ''نوآبادیاتی'' حوالے سے ادبی متون کا مطالعہ ہے اور اپنے اطلاقی پہلو کے اعتبار سے مجھے یہ سب سے جاندار حوالہ دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس نظری تناظر میں یہ گنجائش موجود ہے کہ ہم اپنے ادبی سرمائے پر نئے سرے سے سوچ بچار کر

سکتے ہیں۔ ادب کے رموز وعلائم کی نئی معنویت متعین کر سکتے ہیں اور ادب پر بار دیگر نگاہ ڈال کر نیا معنوی بیانیہ تشکیل دے سکتے ہیں۔

ہمارے ادب میں اس ضمن میں دیگر کاوشوں کے پہلو بہ پہلو محمد رؤف کا مقالہ ''اُردو غزل: مابعد نو آبادیاتی مطالعہ'' قارئین کو اس تنقیدی مبحث کی طرف متوجہ کرنے کی اچھی کاوش معلوم ہوتا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل یہ مقالہ ہمیں اردو غزل کو نو آبادیاتی نظری تناظر میں سمجھنے کی دعوت دیتا ہے اور ہمارا دھیان اس طرف کامیابی سے مبذول کرواتا ہے کہ ہمیں دیگر ادبی اصناف خصوصاً داستان، قصیدے، مرثیے اور مثنوی کو بھی اصناف کو نو آبادیاتی نظری تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی تاکہ پتہ چل سکے کہ برطانوی استعمار کے زیرِ اثر کون کون سی بنیادی تبدیلیاں ان اصناف میں رونما ہوئیں اور تخلیق کاروں نے کن کن فنّی حربوں سے برطانوی آباد کاروں کی چال بازیوں کو اور ہندوستان کے وسائل کو لوٹنے کی حیلہ جوئیوں کو بیان کیا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں ہمیں اردو غزل کو مابعد نو آبادیاتی نظری تناظر میں سمجھنے کی اچھی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ محمد رؤف نے ژرف نگاہی سے اردو غزل کا مطالعہ کیا ہے۔ خاص طور پر کمپنی کی حکومت کے زیرِ اثر حیدر آباد دکن میں ولی دکنی اور دیگر شاعروں کے پہلو بہ پہلو یو۔پی میں میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، وغیرہ کے ہاں سے بعض بہت اہم اشعار کی نشاندہی کی ہے۔ انشاؔ کو انہوں نے استعمار پسند شاعروں کی ذیل میں رکھا ہے، اس کے لیے انھوں نے انشاء کے اشعار سے حوالے دیے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر نقاد کے پاس متن کا حوالہ موجود ہے تو اس کے کسی بھی بیان کو ہمیں بہت سنجیدگی سے لینا ہوگا۔

مقالہ نگار نے غالبؔ اور میرؔ سے بھی اچھے اشعار اپنے موقف کے حق میں استعمال کیے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ غالب کے درج ذیل شعر کو مغلیہ سلطنت کے انہدام سے جوڑتے ہیں تو قاری چونک اٹھتا ہے اور انھیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے:

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا

یہاں میں بالخصوص داغ دہلوی کے حوالے سے مقالہ نگار کی عبارت آرائی کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ داغ دہلوی کو ابھی تک ایک عامیانہ شاعر کے روپ میں پیش کیا جاتا رہا ہے تھا اور اس کی بڑی وجہ یہی سامنے آتی ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری اور محمد حسین آزاد کے تنقیدی مقالات سے نو آباد کار کے مفادات میں جو ذہنی فضا تیار ہوئی اس میں چُن چُن کر داغ کے کے اشعار کو مبتذل کلام کے طور پر نقل کیا جاتا رہا۔ سبطِ حسن ان لکھنے والوں میں تھے جنہوں نے داغ کے ہاں حریتِ فکر کی نشاندہی کی۔ فراق نے اپنے انداز میں داغ کے اشعار کو ہندوستانی لوگوں کی جنگِ آزادی سے جوڑا۔ اب جو نوجوان ناقد محمد رؤف نے اپنے مقالے میں داغ کی شاعری کے استعمار مخالف آہنگ کو نمایاں کیا ہے تو ہمیں گمان گزرتا ہے کہ اب تک اردو تنقید نے داغ دہلوی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ داغ کی شاعری کو نو آبادیاتی تناظر میں سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے امید ہے کہ اس حوالے سے زیرِ نظر مقالے کا داغ کی شاعری پر لکھا گیا تنقیدی شذرہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا۔

مقالہ نگار نے، اکبرؔ، حسرتؔ، اقبالؔ اور ترقی پسند شاعروں کے ہاں بھی نو آبادیاتی اثرات کے خلاف مزاحمت کی نشاندہی کی ہے اور اسے وہ ''جارحانہ مزاحمت'' کا عنوان دیتے ہیں۔ اس باب میں ترقی پسند شعرا کی غزل اور یورپی شعرا کی غزل گوئی والے حصے قدرے تشنہ محسوس ہوتے ہیں۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ ان میں مزید تفصیل ہوتی تو بہتر تھا۔

محمد رؤف کا طرزِ نگارش اچھا ہے اور ان کے بعض جملوں پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے مزاج میں توازن ہے اور وہ نظری انتہا پسندی سے بچتے ہوئے اپنے موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی بنا پر ہمیں ان میں ایک اچھا نقّاد بننے کے امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ اردو کے سنجیدہ ناقد کے طور پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

امجد طفیل

لاہور

۱۶ر مارچ 2015ء

مقدمہ

انسان نے جب قدیم غیر طبقاتی نظام سے نکل کر خاندان، جائیداد اور ریاست کی تکون میں قدم رکھا تو جہاں وہ اعلیٰ وادنی طبقات میں تقسیم ہو کر استحصال کا شکار ہونے لگا، وہاں اس نے دیگر انسانی گروہوں پر قبضوں اور فتوحات سے ابتدائی نوآبادیات کا بھی آغاز کیا۔ کیونکہ ''میں'' و ''میرا'' کی انفرادی سوچ اور جائیداد کا تصور ایک ساتھ ابھرے جس سے ملکیت کے تحفظ وانتقال کے لیے خاندان کا ادارہ وجود میں آیا۔ ملکیت وطبقات نے انسانوں کو حاکم ومحکوم اور طاقتور و کمزور میں تقسیم کر کے ایک لامتناہی استحصال میں مبتلا کر دیا۔ ریاست کی باقاعدہ تشکیل اسی کشمکش کو طاقت کی بنیاد پر ایک باقاعدہ نظام کی شکل دینے سے ہوئی۔ ایک معاشرے کے اندر طبقوں کے استحصال اور معاشرے کے باہر نوآبادیات کے استحصال کو کنٹرول کرنے کے لیے حکومت، پولیس، فوج، قانون اور افسر شاہی وضع ہوئی۔ حکمران طبقات نے اس داخلی وخارجی استحصالوں کو تمام سماجی، معاشی، سیاسی، علمی، مذہبی عمل سے جوڑ کر تہذیب وثقافت کی شکل دی۔ یوں امیر وغریب، حاکم و محکوم، طاقتور و کمزور، اپنا وغیر، نیکی وبدی، جرم واطاعت، غلامی وآزادی اور میرا وتمہارا وغیرہ جیسے تصورات وجود میں آئے۔ گویا طبقاتی ونوآبادیاتی استحصال اور قبضوں کے قومی، مذہبی، اخلاقی،

نظریاتی اور تہذیبی جوازوں اور اس کے لیے فکری و آئینی نظاموں کی تشکیل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے ردعمل میں محکوم و مظلوم طبقوں، جمعیتوں اور قوموں میں غلامی، استحصال اور جبر کے خلاف مزاحمتی افکار و نظریات اور جدوجہد ابھری۔ جو کبھی جناب موسیٰؑ، جناب عیسیٰؑ اور جناب محمد مصطفیٰؐ کی تحریکوں، کبھی گوتم بدھ اور گورونانک کے افکار اور کبھی یونانی و رومی غلاموں کی بغاوتوں کی صورت میں سامنے آئے۔ ہماری چار پانچ ہزار سالہ تہذیبی تاریخ اسی کشمکش کی بنیاد پر آگے بڑھی۔ غلام داری، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام اسی کشاکش کی بنیاد پر تعمیر ہوئے اور قبضہ شدہ انسانوں کو زندہ آلات کے طور پر کبھی غلام، کبھی ہاری اور کبھی مزدور کی شکلوں میں ڈھالتے رہے لیکن یہ محکوم و مظلوم لوگ انقلابی و باغیانہ انداز میں بالادست طبقات کے قبضہ گیروں کو چیلنج بھی کرتے رہے۔

قدیم ادوار میں مصر، عراق، یونان، ایران جبکہ وسطی ادوار میں روم، عرب، قیصر و کسریٰ، ہندوستان اور وسط ایشیائی ترک اقوام کی فتوحات، قبضہ گیری اور استحصال کی عظیم داستانیں ہیں۔ اس عمل کا ایک محرک غیر متمدن گروہوں اور اقوام کا ان تہذیبی مراکز پر چڑھ دوڑنا بھی تھا جو اپنی شائستگی و تہذیب کے باعث طاقت کا روایتی تصور و توازن کھو بیٹھے تھے۔ جبکہ دوسرا محرک ترقی یافتہ اقوام کا اپنی طاقت کے تحت تہذیب و ترقی اور برتری کا نظریہ لے کر ''غیر متمدن'' اقوام پر نوآبادیات قائم کرنا تھا۔ ''طاقت اساس'' سماجی ڈارون ازم پر مبنی یہ دونوں محرکات ایک دوسرے کے ساتھ یوں ہم آہنگ رہے ہیں کہ غیر متمدن اپنی فتوحات کے بعد اسی تہذیبی شائستگی کا خود بھی ''شکار'' ہوتے رہے ہیں اور یوں تاریخ کی یہ جبریت تاریخ کے عمل کو آگے بڑھاتی رہی ہے۔ ایتھنز اور سپارٹا، روم اور قدیم یورپ، عرب اور قیصر و کسریٰ، بغداد اور منگول، ہندوستان اور وسط ایشیا کی باہمی پیکار اس کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح ازمنہ وسطیٰ میں مسلم بادشاہتوں کے عربی، عراقی، اطالوی، ہسپانوی، ایرانی، ہندوستانی، وسط ایشیائی، مصری، ترکی، بلقانی، تورانی مراکز و نوآبادیات بھی اسی کا تسلسل تھا۔

عرب قبائلی غلام داریت پر قائم قریشی تاجروں کے استحصالی نظام کے خلاف حضرت محمد علیہ السلام کے نچلے طبقہ کے حمایت یافتہ انقلاب نے آئین پسند قومی نظامِ خلافت تشکیل دیا لیکن

تاریخی جبر میں یہی خلافت ملوکیت میں ڈھلی اور جاگیرداریت کی بنیاد پر مسلم بادشاہت قائم ہوئی۔ نئے جاگیردار شاہی طبقات نے اپنے بڑھتے ہوئے طبقاتی مفادات، ملکیتوں اور قبضوں کو بچانے کے لیے عرب اسلامی انقلاب کی فکری حرکیات کو روایتی ملائی مذہبیت میں ڈھال کر طبقاتی استحصال کے لیے راہ ہموار کر لی۔ اسی داخلی دباؤ نے مال غنیمت اور کشور کشائی کے لیے ایشیا، افریقہ اور یورپ کی طرف فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ جس طرح کے استحصالی نظام کے خلاف حضور اکرم علیہ السلام انقلاب لائے تھے، مسلمان بادشاہتیں پہلے سے کہیں زیادہ جبروت کے ساتھ اسی کا شکار ہو گئیں جو کہ داخلی سطح پر طبقاتی صورتوں میں اور خارجی سطح پر نو آبادیاتی شکلوں میں قائم ہوا۔ بربریوں، خارجیوں، قرامطیوں سمیت صوفیوں کی شکلوں میں نچلے طبقات اور محکوم طبقات و اقوام کی بغاوتوں نے سر اٹھایا۔ یہی وجہ تھی کہ ملوکیت کے آغاز سے ہی امت مسلمہ میں مسلمانوں کے ہاں دو مختلف مکاتب فکر کی تشکیل کا آغاز ہو گیا جن میں سے ایک قرآن کے انقلابی، استحصال مخالف، ترقی پسند زاویے سے نظریاتی طاقت لیتا رہا جبکہ دوسرا شاہ پرست، تبدیلی مخالف، طاقت پرست اور روایت پسند رہا۔ مسلمانوں کی تاریخ اسی نظریاتی کشمکش پر آگے بڑھی۔ مسلمانوں کے تاریخی کردار پر مورخین نے اس پر سوال اٹھایا کہ کیا مسلمانوں کی اس جاگیرداریت و بادشاہت کی تاریخ کو ''اسلامی تاریخ'' کہا جائے؟ گو اقبال نے عہد جدید میں اسلامی فکر کی اسی انقلابیت کی تشکیلِ نو کرتے ہوئے ملوکیت کو اس کی ملائیت و پیشوائیت سمیت شدید تنقید کا نشانہ بنایا لیکن اپنے شعری کلام میں جاگیرداریت و بادشاہت کی حامل اسی ''اسلامی تاریخ'' کے داخلی طبقاتی تضادات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس پر تفاخر کا اظہار بھی کیا۔ رشید اختر ندوی جیسے مورخ نے ''طلوعِ اسلام'' میں اسی حوالے سے لکھا ہے کہ ''میرے نزدیک (مسلم زوال کا) یہ وقت خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔۔۔ جناب امیر معاویہؓ کے طرز عمل سے مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی اور مسلمان اپنی دنیوی سربلندیوں کے باوجود وہ نہ رہے جیسے کہ رسول اللہ چاہتے تھے۔'' ندوی صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''اگر اسلام میں ملوکیت نہ آتی تو آج کمیونزم عالم وجود میں نہ آتا اور دنیا کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کی اندرونی زندگی سے گھبرا کر کمیونزم کے دامن میں پناہ نہ لیتا۔''

قدیم اور وسطی ادوار میں نوآبادیات کے اپنے تقاضے اور طریق کار تھے۔ قدیم ٹیکنالوجی، ایجادات، علمی ڈھانچے، ریاستی نظم اور سماجی ذہنی تشکیل کے باعث نوآبادیات کے وہی انداز ممکن تھے۔ آج کی تیز رفتار سائنسی ترقی کے مقابلے میں رسل و رسائل اور نقل و حمل کی پسماندہ سہولتوں کی وجہ سے اس دور کے طاقتور طبقات کی ریاستی گرفت ایسی نہ تھی۔ اسی لیے فاتحین اپنی دور دراز مقبوضات پر منتقل ہوتے رہے اور مذہب، رنگ، نسل، زبان اور تہذیب کی برتری کے نظریے کو طبقاتی استحصال اور نوآبادیات کے جواز و حمایت کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یہ طویل المعیاد نوآبادیاتی منصوبوں کی حامل پُرتشدد حاکمیت ہی تھی جس نے محکوم و مفتوح اقوام کے رسم الخط، زبانیں، ثقافتیں، کردار، نفسیات، افکار، علوم، ادب اور مذہب تک بدل دیے اور اس حد تک بدل دیے کہ لوگ اپنے حقیقی و قدیم ورثے تک کو یا فراموش کر بیٹھے یا انہیں کمتر و حقیر خیال کرنے لگے۔ قبل از تہذیب پتھر کے ہندستانی دور سے لے کر یورپی اقوام کی آمد تک ہندستان کئی اقوام کی نوآبادی بنتا رہا۔ ہندوستان پر دراوڑ، آریائی، یونانی، ساکائی، پارتھی، سیتھیائی، کشان، ہن، وسط ایشائی، ایرانی، عرب، پشتون، افغان، انگریز، پرتگالی، ولندیزی اور فرانسیسی وغیرہ جیسے کئی حملہ آور قبضہ گیری کے لیے آئے۔ اس دوران یہاں رسم الخط، زبانیں، ثقافتیں، افکار، علوم، ادب اور مذاہب سب بدلتے چلے گئے۔ ہر نئی نوآبادیاتی تبدیلیوں کے باعث لوگوں نے قدیم ورثے کو غیر اور کمتر سمجھا۔ ہماری زبانیں، نقوش، افکار، تعمیرات، ادب اور اعتقادات تمام فاتحین کے اثرات کی گواہی دیتے ہیں۔ کثرت میں وحدت کی صورت میں پاک و ہند کا تہذیبی مزاج اسی تاریخ کی دین ہے اور تاریخ کا سفر اسی کشمکش سے آگے بڑھتا رہا۔ تاریخ کے تمام تر مادی و غیر مادی حاصلات پاک و ہند کی تمام اقوام کا مشترکہ اثاثہ ہیں لیکن یہاں کی ہر قومی جمعیت نے وقتی طور پر اپنے نوآبادیاتی تفاخر کے باعث اس کلی تاریخ کا انکار کرتے ہوئے اس میں کانٹ چھانٹ بھی کی اور اپنے ڈانڈے بھی نوآبادیاتی سرچشموں سے ملاتے رہے۔ پاک و ہند کا مسلمان نظریاتی طور پر ابھی تک عربی و فارسی جبکہ معاشی، سیاسی اور علمی طور پر یورپی اقوام کے نوآبادیاتی اثر میں رہے ہیں جسے انگریز نوآبادیات کے دوران ہندوستانی نیشنلزم کو کمزور کرنے کے لیے خوب بڑھاوا دیا گیا۔ لہٰذا اب یہی نیشنلزم بلوچی، سندھی، سرائیکی، پختون، بنگالی، کشمیری وغیرہ کی صورتوں میں ابھر کر اپنے

اپنے تہذیبی وثقافتی ورثوں کے ساتھ جڑت بنا رہا ہے۔

جس طرح سے عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کی حیرت انگیز عالمی فتوحات میں مسلم تاجر و جاگیردار طبقات کے پس منظری محرکات کو نظر انداز کر کے اسے محض کلمہ طیبہ کے طلسم سے جوڑ دیا جاتا ہے اسی طرح یورپی سرمایہ دارانہ نوآبادیاتی عمل کی ہمہ گیر عالمی فتوحات کے سرمایہ دارانہ محرکات کو نظر انداز کر کے اسے بھی محض اس کلمے سے جوڑ دیا جاتا ہے کہ انگریز تجارت کے لیے آئے تھے اور پھر ملک پر قبضہ کر لیا۔ آج کی عالمی وقومی سیاست، اقتصادیات، سماجیات اور تاریخ و نظریات کو نوآبادیات کے پس منظر اور اقدام کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ چونکہ یہی علم نئے شعور کی بنیاد ہے اس لیے اسے ہی چھپا کے رکھا جاتا ہے کہ جدید یورپی نوآبادیاتی نظام سرمایہ داریت کی دین تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز تک ترقی یافتہ ہندوستان کے ساتھ یورپی تجارت سے ابھرنے والے سرمائے نے ہی یورپی نشاۃ الثانیہ اور سرمایہ داری انقلاب میں بنیادی کردار ادا کیا تھا جس میں یورپی قزاقوں کی افریقہ و امریکہ اور بعد ازاں ایشیا میں لوٹ مار، قبضہ گیری، غلاموں کی فروخت اور دھونس دھاندلی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ میں اسی سے جمع شدہ سرمائے کی پیدا کردہ سماجی سیاسی طاقت سے نئے سرمایہ دار نے جاگیرداریت کو شکست دی تھی جس کے نتیجے میں نئے ابھرنے والے شعور نے سائنس کو فروغ دے کر صنعتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ گویا مغربی جاگیردار اور کھیت مزدور کے مقابلے میں تاجر طبقہ ہی تھا جس نے تجارتی سرمائے سے طاقت حاصل کر کے جاگیرداری نظام کا اس کی حامی کلیسائیت سمیت خاتمہ کیا۔ تجارتی سرمائے کے پیدا کردہ اس طبقے نے جاگیردارانہ سوچ کے ردعمل میں خدا، کائنات اور انسان کا نیا شعور تشکیل دیا۔ جس سے تعلیم، تحقیق، تنقید، سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی، سوچ اور معاشرے کے اطوار بدلے۔ جاگیردار کی جگہ سرمایہ دار، کسان جگہ مزدور، بادشاہ کی جگہ جمہوریت، احکام خداوندی کی جگہ قانون، شاہی حکم کی جگہ آئین، دستکاری کی جگہ مشین، مذہب کی جگہ سائنس، مدرسے کی جگہ یونیورسٹی، کھیت کی جگہ فیکٹری اور زرعی اجناس کی جگہ مصنوعات نے لے لی۔

مشین کی ایجاد سے مصنوعات کی بڑھتی ہوئی رفتار کے لیے منافع بخش مارکیٹ اور خام مال کی طلب میں شدید اضافہ ہو گیا۔ مصنوعات، مارکٹنگ اور خام مال کی تکون ہی نئے سرمایہ دارانہ

یورپ کی معیشت، سیاست، سماجیت، علمیت اور عسکریت کی بنیاد بنی۔ یوں قومی و عالمی سطح پر ایک اندھے اور سفاک تجارتی مقابلے کی فضا بنی جو آخر تجارتی اجارہ داری میں ڈھل گئی۔ اس عمل میں بڑے تاجروں، سرمایہ داروں، فیکٹریوں، بینکوں، مارکیٹوں، فارم ہاؤسوں نے اپنے سے چھوٹوں پر قبضے جما لیے۔ ان اجارہ دار سرمایہ داروں نے اپنی طاقت، منافعے اور مارکٹنگ کو مزید بڑھانے کے لیے اپنے گروپ بنا کر بڑی بڑی کمپنیاں قائم کرلیں جو کثیر اقسام مصنوعات بنانے لگیں۔ چاکلیٹ، صابن، دوائی، جہاز، کار، اسلحہ، کھاد، فون وغیرہ ایک ہی ملٹی نیشنل کمپنی کے تحت بننے لگے۔ نیا نظام سیاست و معیشت چونکہ سرمایہ داروں کی دین تھا لہٰذا اس پر بھی ان ہی کی اجارہ داری بنی۔ بعدازاں کثیر قومی کمپنیاں اپنے سرمائے کے بل بوتے پر اتنی طاقتور ہوتی چلی گئیں کہ وہ اپنے سیاسی نمائندوں کے ذریعے سے ملکی خارجہ و داخلہ پالیسیاں بھی اپنے کاروباری حساب سے تشکیل دینے لگیں جس کے لیے اسلحہ سازی، جنگی منصوبہ بندی اور بعداز جنگ قرضوں، تعمیراتی ٹھیکوں اور معدنی وسائل تک رسائی اہم ترین اہداف بن گئے۔ گویا ایک سرمایہ دارانہ ریاست مکمل طور پر سرمایہ داریت ہی کی نمائندہ بن کر رہ گئی۔

تجارتی کمپنیوں کی پیداوار، ان کی مارکٹنگ اور خام مال کے حوالے سے طلب و رسد کا عدم توازن منافعوں میں کمی کا باعث ہوتا ہے۔ منافعوں کو برقرار رکھنے بلکہ بڑھانے کے لیے خام مال، پیداوار اور مارکٹنگ میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اس کے لیے ریاستی اداروں جیسے حکومت، فوج، عدلیہ، پولیس، افسر شاہی، میڈیا اور تعلیم وغیرہ کو کام میں لایا گیا۔ نتیجتاً نت نئی ایجادات، دریافتیں، ٹکنالوجی اور سائنس نے نہ صرف مصنوعات کی پیداوار میں مزید اضافہ کیا بلکہ خام مال کی بڑھوتری اور مارکٹنگ کے اثر و رسوخ کو بھی پھیلایا۔ سستے مزدوروں، مکینکوں اور مستریوں کے حصول اور ٹیکس جیسے دیگر محصولات میں کمی یا چھوٹ بھی منافعوں کو شرح کو بہتر بنانے میں بہت اہم تھی۔ پھر مقابلے کی بجائے اجارہ داری کے فوائد کو کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ یوں منافعوں کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹانا ناگزیر تھا۔ یہ سرمایہ دار ملکوں میں قومی سرمایہ داری کی اندرونی صورت حال تھی۔ جب وہاں مذکورہ بالا عوامل ایک حد سے زیادہ منافعوں کے پھیلاؤ

میں معاون نہ رہے، مصنوعات کی پیداوار اور اس کے لیے خام مال کی طلب کے مقابلے میں صارفین اور مارکیٹ کی طلب میں اضافے کی شرح بھی اطمینان بخش نہ رہی تو سرمایہ دار حکومتوں نے اپنے ملکوں سے باہر دیکھنا شروع کر دیا، یہیں سے طویل المعیاد نوآبادیاتی منصوبہ بندی کا آغاز ہوا۔

سرمایہ دار اقوام نے بتدریج پسماندہ جاگیردار ممالک پر قبضوں کے ذریعے خام مال، مزدور، زمین اور مارکیٹ کے ساتھ ساتھ تجارتی راستوں، محصولات اور دیگر سہولتوں پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کیا جس کے لیے نوآبادیات کے غلام لوگوں کے ذہن و کردار کو کنٹرول کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کے لیے اولین طور پر وہاں کی ثقافت، سماجیت، تاریخ، نفسیات، علوم، ادب اور زبان کو مستشرقین کے ذریعے سمجھا گیا، ریاست کی تشکیل نو کی گئی، نئی نظریہ سازی کے ذریعے نیا ورلڈ آؤٹ لک وضع کیا گیا جس سے غلاموں کو کمتر، بدتہذیب اور پسماندہ جبکہ مغربی اقوام کو اعلیٰ، مہذب اور ترقی یافتہ باور کرایا جا سکے۔ یہ کام سماجی، سیاسی، ثقافتی، علمی، صحافتی اور مذہبی اداروں سمیت نئے تعلیمی نظام کے ذریعے سے لیا گیا۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے محکوم افراد کے ادب، موسیقی، رقص، لباس، تعمیرات، آداب، معاشرت میں جدیدیت کے تحت سوچ، اطوار، نفسیات اور رویوں کو ان کے تاریخ و ثقافت سے برگشتہ کر دیا گیا۔ یوں جدیدیت کے ذریعے نوآبادیات کو اپنے سرمایہ داری مفادات کے لیے مکمل طور پر تیار کر لیا گیا۔ اب ٹی وی، فلم، اخبار، تعلیم، اشتہار، مسجد، مزار، ہسپتال، مذہب، عقائد، ادیب، استاد، صحافی، فوجی، اداکار، عید، شب برات، حب الوطنی گویا سب کچھ سرمایہ داری کی مارکٹنگ اور صارفیت کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اپنی جغرافیائی سرزمینوں سے نکل کر سرمایہ داری نے جنگل، پہاڑ، سمندر، صحرا، خلا، زمین، ہوا، پانی، ذرے، ستارے ہر شے کو علم و تحقیق کے ذریعے اپنے کام کا بنا لیا اور تمام معاشرے کو منڈی، ہر چیز کو جنس اور ہر فرد کو صارف میں بدل دیا گیا۔ یوں سرمایہ داری دن دگنی ترقی کرنے لگی۔ دنیا دو طبقات میں بٹ گئی۔ ایک بنانے والی دوسری استعمال کرنے والی، ایک بیچنے والی دوسری خریدنے والی، ایک خام مال والی دوسری مصنوعات والی، ایک سرمایہ دار دوسری مزدور، ایک کارخانہ دار دوسری منڈی، ایک سامراج دوسری نوآبادی۔ ان دو دنیاؤں کا فرق ہی ان کی حاکم و محکوم حیثیتوں کا فرق ہے۔

محکوم نوآبادیاں، ان کی حکومتیں اوران کے عوام حاکموں کے اشاروں پر چلنے لگے کیونکہ وہ نوآبادیات اوراس کے پس منظر کا شعور نہیں رکھتے۔ وہ اجتماعی طور پر اپنی اس حیثیت کو بدلنے کی صلاحیت سے محروم کردیے گئے ہیں۔ ان کے صارفی قبائلی وجاگیرداری نظام ان کی محکومیت اور مغرب کی حاکمیت کی علامت ہیں۔ جب تک نوآبادیات کی حامل دنیا اس کے شعور سے بہرہ مند ہو کر جاگیردارانہ نظام کو اس کے افکار وطرز عمل سمیت رد نہیں کردیتی۔ قومی نظام وفکر کا تنقیدی تجزیہ اور ہمہ گیر تبدیلی ایک مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ استحصالی قوتیں اس کی اجازت کسی سطح پر نہیں دے سکتیں کیونکہ یہ تبدیلی ان کی موت ہے۔ اس تمام عرصے میں سرمایہ داریت، سامراجیت اور نوآبادیت پر تنقید بھی یورپ میں ہی ہوئی جو مارکسی دبستان کے روپ میں تنقیدی علم کا ایک مستقل عنوان بن گئی۔ اس نے نوآبادیات کے حوالے سے اس تلخ حقیقت کا انکشاف کیا کہ پاک وہند کا جدید عہد کی طرف راستہ اس کی نوآبادیاتی غلامی ہی سے گزر کر جاتا ہے اور یہ شعور بھی دیا کہ سرمایہ دار اقوام کی بین الاقوامی نوآبادیاتی جبر اپنی نت نئی صورتوں میں آج بھی جاری وساری ہے۔ خاص کر دوسری جنگ عظیم کے بعد سائنسی ترقی نے اپنی ایجادات، جدید ٹکنالوجی اور علوم کے ذریعے اتنی ترقی حاصل کرلی کہ اب وہ پوری دنیا پر اپنی براہ راست موجودگی کے بغیر اسے کنٹرول کرسکتی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کا جدید نوآبادیاتی نظام اسی انداز سے قائم ہوا ہے۔

ادب وفن جہاں انسان کے تہذیبی وثقافتی اظہارات کی سب سے اعلیٰ جمالیاتی وفکری صورت ہے وہاں یہ ایک تاریخی ریکارڈ کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فطرت اور سماج کے جبر اور ان کے سامنے انسان کی بے بسی کی تصویریں بھی پیش کرتا ہے اور ملوکیت، سامراجیت اور طبقات کے استحصال، جبر اور قبضوں کی تہوں میں دبے دکھوں اور المیوں، خوابوں، امیدوں، حوصلوں اور نفسیاتی وکرداری الجھنوں کو بھی آشکار کرتا ہے۔ اگر تاریخ بڑے دھارے میں ایک بڑے اجتماع کے دوربینی مطالعے کا نام ہے تو ادب وفن فرد کی سطح پر خوردبینی مشاہدہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ تاریخ کسی اونچے مینار سے شہر کو دیکھنا ہے اور ادب کسی گلی میں کھڑے ہو کر قریب ترین احساساتی مطالعہ ہے۔ یوں اگر ادب ایک زاویے سے تاریخ کا کردار نبھا رہا ہوتا ہے تو دوسری سطح پر تاریخ سے آگے بھی

بڑھ جاتا ہے۔ بطور صنفِ مادر اردو غزل کی ساڑھے تین سو سالہ روایت کا مطالعہ اس حوالے سے انتہائی اہم ہے۔

ہمارے ہاں نوآبادیاتی، سرمایہ داری، سامراجی اور استحصالی صورت حال کے مطالعے کی روایت ترقی پسندوں کے ہاں زیادہ واضح رہی ہے۔ ترقی پسندوں کی سامراج دشمن اشتراکی فکر کے باعث استحصالی قوتیں ترقی پسندوں اور ان کی فکر کی شدید مخالف رہی ہیں۔ لیکن اشتراکی روس کے زوال کے بعد مابعد جدیدیت کی مغربی فکری روایت کے اثرات ہمارے ہاں بھی آنے لگے ہیں جس کے انحراف پسند مفکرین نے مابعد نوآبادیاتی مطالعات کو بھی رواج دیا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں نئی نسل کی آمد کے ساتھ ہی اس قسم کے نئے موضوعات بھی ادبی تحقیقات کا موضوع بننے لگے ہیں۔ اگر مابعد نوآبادیاتی مطالعات محض عالمی طاقتوں کے قبضوں کا ایسا بیان بن کر نہ رہ جائیں کہ ہم نوآبادیاتی نفسیات سے نکلنے کی بجائے مزید جکڑ جائیں تو یقیناً یہ تاریخی شعور کے ابھار میں ایک نہائت خوش آیند روایت بن سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ضروری ہے کہ ہم مغرب اساس / یوروسنٹرک نظریاتی مغالطوں سے نکل جائیں جو بذاتِ خود نوآبادیاتی فکری ڈھانچوں کی دین ہیں۔ نوآبادیاتی نظام نے سرسید جیسے جدیدیت پسندوں سے لے کر ساٹھ کی دہائی کے جدیدیت پسندوں تک تقریباً تین چار نسلوں کو اپنی تعلیم و افکار پر پروان چڑھایا۔ ان کے لاشعور میں یہ بٹھا دیا گیا کہ یورپ اور اس کا فکر ہی اعلیٰ، ارفع اور سچا ہے۔ اس حوالے سے چاہے ہمارا لیفٹ ہو یا رائٹ، دونوں مغالطے کا شکار ہیں اور دونوں عہد جدید کی عالمی تہذیب کو اپنے جنوبی ایشیائی یا وادیٔ سندھ کے تہذیبی و تاریخی تناظر میں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اسی لیے ہم جدیدیت اور مغربیت، نوآبادیات سے آزادی اور جدیدیت سے آزادی، مغربی تناظر اور مشرقی جنوبی ایشیائی تہذیب، مغربیت اور مغربی کلچر، جدید عالمی تہذیب اور سرمایہ داریت وغیرہ میں فرق ہی نہیں کر پاتے۔ لیفٹ والے اشتراکیت کو مغرب اساسیت یا یوروسنٹرک سے الگ دیکھنا نہیں چاہتے اور نہ ہی انہیں سرمایہ دار یورپ سے الگ اسے اس کی دشمن تحریک کے طور پر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے یورپی تناظر سے الگ اور اپنے تہذیب و ثقافتی دھارے میں دیکھنے سے عاری ہیں۔ جبکہ لیفٹ مخالف رائٹ والے اگر

بطور جدیدیت پسند یورپ سے استفادہ کرتے ہیں تو اس کی سامراجی، نوآبادیاتی اور استحصالی حیثیت پر نظر دوڑانا نہیں چاہتے۔ اس کی انتہا یہاں تک ہو جاتی ہے کہ وہ مذہبیت پسند آئیڈیالوجی میں تمام مغرب کو اس کی جدیدیت سمیت کلیتاً رد کرنے کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور رجعت پسندی کے لیے راستہ صاف کر دیتے ہیں۔ یوں ہمارے تمام تر اجتماعی رویے مغربی نوآبادیت اور سرمایہ دارانہ استحصال کے حق میں چلے جاتے ہیں اور مستقبل میں خود انحصاری، آزادی اور خود شناسی کی کسی بھی روشنی کے خاتمے کی امید کا امکان ختم کر دیتے ہیں۔

نوجوان محقق اور نقاد محمد رؤف کا ''اردو غزل: مابعد نوآبادیاتی مطالعہ'' اپنے موضوعاتی دائرے میں اولین سطح کے کاموں میں شمار ہوتا ہے جو انتہائی اہم، قابل توجہ اور لائقِ تحسین ہے۔ اردو غزل درحقیقت پاک و ہند کے دورِ زوال اور خصوصاً نوآبادیاتی کشمکش و تسلط کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ جن دنوں غزل اردو میں رواج پا رہی تھی ٹھیک انہی دنوں مغربی اقوام ہندستان کے ساحلوں پر اتر رہی تھی۔ جب ان کا نوآبادیاتی نظام قائم ہوا تو انہوں نے انجمن پنجاب سے لے کر سرسید تحریک تک غزل کے خلاف ایک صورت حال کی تشکیل بھی کی۔ اردو غزل کا مزاج اور لہجہ جس طرح کی سوگواری، انفعالیت، سادیت پسندی اور الم پرستی کا شکار رہا ہے وہ بذات خود گزشتہ کئی صدیوں سے جاری انحطاط و استحصال کا اظہار ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت، فنی قرینہ اور اظہار و ابلاغ کی طاقت جس طرح سے لوگوں کو آپس میں جوڑے ہوئے تھی، وہی بدیسی حکمرانوں کے لیے پریشانی کا بھی باعث تھی۔ یہ غزل ہی ہے جو نوآبادیاتی تاریخ کی اہم ترین گواہ کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس کے عشق، وصال، ہجر، رقیب، عاشق اور محبوب کی علامتوں اور استعاروں کے حامل مکمل نظام کا نوآبادیاتی مطالعہ یقیناً مطالعے و تجزیے کا نیا زاویہ ہے۔ محمد رؤف کی اس شاندار تحقیق کے بعد اس موضوع پر جرأتمندانہ اور بے باک تحقیق و تنقید کی بہت زیادہ گنجائش کا امکان ابھرے گا۔

ڈاکٹر روِش ندیم

اسلام آباد

برصغیر میں نوآبادیاتی دور کا آغاز وارتقا:

مختصر جائزہ

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراقؔ
قافلے آتے گئے ، ہندوستاں بنتا گیا

(فراق گورکھ پوری)

(الف) ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور

نوآبادیات: مفہوم اور بنیادیں

نوآبادیات (Colonies) کا لفظ نوآبادی (Colony) سے اسمِ جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں نئی آبادی یا نئی بستی۔ کالونی کا لفظ بنیادی طور پر لاطینی اصطلاح Colonia سے نکلا ہے جس سے مراد کچھ منظّم افراد کا کسی دوسری انسانی آبادی کو یرغمال بنا کر اس کے استحصال کے لیے وہاں اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا ہے۔[1] اصطلاحاً یہ لفظ ایک خاص سماجی حالت کا ترجمان ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر اس کی معنوی حدود کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورت حال ہے''[2] اور ایسی صورتِ حالات پیدا کرنے والے مخصوص گروہ کو نوآباد کار کہا جاتا ہے۔

نوآبادیاتی صورتِ حال کے لیے انگریزی میں Colonialism کی اصطلاح مروج ہے جس کی وضاحت اے ڈکشنری آف پالیٹکس میں یوں کی گئی ہے:

"Colonialism: Strictly refered to the policies and methods by which an imperial power maintained and extended its control over other territories or peoples; now more frequently used in a pejorative sense, often synonymous

with imperialism"[3]

فرہنگ اصطلاحات میں اس لفظ کے معنی استعمار پسندی یا استعماریت بیان کیے گئے ہیں۔[۴] نوآبادیات کی اصطلاح سب سے پہلے رومیوں نے استعمال کی۔ وہ جب کسی علاقے پر قبضہ کرتے تو وہاں اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے اپنے افراد پر مشتمل نئی آبادیاں قائم کر لیتے تھے۔ آج کل یہ اصطلاح غیر ملکی اقتدار و تسلط کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔[۵]☆

انیسویں صدی میں یورپی اقوام نے امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جزائر غرب الہند کی طرح ایفرو ایشیائی ممالک پر بھی اپنا تسلط جمایا تاہم اوّل الذکر ممالک کے برعکس یہاں اپنی نو آبادیاں نہیں بسائیں بل کہ کچھ مقامی افراد کی مدد سے انتظامی سطح پر اپنا انتداب قائم کیے رکھا۔ ہندوستان کی مثال لیں تو محض چالیس ہزار بدیسی افراد نے دو لاکھ کی مقامی سپاہ بنا کر بیس کروڑ لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھا۔[۶] نوآبادیاتی صورت حال دو بنیادوں پر قائم کی جاتی ہے؛ نوآبادکار یہ سمجھتے ہیں کہ:

۱۔ ہم بہتر قوم ہیں لہٰذا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

۲۔ ہم مہذب اور ترقی یافتہ ہیں اس لیے غلام قوموں کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔[۷]

اس صورتِ حال کی تشکیل میں یہ تاثر اساسی حیثیت رکھتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام مقامی سماج کی پسماندگی دور کرنے میں نہایت مؤثر کردار ادا کرے گا۔☆ یہ تاثر ہی کسی نوآبادکار کے اس اقتداری کلامیے کی جان ہے جس سے مفتوح قوم کا زاویۂ فکر تبدیل کیا جاتا ہے اور اس کی سحر آمیز تاثیر کے بہ موجب وہ خود ہی اپنی اقدار و روایات کو حقیر جاننے لگتی ہے۔[۸]

برطانوی نوآبادیات میں بھی ایسے ہی اساسی نظریات سے اقتداری کلامیے کی تشکیل کی گئی اور جدید نظامِ خیال کی تشکیل کر کے بہ تدریج یہاں کے تجارتی امور اور ملکی معیشت پر قبضہ کر لیا گیا نیز ایسے میں عوام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترویج کا جھانسہ دے کر محض روایت کے حصار میں بند رکھا گیا۔ تاہم مقامی رعایا نے اس مقتدر کلامیے کے نتیجے اور ردِ عمل میں اپنے فکر و عمل کو جدید خطوط پر استوار کیا جس کے تجزیاتی مطالعہ میں ہمیں قومیت پرستی، مزاحمت کاری، مطابقت پزیری،

احتجاج، منقسم شعور اور تہذیبی آویزش و آمیزش جیسے متنوع رجحانات ملتے ہیں۔ یہ تمام رجحانات اردو ادب اور بالخصوص صنفِ غزل میں بڑی صراحت سے تخلیقی سرمایے کا حصہ بنے ہیں۔

یورپی اقوام کا ورود

پہلے وقتوں میں ہندوستان کا تجارتی مال بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم کے راستے یورپی ملکوں میں پہنچتا تھا۔ جب ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ اور بعد ازاں مصر پر قبضہ کیا تو یہ قدیم تجارتی راستے ان کی اجارہ داری میں چلے گئے۔ ایسے میں یورپی اقوام نے کوئی دوسرا نیا بحری راستہ دریافت کرنے کی ٹھان لی جس کا سہرا پرتگالیوں کے سر رہا۔ بعد میں پرتگالی تاجروں کی دیکھا دیکھی دیگر مغربی اقوام مثلاً ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز وغیرہ بھی ہندوستان آنے لگیں۔

پرتگیزی نوآبادیات

یوں تو مسلمانوں کے پرتگالیوں سے روابط ہسپانوی دور سے چلے آرہے تھے مگر سقوطِ ہسپانیہ (۱۴۹۳ء) کے محض پانچ سال بعد ۲۷ مئی ۱۴۹۸ء کو ایک پرتگالی جہاز ران واسکوڈے گاما جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ آپہنچا[۹] جس سے ہند پرتگالی تجارتی روابط کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس پرتگالی کپتان نے مقامی راجہ زمورون سے تجارتی اجازت نامہ حاصل کرلیا اور ساحل پر کئی تجارتی کوٹھیاں بنالی گئیں۔ المیڈا اور البوقرق پرتگالی تجارتی کمپنی کے دو اہم گورنر تھے۔ یہ لوگ مذہبی تنگ نظری اور بحری قزاقی میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اکبر اعظم کے دور میں ان کی مذہبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ اسی بنا پر شاہ جہاں نے انھیں بنگال سے نکال دیا اور ان کی تجارت بہت محدود ہو کر رہ گئی۔ ولندیزی قوم ان کی مضبوط ترین تجارتی حریف ثابت ہوئی لہٰذا اورنگ زیب کے عہد تک ان کا مذید صفایا ہوگیا۔[۱۰]

ولندیزی نوآبادیات

ولندیزی باشندوں نے ۱۶۰۲ء میں ''ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے ایک تجارتی تنظیم بنائی[۱۱] جو پرائیویٹ سرمایہ داروں پر مشتمل تھی۔ حکومتی سرپرستی اور کمپنی کی اعلا بحری صلاحیت

کے بل بوتے پر اسے بہت فروغ ملا۔ ولندیزی تاجروں نے پرتگالی حریفوں پر خوب ہاتھ صاف کیے البتہ انگریزوں سے ہم سری ان کے بس میں نہ تھی لہٰذا انگریزی اثر و رسوخ بڑھنے پر ولندیزی تاجر انڈونیشیا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی

پرتگالی تاجروں کی دیکھا دیکھی انگریزوں نے بھی ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ایسوسی ایشن بنائی ☆ جسے ملکہ الزبتھ اوّل نے تجارتی حقوق کا خصوصی حکم نامہ جاری کیا۔ ہاکنس اور سر ٹامس راؤ نے مغل بادشاہ جہاں گیر کے دربار سے ''فرمان'' یا ''پروانہ'' کی صورت میں بہت سی تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ اس دور کے ہندوستانی حکمران یورپی تجارت کو ملکی معیشت کے لیے بہت مفید خیال کرتے تھے۔[۱۲] انگریزوں نے سورت کے مقام پر اپنا تجارتی صدر مقام بنایا اور پھر آہستہ آہستہ مدراس اور بمبئی پر بھی قدم جما لیے۔ مزید برآں کالی گھاٹ کے مقام پر کلکتہ کا شہر بسا کر فورٹ ولیم کا مشہور مستقر تعمیر کیا گیا۔ کمپنی کو ایک اہم کامیابی ۱۷۱۷ء میں اس وقت ملی جب فرخ سیر نے برطانوی ڈاکٹر ولیم ہملٹن کے علاج سے شفایاب ہو کر انگریزوں کو صوبہ بنگال میں آزادانہ تجارت کی سند عطا کر دی۔ ☆ بنگال اس دور میں دنیا کا متمول ترین خطہ تھا۔[۱۳] ہندوستان میں کمپنی کی بنیادی غرض و غایت تو محض تجارت تھی تاہم یہاں کی سیاسی صورت حال نے فرنگی تاجروں کو مقامی سیاست میں بھی حصہ لینے پر اکسایا۔ کمپنی ملازمین جو پہلے لوٹ کھسوٹ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اب سیاسی ساکھ بنانے کے لیے کاروباری اخلاقیات کا مظاہرہ کرنے لگے۔ المختصر کمپنی بہادر نے یہاں کی سیاسی بساط پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی

اس کمپنی کا قیام ۱۶۶۴ء میں ہوا۔[۱۴] جب انگریزوں کی مسابقت میں یہ فرانسیسی تاجر بھی مشرقی علاقوں میں گھس آئے تو باہمی مڈھ بھیڑ لازم تھی۔ ان کے تجارتی مراکز بھی (ماسوائے صدر مقام پانڈی چری کے) زیادہ تر ایسے ہی علاقوں میں تھے جہاں انگریز اپنی تجارتی سرگرمیاں

جاری رکھے ہوئے تھے۔ مغل دور کے ایک نواب انوارالدین سے فرانسیسی قوم کی لڑائی اور اس میں نواب کی پس پائی استعماری طاقتوں کے لیے ایک حوصلہ افزا واقعہ تھی۔ اس واقعہ سے بدیسی نو واردان مزید شیر ہو گئے البتہ انگریزوں کے سامنے فرانسیسیوں کے قدم نہ جم سکے اور انھیں بالآخر برطانوی کمپنی کے لیے میدان خالی چھوڑنا پڑا۔

کرناٹک کی لڑائیاں اور کمپنی کی فتح

اٹھارویں صدی مغل حکمرانی کے زوال میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اسی دوران میں مغل سلطنت علاقائی قوتوں کی مسلسل جنگ وجدل سے کمزور ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوئی تھی۔ سیاسی افراتفری کے نتیجے میں مرہٹے، سکھ، روہیلے، جاٹ اور راج پوت طاقتیں ابھریں۔ اس خانہ جنگی کے ماحول میں بنگال، اودھ، حیدر آباد اور میسور میں خودمختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۱ء تک احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے مغل سلطنت کو مزید دھچکا لگا۔ ادھر یورپ میں صنعتی انقلاب آ چکا تھا اور ہر کوئی اپنے صنعتی مال کی کھپت کے لیے ہندوستانی منڈی میں اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا تھا جس کا لازمی نتیجہ باہمی مناقشوں کی صورت میں نکلا۔ اس تناظر میں انگریز اور فرانسیسی برابر کی ٹکر تھے لہٰذا جنوبی ہندوستان میں ان کی محاذ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ فرانسیسی تاجر پانڈی چری میں فوجی اڈا بنا چکے تھے جب کہ انگریز مدراس میں براجمان تھے۔ دونوں قوتیں بالترتیب ڈوپلے اور کلائیو کی زیر قیادت برسرِپیکار رہیں۔ ان میں ۱۷۴۴ء سے ۱۷۶۱ء کے دوران میں تین لڑائیاں ہوئیں نیز تیسری اور فیصلہ کن جنگ میں کلائیو کا پلہ بھاری رہا اور یوں پورے ہندوستان میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ (۱۵)

جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء

صوبہ بنگال مغل سلطنت میں اپنی زرخیزی کے لیے مشہور تھا۔ مغل حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں خودمختار حکومت بن گئی تھی۔ یورپی کمپنیاں ایک عرصے سے اس

علاقے پر اپنی نگاہیں گاڑھے ہوئے تھیں تاہم سراج الدولہ کے والد علی وردی خاں کے ہوتے اسے ہتھیانا مشکل تھا۔ انگریزوں نے ۱۷۱۷ء میں فرخ سیر سے ایک تجارتی پرمٹ ''دستک'' حاصل کر لیا تھا جس کی رو سے وہ بغیر کسی ٹیکس ادائیگی کے اس خطے میں تجارت کر رہے تھے[16] رفتہ رفتہ کمپنی کے ملازمین نے ''دستک'' کی آڑ میں اپنی نجی تجارت بھی شروع کر دی جس سے مقامی حکومت کو ٹیکسوں کی آمدنی میں شدید خسارا ہونے لگا۔ مزید برآں خلاف معاہدہ انھوں نے کلکتہ میں قلعہ بندیاں بھی شروع کر رکھی تھیں۔ کمپنی کی اس دیدہ دلیری کے پیش نظر سراج الدولہ نے ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو کلکتہ پر حملہ کیا اور اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔[17] مدراس میں یہ خبر پہنچی تو کمپنی نے رابرٹ کلائیو (۱۷۲۵۔۱۷۷۴ء) کو اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے کے لیے بنگال روانہ کیا۔ کمپنی کا یہ ردعمل دفاعی کے بجائے جارحانہ نوعیت کا تھا جسے جواز فراہم کرنے کے لیے انھوں نے بلیک ہول ☆ کا قصہ بھی گھڑ لیا تاکہ دیگر حکمران طاقتوں کے اشتعال کی کوئی وجہ پیدا نہ ہو سکے۔ کلائیو جنگی چالوں کا خوب ماہر تھا۔ اس نے نواب کے درباریوں اور بنگال کے تاجر طبقے کو ایک کامیاب حکمتِ عملی کے ذریعے اپنے ساتھ ملا لیا۔ میر جعفر اور بنگالی فوج کے کمانڈر خادم خاں بھی اس سازش کا آلۂ کار بنے اور یوں ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں کمپنی سے کہیں زیادہ وسائل حرب کے باوجود سراج الدولہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔[18]

اس شکست کے بعد میر جعفر کو برائے نام نواب بنا کر کمپنی نے اپنی من پسند شرائط منوائیں اور خوب مال بٹورا۔[19] ☆ میر جعفر کی نوابی کمپنی کے لیے ایک تجرباتی حیثیت رکھتی تھی جسے کارآمد پا کر روبہ عمل رکھا گیا لہٰذا اسے معزول کر کے میر قاسم کو نواب بنایا اور جب انھیں حسبِ دل خواہ کار آمد نہ پایا تو موصوف بھی معزول کر دیے گئے۔

جنگ بکسر ۱۷۶۴ء

میر قاسم بنگال کے نواب ہوئے تو انھوں نے کمپنی کی لوٹ کھسوٹ سے عاجز آ کر اس کے خلاف متحدہ محاذ بنایا۔ اس بنگالی سپوت نے مغل بادشاہ شاہ عالم اور اودھ کے نواب شجاع

الدولہ سے مل کر بہار کے علاقے بکسر کے مقام پر کمپنی بہادر سے بھرپور ٹکر لی۔ ادھر انگریز کمانڈر میجر منرو نے اپنی اعلا جنگی حکمت عملی کے ذریعے نہ صرف اس حملہ آور ٹرائیکا کا مقابلہ کیا بل کہ انھیں ایسی پس پائی سے دوچار کر دیا کہ جن سے کمپنی کا ستارۂ اقتدار بامِ عروج پر نظر آنے لگا۔[20] یہ معرکہ اپنی نتیجہ خیزی میں جنگ پلاسی سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہاں غداری کے بجائے آمنے سامنے کا مقابلہ تھا نیز یہ جنگ محض ایک نواب کی شکست نہ تھی بل کہ اس میں ہندوستان کی نمائندہ طاقتیں سرنگوں ہو گئی تھیں۔

کمپنی راج

جنگ بکسر کی ذلت آمیز شکست سے مقامی حکمرانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ میر قاسم نے راہ فرار اختیار کی، جب کہ شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے ہتک آمیز شرائط پر صلح کر لی۔ ایسے میں انگریز چاہتے تو اپنی خودمختار حکومت بنا سکتے تھے مگر انھوں نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر ایسا نہیں کیا۔ نواب سے بھاری تاوان اور شاہ عالم سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے حقوق لے کر وہ پھر اپنے طے شدہ منصوبے میں لگ گئے۔ انگریز دراصل حکومت پر مکمل قبضہ کرنے کے لیے قانونی جواز تراش رہے تھے تاکہ ایسا کرتے ہوئے انھیں کسی شدید ردعمل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ صلح نامے کے تحت کمپنی نے ۱۷۶۵ء میں بنگال میں دوعملی نظام (Duel System) کا نفاذ کر دیا جس کی رو سے لگان وصولی کا استحقاق اسے مل گیا جب کہ انتظامی ذمہ داری نواب کے سر رہی۔ اب کمپنی بہادر بلا روک ٹوک ہندوستان کی آمدنی پر فوج رکھنے اور اپنا تجارتی منافع انگلستان بھیجنے کی مجاز تھی۔[21]

یہ دوعملی نظام ۱۷۶۵ء سے ۱۷۷۲ء تک رہا۔ اس کے بعد کمپنی کا دوسرا دورِ اقتدار شروع ہوتا ہے جس میں انگریزی مقبوضات کے لیے برطانیہ سے گورنر جنرل بھیجے جاتے تھے۔ یہ دور ۱۷۷۲ء سے ۱۸۵۷ء تک کے دورانیے پر محیط ہے۔ اسی عہد میں کمپنی راج اپنے عروج کو پہنچا کیوں کہ فرنگیوں نے پے در پے فتوحات کر کے حاکم ہند کو محض لال قلعے تک محدود کر دیا اور عملاً اس کی

دست رس میں ایک گاؤں تک نہ رہا۔ (۲۲) ہندوستانی ریاستوں کو اپنے ماتحت لانے کے لیے باقاعدہ ایک الحاقی پالیسی وضع کی گئی جو بہ ظاہر ان کے لیے امن وآشتی اور سیاسی تحفظ کی ضامن تھی مگر در پردہ اسے جواز بنا کر ریاستی حکمرانوں کی آزادیاں گروی کر لی جاتی تھیں۔ حیدر آباد کے نظام، اودھ کے نواب اور مرہٹوں کے پیشوا سے اسی نوع کے الحاقی معاہدے ہوئے۔

میسور کی لڑائیاں

جنوب مغربی ہندوستان کی ایک اہم ریاست میسور کمپنی کی راہ میں حائل آخری چٹان تھی۔ یہاں ۱۷۶۱ء سے ۱۷۸۲ء تک حیدر علی کی حکمرانی رہی۔ اسے کمپنی سے دو مرتبہ جنگ کرنا پڑی مگر ہر دفعہ معاملہ معاہدوں پر ختم ہوتا رہا اور کمپنی بہادر دانت کچکچا کر رہ جاتی۔ حیدر علی کی وفات پر ٹیپو سلطان حکمران بنا تو اس نے ریاست کو جدید یورپی ماڈل پر ترقی دیتے ہوئے کمپنی کی تشویش میں مزید اضافہ کر دیا۔ انگریزوں نے زبردست تشہیری مہم کے ذریعے اس لبرل حکمران کو متعصّب اور انتہا پسند ٹھہرایا اور ہندو رعایا کی نظر میں اسے متنازعہ بنانے کی سازش کی۔ مزید برآں لارڈ کارنو اس نے مرہٹوں اور نظام کو ساز باز کے ذریعے اپنے ساتھ ملایا اور مشترکہ حملہ کر کے سرنگا پٹم پر قبضہ کر لیا۔ سلطان کو مجبوراً آدھی کے قریب ریاست، بہت سا زرِ تاوان اور دو بیٹے یرغمال ٹھہرا کر صلح کرنا پڑی۔ (۲۳) اس خفت کو مٹانے کے لیے ٹیپو نے فرانسیسی قوت کو ساتھ ملایا اور اپنی عسکری قوت بڑھانا شروع کر دی۔ ترکی اور افغانستان سے بھی امداد کے لیے مراسلت کی گئی مگر زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ (۲۴) ٹیپو کے سر پر منڈلاتی سہ فریقی قوت نے اسے زیادہ سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور اس پر فیصلہ کن جنگ مسلط کر دی۔ سلطان کے مصاحبین میر صادق اور غلام علی جیسے کچھ اہم افراد نے مخالف قوتوں کا آلۂ کار بن کر اس کی دفاعی قوت کمزور کر دی اور یوں ۴ مئی ۱۷۹۹ء میں کمپنی راج کی راہ میں حائل یہ رکاوٹ بھی ختم ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ۔۔۔ اسباب، واقعات اور نتائج

قرآن مجید میں ''اِنَّ الْمُلُوکَ''، (۲۵)☆ والی آیت سے واضح ہے کہ جب کشور کشائی

اور فتنہ وفساد پھیلاتے اور کے خواہاں شاہ وسلطان کسی علاقے پر قبضہ کریں تو وہاں کے لوگوں میں فتنہ وفساد پھیلاتے اور انھیں ذلیل وخوار کرتے ہیں۔ یہ رسوائی سیاسی، سماجی، معاشی یا مذہبی کسی بھی نوعیت کی ہوسکتی ہے۔ برطانوی سامراج نے بھی ہندوستان میں ہر نوع کا استحصال روا رکھا۔ یہی استحصالی حربے تحریک آزادی کا محرک بنے۔ ☆ اس دور میں:

۱۔ عیسائی مشنری اپنے مذہب کی خوب تشہیر کرتے تھے اور اس کے لیے سرکاری وسائل اور دیگر ناجائز ذرائع کا استعمال بھی روا رکھا جاتا تھا۔

۲۔ انگریز نسلی تفاخر میں مبتلا تھے اور ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ (۲۶)

۳۔ کسی سڑک، ریلوے لائن یا سرکاری ادارے کے قیام یا اس کی توسیع کے لیے مسجد یا مندر کو مسمار کرنے میں کوئی پس وپیش نہ کی جاتی تھی۔

۴۔ رسمِ ستی کے خاتمے اور بیوہ کی شادی جیسے نوساختہ قوانین ہندو روایات سے متصادم تھے۔

۵۔ ہسپتال یا دیگر پبلک مقامات پر عورتوں کی پردہ داری کے سلسلے میں کچھ انتظامات نہ ہوتے تھے۔

۶۔ تعلیمِ نسواں کے لیے ایسا نصاب اور سرگرمیاں اپنائی گئیں جنھیں مقامی لوگ معیوب جانتے تھے۔

۷۔ حکومت نے جبری قانونی حربوں سے لوگوں کی جاگیروں اور دیگر املاک پر قبضہ کیا۔

۸۔ لارڈ ڈلہوزی نے ریاستی الحاق کی پالیسی (قانون استقراض) متعارف کروا کر والیان ریاست کی نیندیں حرام کردیں، یہ تاثر عام ہوگیا کہ کمپنی دراصل ملک ہتھیانا چاہتی ہے۔ (۲۷)

۹۔ فوجی اصلاحات جیسے انگریزی کٹنگ، داڑھی منڈوانا اور پگڑی کے بجائے ٹوپی وغیرہ کی پابندی جیسے امور بھی سماجی بے چینی پھیلا رہے تھے۔

۱۰۔ ان سب سے بڑھ کر معاشی استحصال بہت پریشان کن تھا۔ انگریز تاجر صرف مال بٹورنے سے سروکار رکھتے تھے اور اسی طرح کمپنی نے بھی مختلف حیلہ جوئیوں سے بہت سی دیسی ریاستوں پر قبضہ کرکے معاشی استحصال شروع کر رکھا تھا۔ (۲۸)

اس جنگ کی فوری وجہ مذہبی نوعیت کی تھی۔ ہوا یہ کہ جنوری ۱۸۵۷ء میں تین فوجی

چھاؤنیوں ڈم ڈم، انبالہ اور سیالکوٹ میں ایک جدید بندوق متعارف کروائی گئی جس کے کارتوس استعمال سے قبل دانتوں سے کاٹنا پڑتے تھے۔ سپاہیوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ ان کارتوسوں پر سؤر اور گائے کی چربی منڈھی ہوئی ہے۔ اس خبر سے کیا ہندو اور کیا مسلمان سبھی سپاہی مشتعل ہو گئے۔ جنرل ہیرسی کو یہ فریضہ سونپا گیا کہ وہ متاثرہ رجمنٹوں کے ساتھ بہ ذاتِ خود افہام و تفہیم کر کے معاملہ حل کرے۔ ہندوستانی سپاہی جنھوں نے چند ماہ قبل کمپنی کو اودھ کا علاقہ ہڑپ کرتے دیکھا تھا، اب انگریزوں کے استعماری عزائم کو پوری طرح بھانپ چکے تھے۔ لہٰذا ۲۹ مارچ ۱۸۵۷ء کو منگل پانڈے کی بندوق سے نکلنے والی گولی نے ہندوستان کی آزادی کے لیے مشترکہ خطوط پر مسلح جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ (۲۹) اس سے قبل مزاحمتی کاوشوں کے مختلف حربے زیادہ تر مسلمانوں ہی کی طرف سے روبہ عمل آتے تھے کیوں کہ اقتدار انھی سے چھینا جا رہا تھا۔ ایک یورپی افسر کے ارادۂ قتل پر منگل کو پھانسی کی سزا ہوئی مگر اس کے جذبۂ حریت نے شمعِ آزادی کے دیگر پروانوں میں حلول کر کے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کے اثرات ہندوستان کے طول و عرض میں محسوس کیے گئے۔ اس تحریک کے عملی مظاہرے کا آغاز مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے ہوا۔ (۳۰) جنگ آزادی کا زیادہ تر زور دہلی یا اس کے مضافاتی علاقوں مثلاً آگرہ، اودھ اور وسطی ہندوستان میں رہا۔ بنگال، مدراس، بمبئی، پنجاب، سندھ، راجپوتانہ اور ہندوستانی ریاستوں میں اس کے اثرات بہت کم تھے۔ (۳۱)

صورت احوال یہ رہی کہ میرٹھ کے مقامی سپاہیوں نے انگریزوں کو قتل کر کے مجاہدانہ جوش و خروش سے مرکز کی طرف پیش قدمی کی اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے بخت خاں کی قیادت میں بہادر شاہ ظفر کو اپنا سربراہ بنا لیا۔ ہندوستان کا یہ آخری بادشاہ یورپی قوت سے مکمل مرعوب ہو چکا تھا لہٰذا اس نے دوغلا کردار ادا کیا یعنی ظاہراً مجاہدین کی سرپرستی قبول کر لی مگر در پردہ قلعہ دار کیپٹن ڈگلس، لیفٹیننٹ گورنر سائمن فریزر اور دیگر انگریزی کارپردازوں سے بھی تعاون جاری رکھا۔ بہادر شاہ ظفر کے نہایت قریبی ساتھی مرزا الٰہی بخش، منشی رجب علی اور خواجہ سرا محبوب علی خاں سب انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ ان کی بیگم زینت محل جو بہادر شاہ کے اعصاب پر

پوری طرح سوار تھی، بہ ذاتِ خود فرنگی سازش کا حصہ بنی۔ وہ انگریزوں کی مدد سے اپنے بیٹے جواں بخت کو، جسے بڑے بھائیوں کے سامنے کوئی وقعت حاصل نہ تھی، ولی عہد دیکھنا چاہتی تھی جب کہ بادشاہ کے بڑے لڑکے مرزا مغل، خضر سلطان، عبداللہ اور ایک پوتا مرزا ابوبکر وغیرہ انقلابی سپاہ سے جا ملے تھے۔ مرزا مغل تخت ہتھیانے کے لالچ میں جہادی گروہ کا سپہ سالار بن گیا۔ انگریزی سپاہ نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے طاقت استعمال کی۔ بخت خاں، بہادر شاہ کو اس سازشی ماحول سے نکال کر دہلی سے باہر ایک فیصلہ کن جنگ کا ارادہ رکھتا تھا مگر مذکورہ بالا سازشی عناصر نے اس کی ایک نہ چلنے دی لہٰذا وہ بے نیل و مرام اپنے جہادی لشکر کو لے کر لوٹ گیا۔ بہادر شاہ اور اس کے لواحقین نے مقبرہ ہمایوں میں پناہ لے لی جہاں سے میجر ہڈسن کی سربراہی میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے وقت ان کی جان بخشی اور وظیفے کی بحالی وغیرہ کے عہد و پیماں بھی کیے گئے تھے مگر مخمور طاقتوں کی وعدہ وفائی معلوم۔ بادشاہ کو قید اور شہزادوں کو راستے ہی میں قتل کر دیا گیا۔ جن افراد نے اس جنگ میں نمایاں کارکردگی دکھائی ان میں نانا صاحب، جھانسی کی رانی، حضرت محل، نانیتا ٹوپی، بخت خاں اور مولوی احمد اللہ وغیرہ اہم تھے۔ (۳۲) جنگ آزادی کی ناکامی کی بڑی وجوہ طوائف الملوکی سے بیزاری، مقامی حکمرانوں سے مایوسی، باہمی ربط ضبط کا فقدان اور جدید اسلحہ سے محرومی تھیں۔

انقلاب کا غلغلہ دبا لیا گیا تو انتقامی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ جنگ کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر ان کے لیے زمین تنگ کر دی گئی۔ انھیں عبرت سکھانے اور اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لیے سولی دینے، پھانسی کے لیے درخت سے لٹکانے، سؤر کی کھال میں سی کر جلانے، توپ سے اڑانے اور بھوکا رکھ کر یا دم گھونٹ کر جان لینے جیسی کارروائیاں سرِعام سر انجام دی گئیں۔ (۳۳) اس طرح یہ خونی واقعہ ''برصغیر کی تاریخ کا ایک جلی عنوان'' بنا۔ (۳۴) اب ہندوستان برطانوی قوم کا باقاعدہ مستملک یا نو آبادی بن چکا تھا۔ اس عہد غلامی میں ہندوستانی معاشرے کو ایک نیا اسلوب زیست اپنانا پڑا۔ مقامی تہذیب کے نمائندہ شاعر مرزا غالب نے اپنے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو خط لکھتے ہوئے جنگ آزادی (''رستخیز بیجا''، (۳۵)☆) کے مابعد دور کو ''دوسرا جنم''

قرار دیا ہے جو پہلے جنم سے یک سر مختلف تھا۔[۳۶] اس واقعہ کی تہذیبی اہمیت کے پیش نظر یقیناً اسے مقامی شعر ادب کا سب سے اہم موضوع ہونا چاہیے تھا لہٰذا احمد ندیم قاسمی اس معرکے کو بجا طور پر ''ایپک'' کا مقتضی سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں مقتدر کلامیے کے جبر کی بنا پر آج تک ہمارا ادبی وجود وطن کی مٹی کا یہ قرض ادا نہیں کر پایا۔ یہ حالات ہی کی سنگینی تھی کہ اقبال جیسا عبقری شاعر برطانوی استعمار کے لیے ''فرنگی'' کا تعمیمی لفظ استعمال کرتا رہا۔[۳۷] کرتے رہے ہوں گے مگر مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے نو آبادیاتی صورت حال کی بے لاگ تجزیہ کاری، استعمار کار اور استعمار زدہ کے استحصال آمیز ثقافتی رشتوں کے بیانیے نیز ایسی غلامانہ فضا سے نکلنے کے لیے مقامی طرز معاشرت سے ہم آہنگ حکمت عملی پر مشتمل تخلیقی ادب پارے جوان کی کارگاہِ فکر میں ڈھل کر ادبِ عالیہ کا حصہ بنے ،نو آبادیاتی ادبی سرمایے کے ایسا شاہ کار ہیں جنھیں کسی بھی استحصالی تناظر کی عالمی تخلیقات کے تقابل میں نہایت افتخار سے پیش کیا جا سکتا ہے۔البتہ مجموعی طور پر اس دور میں یقیناً حاکم وقت کا تشکیل کردہ کلامیہ اتنا قوی تھا کہ تخلیقِ متن میں اس کے موثرات کسی نہ کسی شکل میں ضرور روبہ عمل رہے جس سے مزاحمتی کلامیے کی ترجمانی شدید تحفظات کا شکار ہو کر بہ تدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔ تاہم اردو کی جملہ اصناف ادب میں غزل وہ صنف سخن ہے جو اس قرض کی قسط وار ادائیگی میں اپنا حصہ ضرور ڈالتی رہی ہے۔اس صنف میں برطانوی استعمار کے تشکیل کردہ کلامیے کے مدمقابل مزاحمتی کلامیے کی پیش کش کے لیے ایک نہایت صحت مندانہ اور محفوظ قرینہ موجود ہے جسے استعمال میں لا کر شعرا نے اپنے سیاسی وسماجی شعور کی بلا دھڑک ترجمانی کی ہے۔ان معروضات کی مدلل پیش کش آئندہ ابوب میں کی گئی ہے۔

(ب) نو آبادیاتی دور

ہندوستانی نو آبادیات میں تاج برطانیہ کی سیاسی حکمت عملی

جنگ آزادی کا غبار چھٹا تو یکم نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ایک اعلان نامہ جاری کیا[۳۸] جس کے مطابق انگریزوں کے بلاواسطہ قتل میں ملوث افراد کے علاوہ سب کے لیے

معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ ریاستی الحاق کی ڈلہوزی پالیسی کالعدم قرار پائی اور لاولد ریاستی حکمرانوں کو گود لی ہوئی اولاد سے اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے وراثتی حقوق حاصل ہو گئے۔ ہندوستانی عوام کو کمپنی کے عہد و پیمان کی پاس داری اور مکمل مذہبی آزادی کا یقین دلایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہاں کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو فی الفور پہلا وائسرائے بنا کر تاج برطانیہ کی بلاواسطہ حکمرانی کا آغاز کر دیا گیا۔ اب ہندوستان دو حصوں میں منقسم تھا: ایک برطانوی ہندوستان اور دوسرا وہ ہندوستان جو ۶۰۰ کے قریب خرد و کلاں ریاستوں پر مشتمل تھا۔ نئی ریاستوں کے الحاق کی پالیسی بھی ختم کر دی گئی کیوں کہ ان ریاستوں کی آزاد حکومتیں مخالف قوتوں کے دبانے میں نسبتاً زیادہ ممد ثابت ہوئی تھیں۔ (۳۹) برطانوی ہندوستان میں ان آزاد ریاستوں کو مزید سہولتیں دی گئیں اور ریاستی تعلقہ داروں یا نئی اشرافیہ کو نوع بہ نوع رعایتیں دے کر حکومت سے ہم خیال طبقے کو قوی تر بنایا گیا۔ (۴۰) برطانوی پالیسی ساز ادارے درست طور پر اس بات کے قائل تھے کہ جنگ آزادی (یا ان کے خیال میں فوجی بغاوت یا غدر) صرف عوام کی جنگ تھی، خواص نے اس کا ارتکاب نہیں کیا تھا (۴۱) لہٰذا وہ ہر ایسا اقدام ضروری خیال کرتے تھے جس سے حکومت کے معاون گروہ کو تقویت پہنچے کیوں کہ یہی طبقہ ان کی بقا و فلاح کا ضامن تھا۔ یورپ کے معروف شرق شناس سموئیل پی ہنٹنگ ٹن اس فکر و فلسفہ کے پس منظر سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

> ''مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقدار یا مذہب (جن کو دوسری تہذیبوں کے چند ارکان نے قبول کر لیا تھا) میں برتری کی وجہ سے قبول نہیں کیا تھا بلکہ منظّم تشدد کرنے میں اپنی برتری کی وجہ سے۔ مغربی اس حقیقت کو اکثر فراموش کر دیتے ہیں غیر مغربی نہیں کرتے۔'' (۴۲)

فکر و عمل کی نئی جہات:

> ''نو آبادیاتی دور میں اس خیال کو مقبول بنایا گیا کہ ماضی میں ہندوستان نے بے انتہا پس ماندہ روایات تشکیل دیں، لہٰذا ہندوستان کی ترقی کا حل یہی ہے کہ ماضی اور اس کی روایات کو ختم کر کے آگے کی جانب دیکھیں۔ یہ ترقی کا ماڈل یورپی معاشرہ

تھا۔"(۴۳)

برطانوی استعمار کے پالیسی ساز ادارے اور نظریہ ساز حلقے اس بات کے شدت سے قائل تھے کہ ثقافت طاقت کی پیروی کرتی ہے۔ کسی قوم پر دیرپا حکمرانی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اسے اپنی مقامی تہذیب کی خساست اور فاتح قوم کی تہذیب وتمدن کے عمدہ ہونے کا یقین دلا دیا جائے۔ یہ کام برطانوی پالیسی سازوں نے خوب مہارت سے سرانجام دیا۔ معروف مفکر ایس۔ پی۔ ہنٹنگ ٹن نے جوزف نائے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ثقافتی اقدار کو"سافٹ پاور" قرار دیا ہے جو کسی قوم کی معاشی اور فوجی قوت یعنی"ہارڈ پاور" سے زیادہ دوررس اثرات کی حامل ہوتی ہے۔(۴۴) اسی امر کے پیشِ نظر مغربی حکمرانوں نے اپنی تہذیب کے جاذبِ نظر حصوں کو نہایت شان دار انداز سے متعارف کروایا اور دانشِ افرنگ کے جلووں نے بڑے بڑے اہلِ نظر کو خیرہ کر دیا۔ استعمار مائل قوتوں کی بھرپور سرپرستی کی گئی۔ جنگ آزادی میں حکومت سے اپنی وفاداری کا مظاہرہ کرنے والوں کو انعامات، جاگیریں اور خطابات دیے گئے تاکہ سماج میں ان کی عزت افزائی ہو۔ ان"وفاشعار" افراد کی سفارشیں ترجیحی بنیادوں پر قبول کی جاتی تھیں۔ اس طرح تاج برطانیہ سے وفاداری کے جذبات کو خوب فروغ دیا گیا۔ مزید برآں ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کا جشن ہوا تو اسے مغل بادشاہوں کے اعلا تر متبادل کے طور پر پیش کیا گیا۔ باقاعدہ دربار لگانے کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں برطانوی طرز زندگی کی متاثر کن نمائش کی جاتی تھی۔ یہ دربار نچلی سطح سے لے کر اعلا ترین عہدے داروں تک سبھی لگاتے تھے۔ وائسرائے کا دربار خوب شان دار ہوتا جس میں والیان ریاست، جاگیردار، زمین دار اور دیگر اشرافیہ مدعو کی جاتی تھی۔ الغرض یورپی تہذیب کی ان ثقافتی نمائشوں سے مقامی سماج کے زاویۂ نگاہ میں بدلاؤ آ گیا۔ لوگ اپنی اقدار و روایات سے برأت کا اظہار کرنے لگے اور مقامی طرز معاشرت کی حالت کٹی پتنگ کی سی ہو کر رہ گئی۔(۴۵) ادھر یورپی طرز حیات ان کے لیے رول ماڈل قرر پائی۔ مغربی کلچر کے عناصر ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب میں شامل کیے گئے تاکہ اس اجنبی قوم کی پزیرائی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔(۴۶)☆ باری علیگ نے ایسے ہی تہذیبی ادغام کو"منظم بربریت" کہا

ہے۔ (۴۷) یورپی تہذیب کی اس کھلی گھس بیٹھ کے محرکات محض سیاسی تھے اور اس ضمن میں انھیں اپنے اہداف کے حصول میں بڑی کامیابی ملی۔ مثال کے لیے آپ قیام لندن کے دورانیے میں سر سید احمد خاں کا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو لکھا گیا وہ تاثراتی مکتوب ملاحظہ فرمائیں جس میں اہل یورپ اور ہندوستانیوں کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اہلِ یورپ کو ہندوستانیوں سے وہی مناسبت ہے جو کسی نہایت خوب صورت اور لائق آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے جانور کو ہے۔'' (۴۸)

اس تبصرے پر ہندوستان کے اخبارات میں تردید و مخالفت کا ایک طوفان برپا رہا۔ بلاشبہ اس میں سر سیّد کا اخلاصِ نیت روبہ عمل تھا لہٰذا بلند کرداری کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے جواب الجواب کا جھن جھٹ نہیں پالا تاہم اس سے یہ ضرور متبادر ہوتا ہے کہ جس شخص کی کارگاہ فکر میں ولیم میور کی متعصّبانہ کتاب لائف آف محمد ﷺ کے مقابلے میں خطباتِ احمدیہ جیسی اعلا پائے کی کتب ڈھل رہی ہوں وہ اپنے پورے اخلاص فکر کے باوجود مقتدرہ کلامیے سے متاثر ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ مغربی لوگ شروع میں مسلمان حکمرانوں کے دربار یا فوج میں شامل ہونا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے، جب کہ مقامی افراد اہل یورپ کو ''ناپاک'' تصور کرتے تھے۔ اسی تناظر میں سر سید مغربی تہذیب کے مداح ہونے کے ''جرم'' میں کافر اور نیچری ہونے کا طعن سنتے رہے۔ (۴۹) اس طرح کی مزید مثالیں دیکھنا ہوں تو انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم پر محمد حسین آزاد کی تقاریر ملاحظہ فرمالیں جس میں کرنل ہالرائیڈ کی تقلید میں موصوف اپنے کلاسیکل ادب پر ''شرماتے''، اسے ''واہیات'' قرار دیتے اور انگریزی نظموں کے لیے ''ترستے'' نظر آتے ہیں۔ (۵۰) سر سید کے تیسرے ہم خیال ساتھی مولانا حالی نے اس محکومانہ طرز فکر کا تخلیقی محاکمہ بھی پیش کر دیا ہے:

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں (۵۱)

استعماری کلامیے کے زیرِ اثر ہر فرد خود ترحمی کا شکار ہو گیا اور اسی غلامانہ فکر و نظر کا تجزیہ کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''اس فکری مغلوبیت سے یہ اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ فاتح قوم کا منشا کس طرح مفتوح قوم کے بیانیہ میں شامل ہو جاتا ہے، اور کیوں کر مفتوح قوم خود اپنی تحقیر کے درپے ہو جاتی ہے۔''(۵۲)

شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اسی تجزیاتی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے خیالات یوں رقم کیے ہیں کہ ''مغربی سامراج نے دو سو برس تک خود ہمیں ہمارے وجود کی روح اور اصل سے بے خبر رکھا۔''(۵۳)

ہندوستان میں فرنگی اصلاحات

ہندوستان میں انگریزوں نے جب تک تجارت سے سروکار رکھا، اخلاقی ضابطے ان کی لوٹ کھسوٹ میں کبھی حائل نہیں ہوئے، تاہم جب عنانِ حکومت ان کے ہاتھ آئی تو اپنی بڑائی ثابت کرنے اور مفتوح قوم کے مزاحمتی ردعمل کو کم سے کم کرنے کے لیے انھوں نے بہت سی اصلاحات متعارف کروائیں۔ باری علیگ نے ان فرنگی اصلاحات کو ''طلائی زنجیریں'' قرار دیا(۵۴) جس سے اختلاف ممکن نہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اصلاحات نے ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی طرزِ زندگی سے ہم کنار کیا۔☆ اہلِ مغرب نے مقامی تہذیب میں بہت دل چسپی دکھائی۔ نئے کالج، سکول اور تحقیقی ادارے قائم کیے گئے۔ کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ اور بنارس میں سنسکرت کالج بنا جہاں بالترتیب فارسی اور سنسکرت پر بہت سا کام ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی سرگرمیوں کے نوآبادیاتی ثمرات کی افادیت اہلِ ہند کے لیے بلواسطہ جب کہ مقتدر طبقے کے لیے بلا واسطہ اور فوری نوعیت کی تھی۔ ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال بنائی گئی جس کا مقصد ہندوستان کی قدیم تہذیب کو دریافت کرنا تھا۔ اسی طرح فورٹ ولیم کالج کے اساسی مقاصد جو بھی ہوں، اس سے مشرقی علوم وفنون کو بیش بہا فائدہ ہوا۔ دلی کالج بھی ایسی ہی ایک درخشاں مثال ہے۔ انیسویں صدی میں ہی کمپنی نے مختلف شہروں سے اخبارات کا اجرا کیا۔ ڈاک کے نظام کو جدید اور منظّم بنایا گیا تھا۔ ریلوے، ٹیلی گرام اور جانے کیا کیا سائنسی ایجادات تھیں جو یورپ سے سیدھی ہندوستان

پہنچنے لگیں۔ بلا شبہ ان سے لوگوں کے طرز فکر، انداز و اطوار اور دیگر سماجی رویوں میں بہت بدلاؤ آرہا تھا۔

اس بدلتے ہوئے سماجی تناظر میں راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خان کی سرپرستی میں چلنے والی برہمو سماج اور علی گڑھ جیسی تحریکیں عوام کو سماجی آگہی فراہم کر رہی تھیں۔[۵۵] ستی اور بچپن کی شادی جیسی رسوم پر پابندی اور بیواؤں کو دوسری شادی کی جازت جیسی اصلاحات بہ ہر طور سماجی اصلاح کا اہم حوالہ تھیں۔ انھی دنوں یورپ میں افادیت پسندی کی تحریک چلی جس نے یہ فلسفہ دیا کہ اگر ہندوستان میں قانون کی حکمرانی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ادارے ہوں تو اس سے امن وامان اور ترقی کی ضمانت مل سکتی ہے لہٰذا سماجی فلاحی ادارے، ہسپتال اور یتیم خانے وغیرہ قائم کیے جانے لگے۔[۵۶] تعلیمی حوالے سے دیکھیں تو انگریزی عہد ہمارے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ مغلوں کا جاہ وجلال بجا، مگر یہ حکمران جدید سماجی و طبعی علوم کی ترویج کے لیے ایک بھی یونی ورسٹی یا اعلا تعلیمی سکیم متعارف نہ کرا سکے۔ عطا اللہ عطا کا قدرے مبالغہ آمیز بیان جدید عصری تناظر کے ایسے ہی تعلیمی بحران کا غماز ہے کہ ''انگریزوں کی حکومت سے پہلے اس خطے میں کوئی نظام تعلیم تھا ہی نہیں۔''[۵۷]

انگریزی دور میں تین نظام ہائے تعلیم کام کر رہے تھے:

i۔ مستشرقین کا ابتدائی نظام تعلیم

ii۔ لارڈ میکالے کا نظام تعلیم (۱۸۳۵۔۱۸۵۷ء)

iii۔ طبقاتی نظام تعلیم (۱۸۵۷۔۱۹۴۷ء)

جنگ آزادی کے بعد اس نوع کے مزید واقعات سے بچنے کے لیے یہ لائحہ عمل اپنایا گیا کہ تاج برطانیہ کے ''فرماں بردار'' اور ''نمک حلال'' افراد یعنی سرداروں، مہاراجوں اور دیگر امرا کے لیے چیف کلاج کھولے جائیں تا کہ انھیں خوے غلامی میں پختہ تر کیا جا سکے جب کہ عام افراد کے لیے روایتی علوم اور مقامی زبانوں کی ترویج کے ادارے ہوں جو حکومت کی دفتری ضروریات کے لیے خام انسانی وسائل مہیا کرتے رہیں تا کہ سرکاری مشینری بھی رواں رہے۔[۵۸] بلا شبہ یہ

تعلیمی سرگرمیاں ''افادیت'' کے اصول پر مبنی تھیں تاہم مقامی معاشرے کے وسائل سے پردہ کشائی، ذہنی جمود کو توڑنے اور عصر حاضر کی صحیح تر تفہیم و تعیین کے لیے تحرک فراہم کرنے کے ضمن میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ آئینی حوالے سے دیکھیں تو کمپنی راج سے ہی سرکاری مشینری اور اس کی عمل داری کو بہتر بنانے کے منصوبے بنائے جانے لگے تھے۔ خصوصاً ۱۷۷۳ء اور ۱۷۸۴ء کے اصلاحاتی ایکٹ اسی نوع کی ابتدائی مثالیں ہیں۔ تمام ہندوستان میں ۱۸۸۱ء کو پہلی ملک گیر مردم شماری کروا کر ڈیٹا اکٹھا کیا گیا تاکہ معاشرے کے صحیح اعداد و شمار کو مدِنظر رکھ کر فلاحی پالیسی سازی کی جا سکے۔ (۵۹) ہندوستانی رائے عامہ کا باقاعدہ جائزہ لیتے رہنے کے لیے ایک انگریز اے۔ او۔ ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس قائم کی۔ دوسری طرف ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ بھی میدان میں آ گئی۔ اسی طرح جوں جوں ہندوستانی عوام کا سیاسی شعور بلوغت کی منازل طے کرتا گیا، انھیں بتدریج اصلاحات کی شکل میں سیاسی حقوق حاصل ہوتے گئے۔ اس سلسلے میں ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات، ۱۹۱۹ء کی مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات، کمیونل ایوارڈ، گول میز کانفرنسیں، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء جیسے آئینی اقدامات اہم اصلاحی کاوشیں ہیں۔ آخر کار یہی سلسلہ ہندوستان کی کامل خود مختاری پر منتج ہوا۔ الغرض ۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر انگریزوں کا دورِ اقتدار تقریباً دو صدیوں پر محیط رہا جس میں انھوں نے موریہ اور مغل حکمرانوں کے بعد ہندوستان میں تیسری بڑی امپائر قائم کر کے اس خطے میں سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کے نئے قرینے متعارف کروائے۔ برطانوی دور حکومت پر ایک فاضلانہ محاکمہ دیتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''انگریزی حکومت اگرچہ بدنیتی، معاشی استحصال، جابرانہ لوٹ کھسوٹ اور خود غرضی کا نہایت مکروہ پہلو رکھتی تھی، لیکن تاریخی طور پر وہ سرمایہ داری کی ترقی پسند قوتوں کی آلۂ کار تھی، غیر ارادی طور پر یہی حکومت ہندوستان کو تاریخ کے نئے سانچے میں ڈھالنے کا باعث بنی۔ شاہی مطلق العنانی کا خاتمہ ہو گیا، قدیم معاشیات بدل گئیں، ہندوستان ایک صنعتی ملک بننے لگا اور انگریزی حکومت ہی کے ذریعے بالآخر

ہندوستان میں نئی تعلیم، آزاد پریس، ذرائع آمدورفت اور رسل ورسائل کی ترقی اور سیاسی وحدت پیدا ہوئی۔ ،،(۶۰)

عوام میں سیاسی بیداری اور آزادی کی جدوجہد

ہندوستان میں نوآبادیاتی دور کا نصف اوّل عالم جبر تھا اور نصف آخر عالمِ قدر۔ پہلے انگریز وائسرائے لارڈ کیننگ (۱۸۵۸ء) سے لے کر لارڈ ایلگن دوم (۱۸۹۹ء) تک برطانوی حکومت نہایت مستحکم رہی۔ لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں دہلی دربار سجا کر عوام کو جو سہانے خواب دکھائے تھے اس سے نہ صرف حکومتی ایوانوں میں بدلتے انداز حکمرانی کا پتا چلتا ہے بل کہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ احساس زیاں کی پژمردہ شاخوں پر امیدوں کے نئے اکھوے پھوٹنے لگے تھے۔ آریہ سماج اور علی گڑھ جیسی تحریکوں نے لوگوں میں عصری سیاست اور سماجیات کا شعور اجاگر کیا اور انھیں نئے زمانی تقاضوں کے مطابق لائحہ عمل بنانے پر اکسایا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ دونوں تحریکیں ترقی پسندانہ رجحانات کی علم بردار تھیں۔ ان کی بہ دولت ہندوستانی معاشرے سے شکست خوردگی، بے چارگی اور قنوطیت کے جذبات کا قلع قمع ہوا اور دلوں میں قوت وعمل کے نئے جذبے پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت کے بہت سے ادارے وجود میں آئے جنھوں نے فکرونظر کے نئے منطقے متعارف کروائے۔ انقلاب فرانس، امریکہ کی جنگ آزادی، اٹلی اور آئرلینڈ کے لوگوں کی قومی جدوجہد جیسے امور سے لوگ سبق اندوز ہو رہے تھے۔ پوری دنیا میں مغربی نوآبادیاں سکڑ رہی تھیں۔ ہر طرف انسانی حقوق اور حریّت وآزادی کے ترانوں کی گونج تھی۔ ترکی، ایران اور چین وغیرہ میں نئے ادوار کا آغاز ہو رہا تھا۔ جاپان نے روس کو شکست دے کر یورپ کی برتری کا طلسم چکنا چور کر دیا تھا۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ تھامس پین، سپنسر، برک، مل، والٹیر اور گیری بالڈی کی کتابوں سے ولولۂ آزادی کی حدّت جذب کر رہا تھا۔ (۶۱) سیاسی جماعتوں کے قیام اور بہ تدریج اصلاحات کے نفاذ نے عوام میں اپنی ممکنات کا یقین پیدا کر دیا تھا۔ انگریزوں کے متکبرانہ طرز عمل، عوام کے معاشی استحصال اور جلیانوالہ باغ کے قتل عام جیسے

وسیع پیمانے پر مظالم نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایسے میں حریت و آزادی کے مطالبات کا سامنے آنا بدیہی امر ہے۔ اگر چہ شروع میں ان مطالبات کو جبراً دبانے کی کوشش کی گئی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کامل خود مختاری کے یہ نعرے بلند تر ہوتے گئے لہٰذا آخر کار عوامی کوششیں رنگ لائیں اور برصغیر پر آزادی کا پھریرا لہرانے لگا۔

نوآبادیاتی دور کا خاتمہ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن وہ آخری وائسرائے تھے جنھوں نے ہندوستان کو متحد رکھتے ہوئے اس پر برطانوی راج روا رکھنے کی کوشش کی مگر انھیں جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اب یہاں استعماری سرگرمیوں کے لیے حالات سازگار نہ رہے تھے۔ وہ جان گئے کہ اب برطانوی نظام کا خاتمہ یقینی ہے لہٰذا ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی شب میں ہندوستان کو دو الگ الگ آزاد مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا اور یوں نوآبادیاتی دور اپنے اختتام کو پہنچا۔

حوالہ جات وحواشی

1. Encyclopedia of Social Siences, Vol:3, New York: The Macmillan Company,1963, p.653.

۲۔ نیّر، ناصر عباس، ڈاکٹر: نو آبادیاتی صورت حال، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان وادب، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، لاہور: کلیہ علوم شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۴۔۲۶۳

3. A Dictionary of Politics: Walter Laqueur, Weidenfeld & Nicolson, London P-105-106

۴۔ فرہنگ اصطلاحات: ج: اوّل (اے تا ڈی) لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء

۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰

☆ یوں تو یورپی نو آبادکاروں کی طرح آریہ اور مغل بھی بدیسی طاقتیں تھیں مگر ان کے لیے ہم نو آبادکار کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے جس کی بڑی وجہ ان حکمرانوں کا مقامی باشندوں سے گہرا سماجی تعامل اور ہندوستان کو بہ طور وطن اپنانا ہے۔ انگریز قوم یہاں چار صدیاں گزار گئی مگر وہ اس طرح کا معاشرتی تال میل پیدا نہ کرسکی۔ اسی وجہ سے انھیں مقابلتاً زیادہ مزاحمت کا سامنا بھی رہا۔

۶۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر؛ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر (مرتبین)، پیش لفظ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، ص ۱۲

۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، ص ۱۰۔۱۱

☆ یہ تاثر سراسر استحصالی حربہ ہوتا ہے۔ ابتدائی عظیم سلطنتوں میں یونانی اور رومی شامل نہیں تھے۔ اسی طرح چین، ہندوستان، شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اس وقت بامِ عروج پر تھے جب برطانوی جزائر اور یورپ کے لوگ ابھی تیر کمان بھی نہ بنا پائے تھے۔ (والٹر روڈنی: نو آبادیاتی نظام اور اس کی ابتدا، مشمولہ: تاریخ اور سیاست، از: ڈاکٹر مبارک علی، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۷ء، ص ۸۹۔۹۰)

۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر: تعبیر کی شرح، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء، ص ۸۸

۹۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت، لاہور: مکتبہ اردو، س۔ن، ص ۱۰

10. S.Warshaw & C.D. Bromwell: India Emerges, San Francisco, (California): Confield Press, 1974, P.67

11. S.Warshaw & C.D. Bromwell, India Emerges, P.68

☆ ابتداً اس کمپنی کا نام ''انجمن مہم پردازاں'' تھا۔اسی نام کی دو مزید کمپنیاں بھی تھیں جنھیں باہمی رقابت کی وجہ سے ایک دوسرے میں ضم کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی بنا دیا گیا۔(باری علیگ: کمپنی کی حکومت،ص ۱۲)

12. S.Warshaw and C.D. Bromwell: India Emerges, P.66

☆ اس سے قبل ۱۶۶۴ء میں بھی انگریزوں نے ایک ایسے نادر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا جب شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا آگ سے جھلس گئی تو سورت کے انگریز معالج جبرَیل بگٹن نے ان کا علاج کیا جس کے صلے میں انھیں بغیر محصول ادا کیے پوری مغلیہ سلطنت میں تجارت کی اجازت دے دی گئی۔ اسی سرجن نے بعد میں شاہ زادہ شجاع کے حرم کی ایک خاتون کا علاج کر کے کمپنی کے لیے فیکٹری لگانے اور مختلف علاقوں میں اپنی تجارتی ایجنسیاں کھولنے کی اجازت حاصل کی۔

(محمودالرحمٰن، ڈاکٹر: جنگ آزادی کے اردو شعرا، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، س۔ن،ص ۲۶۔۲۷)

۱۳۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت،ص ۱۵

14. S.Warshaw and C.D. Bromwell: India Emerges,P.68

۱۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان،ص ۲۳۔۲۴

۱۶۔ ایضاً،ص ۲۵

۱۷۔ ایضاً

☆ انگریزوں نے الزام عائد کیا کہ فورٹ ولیم پر قبضہ کے دوران میں نواب کے سپاہیوں نے ۱۴۶ برطانوی سپاہیوں کو ماہ جون کی گرمی میں ایک کال کوٹھڑی (بلیک ہول) میں بند کر دیا جس میں دم گھٹنے سے ۱۲۳ سپاہی ہلاک ہو گئے۔واضح رہے کہ بعد کی تحقیق سے یہ الزام غلط ثابت ہوا جس کا ایک ثبوت "۱۴x۲۲" رقبہ کی مبینہ کوٹھڑی میں اتنے افراد کی گنجائش ہی کا نہ بننا ہے۔محبوس افراد کی تعداد ۱۶۶ اور کال کوٹھڑی کا رقبہ ۱۸ مربع فٹ بھی بیان کیا گیا ہے۔

(Encyclopedia of World History, London: Peerage Books, 1985, P.99)

۱۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان،ص ۲۷

19. Encyclopedia of World History,P.99

☆ میر جعفر اس قدر کلائیو کے زیر اثر تھا کہ عوام اسے ''خرِ کلوئیو'' کے لقب سے پکارتے تھے۔(باری علیگ:

کمپنی کی حکومت، ص ۴۵)

۲۰۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی و ادبی پس منظر (۱۷۰۷ء تا ۱۸۰۳ء)، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند، ج:7، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۷

۲۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی راج، ص ۲۹۔۳۰

۲۲۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی و ادبی پس منظر (۱۷۰۷ء تا ۱۸۰۳ء)، ص ۸

۲۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، ص ۳۹

۲۴۔ نصیرالدین ہاشمی: دکنی کلچر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۳۲۔۱۳۳

۲۵۔ القرآن، سورۃ النمل: آیت نمبر ۳۴

☆ آیت کا عربی متن یوں ہے:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَادَخَلُوْاقَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَ جَعَلُوْ آ اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً ج وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ o

ترجمہ: (اس (ملکہ سبا) نے کہا کہ جب بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت داروں کو ذلیل کر دیتے ہیں، اور اس طرح یہ بھی کریں گے)

☆ سرسید احمد خان نے اسباب بغاوت ہند کے ضمن میں ایسے پانچ نکات کا ذکر کیا ہے:

i۔ حکومتی اقدامات کی غلط تفہیم

ii۔ ایسے قوانین کا اجرا جو مقامی اقدار سے مطابقت نہ رکھتے تھے

iii۔ حکومت کی رعایا کے احوال سے عدم واقفیت

iv۔ ہندوستانی معاشرے کی اہم ضروریات کا حکومت کی طرف سے نظر انداز کیا جانا

v۔ فوج کی بدانتظامی

(سرسید احمد خاں: اسبابِ بغاوتِ ہند، مشمولہ: ۱۸۵۷ء خیال نمبر، مرتبہ: ناصر کاظمی؛ انتظار حسین، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء ص ۵۶)

۲۶۔ عبداللہ یوسف علی، علامہ: انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس ۲۰۰۳ء، ص ۴۷

۲۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، ص ۶۲۔۶۳

☆ اس پالیسی کا ماحصل یہ تھا کہ اگر کوئی والیِ ریاست لاولد مر جائے یا جس حکمران کے بارے میں ریاستی بدانتظامی کی شکایات ہوں، اس کا انتظام و انصرام کمپنی اپنے ہاتھ میں لینے کی مجاز ہے۔

۲۸۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی و ادبی پس منظر (۱۷۰۷ء تا ۱۸۰۳ء)، ص ۳

۲۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: سن ستاون کی ابتدائی بغاوتیں، مشمولہ: اردو نامہ، لاہور، ج: ۲۷۔۲۶، ش: ۱، ۳، ۴، لاہور: جولائی ۲۰۰۹ء تا مارچ ۲۰۱۰ء ص ۱۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۵

۳۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، ص ۶۳

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر (۱۷۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند: ج: ۹، ص ۳

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی: جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی اہمیت، مشمولہ: ۱۸۵۷ء خیال نمبر، ص ۳۴

۳۵۔ غالبؔ: اردوے معلّا، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۴ء، ص ۴۳

☆ غالب نے ''رستخیز بیجا'' کی ترکیب سے جنگ آزادی کا مادہ تاریخ نکالا ہے۔ یہ لفظ ان کی تصنیف ''دستنبو'' میں بھی آیا ہے۔

۳۶۔ نامۂ غالب بہ نام منشی ہرگوپال تفتہ، مشمولہ: خطوط غالب، مرتب: غلام رسول مہر، ج: اوّل، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء ص ۴۳

۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی اہمیت، مشمولہ: ۱۸۵۷ء، خیال نمبر، ص ۳۶۔۳۷

۳۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، ص ۷۰

۳۹۔ جذبی، معین احمد: حالی کا سیاسی شعور، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۲

۴۰۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی اور ادبی پس منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند: ج: ۹، ص ۳۹

۴۱۔ عطا، عطاء اللہ: جنگ آزادی ۱۸۵۷ء: کل اور آج تعلیمی تناظر میں، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، ص ۱۸۰

۴۲۔ ہنٹنگ ٹن، سیموئیل۔ پی: تہذیبوں کا تصادم، مترجم: محمد احسن بٹ، لاہور: مثال پبلشنگ، ۲۰۰۳ء ص ۴۳۔۴۷

۴۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر: تاریخ اور تحقیق، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۳۳

۴۴۔ ہنٹنگ ٹن، سیموئیل۔ پی: تہذیبوں کا تصادم، مترجم: محمد احسن بٹ، ص ۱۵۔116

۴۵۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: ادبی منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، ص ۴۵

۴۶۔ فیض، فیض احمد: موج زر، مرتبہ: احمد سلیم، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۶

۴۷۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت، ص ۸

۴۸۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ (مرتب): مکتوباتِ سرسید، ج: اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۰
۴۹۔ نصیر الدین ہاشمی: دکنی کلچر، ص ۱۴۳
۵۰۔ محمد ہارون، ڈاکٹر (مرتب): کلیات نظم آزاد، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء ص ۳۸۔۴۴۲
۵۱۔ حالی، الطاف حسین، مولانا: دیوان حالی، لاہور: مقبول اکیڈمی س۔ن، ص ۱۱۵
۵۲۔ ابو الکلام قاسمی: معاصر تنقیدی رویے، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۷۳۔۷۴
۵۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی: تعبیر کی شرح، ص ۹۴
۵۴۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت، ص ۷۲

☆ ہندوستان میں تین چار وائسرائے جیسے لارڈ میو، لارڈ فرن اور لارڈ کرزن وغیرہ واقعی سماجی مصلح کے طور پر نمایاں تھے۔ صحت، تعلیم اور عوامی فلاح کے کاموں میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔
(شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی، اور تہذیبی پس منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، ص ۱۰)

۵۵۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی، اور تہذیبی پس منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، ج: ۹، ص ۱۲، ص ۳۲
۵۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، ص ۵۲
۵۷۔ عطا، عطاء اللہ: جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کل اور آج تعلیمی تناظر میں، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، ص ۱۸۱
۵۸۔ ایضاً، ص ۱۸۵
۵۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، ص ۴۷
۶۰۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر: اردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، ص ۲۱
۶۱۔ ایضاً، ص ۲۶

نوآبادیاتی دور میں اُردو غزل کے تنقیدی مباحث

می نماید سخنم سادہ ولے بی تہ نیست
از تۂ چشمۂ آئینہ کسی آگہ نیست

(غنؔی کاشمیری: دیوان غنی کاشمیری: بہ کوشش احمد کرمی، سلسلہ نشریات ''ما''، ایران، ۱۳۶۲ھ۔ش، ص۵۲)

ادب اور سیاست کا باہمی تعلق ۔۔۔ ایک تعبیری قرینہ

ادب و سیاست دونوں معاشرتی کوکھ سے پیدا ہونے والی ایسی جڑواں سرگرمیاں ہیں جو مسلسل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ بسا اوقات تو شعر و ادب ایک طرح سے نقاب پوش سیاسی سرگرمی ہی کا نام لگتا ہے۔ اسی تناظر میں شمس الرحمٰن فاروقی نے فریڈرک جیمی سن کی ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ادبی مطالعات میں سیاسی تناظر کی اہمیت محض تتمہ یا ممکنہ راستوں میں سے کسی ایک راستے کی نہیں ہوتی بل کہ یہ مطالعے کا افق مطلق (Absolute Horizone) ہے۔[1] نشانِ خاطر رہے کہ ادبی متون سے نتائج اخذ کرنے کے لیے دو ٹوک قواعد و ضوابط نہیں ہوتے لہٰذا ''متن کی ہر وہ تعبیر صحیح (Valid) ہے جو متن ہی سے برآمد ہو۔''[2] ☆ کسی متن کے اندر ایسی معنیاتی تشکیل بھی ممکن ہے جو منشائے مصنف کی حدِّ ادراک سے باہر ہو جیسا کہ اردو شعرا نے خود بھی اپنے ان شعروں میں معنی کے وسیع امکانات کے اشارے دیے ہیں:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے[3]

متن حسنت کہ قضا و قدر انشا می کرد
کاش با حاشیۂ مہر محشیٰ می کرد (۴)

تعبیر متن کے ان اجمالی اشاروں کی تفصیل شمیم حنفی نے یوں لکھی ہے:

''معنی کی کئی سطحوں کی طرح تفہیم کی بھی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ شعر کے کسی نمونے کی تفہیم میں قاری معنی کی ایک ہی سطح پر ہمیشہ جما رہے۔ ذہنی ارتقا، ماحول کی تبدیلی، یا زندگی اور فن کی طرف رویّے کی تبدیلی یا ذاتی تجربے کی کسی کیفیت کے باعث ایک ہی شعر مختلف موقعوں پر لفظ و معنی کے مختلف اسرار منکشف کر سکتا ہے۔''(۵)

ایسے تمام واقعات جو معاصر زندگی کی جہت اور رفتار کو متاثر کرتے ہیں، تاریخی واقعات کہلاتے ہیں اور چوں کہ ہر تاریخی واقعے کی متنی تشکیل ہوتی ہے۔(۶) لہٰذا کسی قوم کے فلسفہ حیات کو جاننے کے لیے اس کے ادبی سرمایے کی تفہیم بہت اہمیت رکھتی ہے۔(۷) یہی وجہ ہے کہ جب کوئی قوم نو آبادیاتی صورت حال کا شکار بنتی ہے تو نو آبادکار کی توجہ کا اہم ترین مرکز مفتوح قوم کا شعر و ادب بنتا ہے۔ نو آبادکار اپنے مقتدر کلامیے کی ترویج چاہتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ وہ مفتوح سماج کے مزاحمتی کلامیے کا سراغ لگائے اور پوری قوت سے اسے دبانے کی کوشش کرے۔ برطانوی نو آبادکاروں نے بھی یہی طریقہ اپنایا تھا۔ اس بات کا ایک بیّن ثبوت فورٹ ولیم کالج کے مطبوعہ ادب میں محذوفات پر تحقیق سے بہم پہنچایا جا سکتا ہے۔ مولوی امانت علی کی تصنیف ''ہدایت الاسلام'' کا ترجمہ یہاں سے چھپا۔ متن میں جہاں حضرت عیسیٰؑ اور دیگر انبیا کا روزِ محشر ''نفسی نفسی'' پکارنے اور شفاعت رسول ﷺ سے بہرہ مند ہونے کا تذکرہ ہے، وہاں حضرت عیسیٰؑ کے ''نفسی نفسی'' کا ترجمہ محذوف ہے۔ اگر فرض کریں کہ یہ سہو ہے تو کیا اسی ہستی کے ذکر پر ہی سہو لازم تھا۔(۸) اسی طرح مظہر علی ولاؔ جو مذکورہ کالج کے معروف منشی اور اعلا درجے کے شاعر تھے،(۹) ایک دیوان مرتب کرتے ہیں؛ کاظم علی جواںؔ اس کا مقدمہ لکھتے ہیں مگر یہ دیوان کالج کے مطبع سے چھپ نہیں سکا جس کی ایک قیاسی وجہ درج ذیل نوعیت کے اشعار بھی ہو سکتے ہیں:

جاں بلب عیسیٰؑ ہو جب اس نرگسِ مخمور کا
چارہ جُو پھر کون ہووے اس دلِ رنجور کا (۱۰)

کس کی ہے نرگسِ بیمار کا بیمار مسیح
اے ولاؔ ڈھونڈے ہے جو شربتِ دیدار مسیح (۱۱)

نوآبادیاتی دور میں جدید معلوماتی نظام کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے تحت ادب وفن میں ہر اس صنف کی حوصلہ شکنی کی گئی جس کے رموز وعلائم کی آڑ میں مزاحمتی کلامیے کے احیا کا خدشہ ہو۔ ایسے میں اردو غزل جس کا علامتی نظام ''عالم طلسمات'' کہلاتا ہے، (۱۲) کیوں کر بچ نکلتی۔ لہٰذا اسی خدشے کے سبب غزل کی قلبِ ماہیت ہوئی اور اسے نظم کی طرح یک جہتی مفہوم کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی۔ اگر چہ اسے یک سر ختم کرنے کی بات بھی اٹھی مگر عملاً ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ یہ صنف اپنے رمزیہ اسلوب کے ساتھ نہ صرف قائم رہی بل کہ اس میں دورِ غلامی کے مصائب وآلام اور تحریک آزادی کے جملہ افکار واعمال احسن انداز میں اپنی جگہ بناتے رہے۔ درحقیقت غزل کی رمزیہ اقلیم میں مستعمل مختلف کردار وضمائر مع اپنے تلازمات کے بہ یک وقت محبت اور سیاست کی دنیا کو ایک مشترک علامتی نظام میں لانے کی دل چسپ خصوصیت رکھتے ہیں اور یہ ایسا وصف ہے جس کی بنا پر اس صنف میں مزاحمتی رویّے کے اظہار کے لیے راہِ سخن کبھی بند نہیں ہوتی۔ اسی خاصیت کی بنا پر صنفِ غزل نے تحریک آزادی کی نظریاتی تشکیل میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔

ادب میں داخلیت وخارجیت کے مباحث

شاعری ایک فن لطیف ہے اور فنون لطیفہ کی مثال مادے کو توانائی میں تبدیل کرنے کی ہے۔ یہ فنون جسم کے بجائے روح اور کائنات کے بہ نسبت ذات سے زیادہ متعلق ہیں۔ صنعت (Industry) اور صناعت (Art) میں یہی فرق ہے۔ ایک عام مکان میں نفیس گل کاری کر کے اسے فن تعمیر اور انسانی اعضا کی بے ہنگم اٹھا پٹک میں موزوں ارتباط پیدا کر کے اسے فن رقص میں

تبدیل کیا جا سکتا ہے۔[۱۳] یوں کہہ لیں کہ کے حسن، جدت، ندرت اور شگفتہ معنویت ہی کسی صنعت کو صناعت میں تبدیل کرتی ہے۔ تاہم صناعت یعنی فن کی خصوصیات انھی چند صفات تک محدود نہیں بل کہ اس کے جمالیاتی زاویے بے شمار ہیں۔ ادبی جمال آفرینی میں مواد اور ہیئت کو بھی اساسی حیثیت حاصل ہے، بہ قول غالبؔ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا[۱۴]

لطیف شے لطافت ہی سے پھوٹتی ہے مگر اپنی جلوہ نمائی کے لیے اسے کثافت کی ضرورت بہ ہر طور رہتی ہے۔ ایسے میں صنفِ غزل کو محض داخلیت کا ترجمان کہنا اور خلوت کے حصار میں مقید رکھنا چہ معنی دارد؟ دراصل یہ اردو غزل کا المیہ رہا ہے کہ اس کے ناقدین شعوری یا لاشعوری طور پر غزل کی مکتبی تعریفوں ''سخن گفتن بازناں''،[۱۵] ''غَزَلاً بِالنِسَّاءِ''،[۱۶] ''لھو مع النساء''،[۱۷] اور "Filtration"[۱۸] وغیرہ میں ایسے الجھے کہ اس صنف کا خارجی دنیا سے کوئی علاقہ ماننے کے لیے بہ مشکل ہی تیار ہوتے ہیں۔ بلا شبہ اس ''صنفِ ہزار شیوہ''[۱۹] کا اکھوا شاعری کی رومانوی شاخ سے پھوٹا ہے جس میں عاشق، معشوق اور رقیب کے کردار اساسی حیثیت رکھتے ہیں مگر ساختیاتی اعتبار☆ سے غزل کے اظہاری پیرایوں کی تین عمومی سطحیں ہوتی ہیں:[۲۰]

i۔ رومانوی سطح

ii۔ متصوفانہ سطح

iii۔ سیاسی وسماجی سطح

اس سلسلے کی ایک مثال رام نرائن موزوںؔ سے منسوب اس شعر سے دی جا سکتی ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری[۲۱]

یہ شعر اپنے کلاسیکل پیرایۂ اظہار کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص سیاسی پس منظر بھی رکھتا ہے۔ ☆ جب ہم اظہار کی اوپری سطح یعنی محض بیانِ واقعہ (Parole) کے بجائے متن کا معنیاتی

نظام (Langue) پرکھتے، الفاظ کے تہذیبی انسلاکات جانتے اور ربطِ کلام ایسے پراسرار رشتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ سیاسی وسماجی معنویت نتھر کر سطحِ ادراک پر آنے لگتی ہے۔ امداد امام اثر کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''خارجیت تغزل کے لیے سازگار نہیں''،(۲۲) مگر تخلیق میں گندھی ایسی خارجیت جس کی مثال موزوں کا یہ شعر ہے، حسنِ تغزل کو داغ دار نہیں کرتی۔ غزل کی اس معنیاتی جہت پر ایک وقیع کام خواجہ منظور حسین نے ''اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ''(۲۳) کی صورت میں کیا ہے جس میں معروف کلاسیکل شعرا کے کلام کی سیاسی معنویت متعارف کروائی گئی ہے۔

خواجہ صاحب نے صنفِ غزل کے مستور حسن سے نقاب کشائی کی یہ کاوش اس وقت کی تھی جب مابعد جدیدیت کے فلسفۂ قرأت کا رواج نہ ہوا تھا۔ ایسے میں معنی کی ردّ تشکیل کرتے ہوئے تعبیرِ متن کے جدید منطقوں کو متعارف کروانا آسان نہ تھا۔ اس دور کے ادبی حلقوں میں یہ تعبیری کاوش شدید تنقید کا نشانہ بنی مگر آہستہ آہستہ جب مابعد نوآبادیاتی منظر نامہ اپنے خدوخال بناتا گیا متن شناسی کا یہ قرینہ بھی مقبول ہوتا گیا۔ آج عالم یہ ہے کہ متن کے معنوی حصار کی چاروں دیواریں گرادی گئی ہیں لہٰذا اس پر کسی ایک معنی کا اجارہ ممکن نہیں رہا۔ ایسے شعری متون کی تفہیم کے لیے ردّ تشکیل کے ان قرینوں سے بے نیازی یا محض کسی ایک تعبیری منہاج پر اصرار کچھ اس نوع کے تنقیدی تسامحات پر منتج ہوتا ہے:

اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر (۲۴)

قتلِ عشاق کے بہ موجب محبوب کو سرد بازاری کا طعنہ دینے پر ایک فاضل ناقد (خواہ وہ کوئی ہو) متعلقہ شاعر یعنی وزیر بے چارے کو ''بے غیرت شعرا'' کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں(۲۵) اور:

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر، ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے (۲۶)

محبوب کا کسی اور شخص پر عاشق ہونا اور نامراد عاشق کا اس پر اظہار اطمینان ''دیوثانہ خیال''

قرار پاتا ہے۔(۲۷) ایسے یک جہتی اور مضحکہ خیز فیصلے بدلے ہوئے سماجی تناظر میں تشکیل پانے والے روایتی اظہاری قرینے کے حامل متون کومغربی کلامیے کی متعارفہ اس شعریات کی کسوٹی پر کسنے سے صادر ہوتے ہیں جونوآبادکاروں کی معدنِ فکر سے نکلی اور مولانا حالی کی کارگاہِ دانش میں ڈھل کر تیار ہوئی تھی۔ اس زاویۂ نظر سے اگر ایک طرف غزل کا عاشق زندگی سے بیزار اور عقل وفہم سے عاری نظر آتا ہے تو دوسری طرف معشوق اپنی خصوصیات کے پیشِ نظر ایک سفّاک دہشت گرد کا مثیل ٹھہرتا ہے اور یوں غزل کی پوری بساط ادبی لاقانونیت (Litrary Anarchy) کا منظر پیش کرنے لگتی ہے۔ بلاشبہ جدید پیراڈائم سے آراستہ اس کلامیے کی نشاطِ فکر اس قدر زود اثر تھی کہ حالؔی کی متعارفہ جدید شاعری سے لے کر آج تک ہماری غزل کے اپنے روایتی اظہاری قرینے یعنی عشقیہ اسلوب بیان کونشاتِ ثانیہ نصیب نہیں ہوسکی جو اس کا اہم اساسی تلازمہ اور بنیادی سروکار تھا۔ یہ بات نشانِ خاطر رہے کہ عشقیہ اسلوب بیان کوتاریخِ ادبیات میں مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی یہ اسلوب ادبی دنیا کا اقتضا ہے؛ جیسا کہ رضی مجتبیٰ ایک معروف مغربی ناقد سوزن سونٹیگ کا احوالہ نقل کرتے ہیں کہ:

"In place of hermenutics we need an erotics of art."(28)

الغرض غزل کا بنیادی سروکار سماجی حقیقتوں کو عشقیہ نوعیت کی جمالیاتی ساخت عطا کرنا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی دور میں مقتدر کلامیے کا مقابلہ کرنے کے لیے غزل کی روایتی لفظیات کو نئے معنوی نظام سے مربوط کیا گیا تھا، چناں چہ اس کے ایمائی نظام کی تفہیم کے لیے بھی جدید تنقیدی قرینوں کا اطلاق ضروری تھا۔ اس دور میں اردو غزل کی ایمائی حکمت عملی اور اسمائے ضمائر کی نئی معنویت سے اس صنف کے بنیادی سروکار یعنی حسن وعشق کے روایتی اقدار و معاملات بہت متاثر ہوئے لہٰذا قارئین کو نئے تعبیراتی کوڈز اور معنوی امکانات کا سراغ دینے کے لیے شعرا نے خود بھی باقاعدہ تفہیمی اشارے دیے ہیں؛ اکبر کے دو شعر دیکھیے:

فتوئ کفر دینا واعظ کی بے حسی ہے
یہ عشقِ بت نہیں ہے، اکبر کی پالسی ہے (۲۹)

نظمِ اکبر سے بلاغت سیکھ لیں اربابِ عشق

اصطلاحاتِ جنوں میں بے بہا فرہنگ ہے (۳۰)

ان ''اصطلاحاتِ جنوں'' کا فرہنگ نامہ بعض ناقدین نے کچھ یوں مرتب کیا ہے:

عاشق (مجاہد، انقلابی) معشوق (وطن، قوم، ظالم حکمران) رقیب اور غیر (نوآبادکار، سرمایہ دار) وصل اور دیدار (آزادی کا حصول، سامراجی نظام کی تبدیلی) ہجر (آزادی سے محرومی، حالتِ استحصال) حسن، جلوہ (سماجی انصاف، آزادی) گل (نصب العین، سیاسی آدرش، ملی اقتدار) چمن (ملک، وطن) گل چیں، صیاد، بادِ صرصر (ملکی آزادی کی مخالف قوتیں) قفس (حالتِ مجبوری و محکومی) عندلیب، بلبل (حریت پسند، انقلابی ادبا) وغیرہ۔

اُردو غزل کی یہ روایتی لفظیات جو بادی النظر میں محض ایک کلیشے ہے، مذکورہ معنوی انسلاکات سے جڑ کر معاصر سیاسیات کی تاریخ بن جاتی ہے۔ واضح رہے کہ غزل کی یہ اصطلاحات بعض اوقات فوق تصور کی حدود میں شامل ہونے لگتی ہیں۔ ایک اصطلاح کی معنوی جہت تو متعین ہوتی ہے مگر فوق تصور اپنی اساس اور بنیادی طرزِ استدلال کو قائم رکھتے ہوئے اپنی حدود پھیلاتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک فوق تصور بیک وقت کئی متضاد اور متبائن معنوی ابعاد کی تنظیم کر سکتا ہے۔ اس عہد کی غزل میں معشوق کا تصور ایک فوق تصور ہی ہے۔ مثال کے طور پر اس دور کے عاشق اور معشوق کی متبدل صورت ملاحظہ فرمائیں:

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے (۳۱)

معشوق سے متعلق غالب نے ایک خط میں بڑی وضاحت سے اس کردار کی ماورائی معنویت سے پردہ اٹھایا ہے؛ لکھتے ہیں: ''غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں، جو غزل کی روشن ضمیر میں آوے'' اور پھر انوری کے شعر کا حوالہ دیتے ہوئے نوحہ کرتے ہیں:

اے دریغا نیست ممدوحے سزا وارِ مدیح

اے دریغا نیست معشوقے سزا وار غزل (۳۲)

مظہر علی ولاؔ اور شاہ نیاز کے یہ اشعار دیکھیے جو غزل میں اسمائے اشارہ کے نئے مراجعات کا بیّن ثبوت ہیں:

دہر میں شہرہ ہے اس کے حسن کا
ہے بتانِ ہند کا بازار سرد (۳۳)

آتا ہے کس ادا سے وہ کافر بت فرنگ
باہم کیے وہ آنکھ لڑانے میں صلح و جنگ (۳۴)

غزل کے اشعار کی تعبیر میں ہمارے ناقدین کا نقطۂ نظر یوں بھی محدود رہا کہ انھوں نے اس کے اسمائے ضمیر کو محبت کی تثلیث (عاشق، معشوق اور رقیب) سے باہر نہیں جانے دیا اور اسی حصار بندی کا شاخسانہ ہے کہ بالخصوص اس صنف پر سیاسی وسماجی مقتضیات سے بے نیازی برتنے اور عشق و محبت کا روایتی راگ الاپنے جیسے الزامات کی بوچھاڑ رہی ہے حال آں کہ یہ ضمائر اپنے معنوی انسلاکات کا ایک وسیع حلقہ رکھتی ہیں؛ مثلاً یہ تین شعر دیکھیے:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں (۳۵)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے (۳۶)

پوچھتے ہیں وہ کہ ''غالب کون ہے''
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا (۳۷)

ان میں پہلا شعر یورپی تاجروں کی حصول اقتدار کے لیے درپردہ ساز باز، دوسرا برطانوی نوآبادکار کے حاکمانہ طرز تخاطب اور محکوم کی مسکنت آمیز بیزاری جب کہ تیسرا ہندوستان کی نام نہاد

بادشاہت کے مقابل نوآبادکار کی حقیقی مقتدر حیثیت کے تسلیماتی تذبذب کا ترجمان سمجھا جائے تو کیا یہ غلط ہوگا؟ حنیف رامے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''جس طرح ہر دور الہامی کتابوں کی اپنی تعبیر کرتا ہے اس طرح ہر دور بڑی شاعری کی بھی ایک نئی تعبیر کرتا ہے۔''(۳۸)

اُردو غزل کے اسلوب پر قرآن سے مستعار ہونے کا جو التباس ہوتا ہے۔(۳۹) اس کی ایک بنیادی وجہ معنی کی عمومیت کا وصف بھی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک عام الفاظ پر مشتمل شعر کو کسی خصوصی واقعے سے اختصاص کا پابند کیا جا سکتا ہے؟ اس بات کا جواب یہ ہے کہ غزل کے متن پر عام مذہبی متون (خصوصی نہیں) کے ضمن میں مفسّرین کا اختیار کردہ یہی قاعدہ قابلِ عمل ہے کہ:

''اَلعِبرَۃُ بِعُمُومِ اللَّفظِ لاَ بِخُصُوصِ السَّبَبِ''(۴۰)

(یعنی الفاظ کے مفہوم کو معتبر مانا جائے گا نہ کہ سببِ نزول کے خصوص کو)

لہٰذا ''ظلمت کدے میں [illegible]ے شبِ غم کا جوش ہے''(۴۱) والی غالبؔ کی غزل کو جو ۱۸۲۶ء میں لکھی گئی، اگر بہت سے شارحین سقوطِ دہلی (۱۸۵۷ء) کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو تعین زماں کے بجائے دورانِ زماں کی یہی منطق بروئے کار آتی ہے۔

فی زمانہ دنیا بھر کے دانش ور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شعریات بالعموم اقتداری کلامیے کے زیرِ اثر ہوتی ہے مگر صنفِ غزل کا یہ اعزاز ہے کہ اس کے مافیہ پر مقتدر قوتوں کا زیادہ اجارہ نہیں ہوتا جس کی بنا پر اس صنف کے مرکزی ایمائی نظام میں شاعر کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے آزادانہ فضا دست یاب رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری غزل کی متنی تشکیل میں ان تمام انقلابی جذبوں کا انجذاب ہوا جسے حاکمِ وقت پورے طور پر بھانپ لیتا تو یک قلم غزل اور غزل گو کی گردن ماردی جاتی۔

ادبی جمال آفرینی میں تاریخی حقائق کا کردار

شعروادب ایک معاشرتی سرگرمی بھی ہے۔ ایک تخلیق کار تاریخ کے کسی بھی منطقے (ماضی،

حال یا مستقبل) میں جا کر تخلیق کے لیے خام مال اکٹھا کرتا ہے؛ اسے اپنی کارگاہِ فکر میں گوندھ بنا کر ہیئت کے چاک پر رکھتا اور منظوم یا منثور شہ پارے ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان نے اس عمل کی تفہیم کے لیے جون سٹال وردی کی کتاب "Between the lines"(۴۳) کی مثال دی ہے۔ ان کی یہ کتاب انگریزی شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس کی ایسی نظموں پر مشتمل ہے جنھیں وہ ابتدائی مسودے کی شکل میں بار بار لکھتے اور پھاڑ کر ٹوکری میں پھینکتے جاتے تھے۔ موصوف وہاں سے یہ پھٹے کاغذ اڑا لیتے اور جمع کرتے جاتے۔ مذکورہ کتاب میں جون نے ان مسودات کو تکمیلی صورت میں آنے والی نظموں سے تقابل کر کے شاعرانہ طریق سے متعلق یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ابتداً یہ نظمیں کسی صورت واقعہ سے بے حد قریب تھیں مگر تخلیق میں ڈھلتے ڈھلتے اپنے ماخذ سے دور ہٹتی گئیں۔(۴۳)

یہاں دو سوالوں کی گنجائش نکلتی ہے:

۱۔ واقعات کی سچائی ادبی جمال آفرینی میں کس حد تک معاون ہوتی ہے؟

۲۔ کیا ان واقعات کا علم قاری کی تفہیم اور حظ اندوزی کے معیار پر کچھ اثر انداز ہوتا ہے؟

پہلے سوال کا جواب ہمیں شمیم حنفی کے قدیم مشرقی شعریات اور جدید مغربی فکر سے ہم آہنگ ان حاصلات میں بہ خوبی مل جاتا ہے کہ ''مافیہ یا مواد فی نفسہ کسی فن پارے کی قیمت میں اضافے کا سبب نہیں بنتا۔ اصل چیز اس مواد کی فنی تعبیر ہے۔''(۴۴) تاہم یہاں اس بات کی گنجائش بہ ہر طور رہتی ہے کہ ادب پارے کا جمالیاتی حسن سماجی احوال کے عمومی ایقان سے ترفع کشید کرتا ہے۔ تاریخی فکر محض گزرتے ادوار کی دستاویز نہیں ہوتی بل کہ اس سے مراد وہ کلی حقیقت ہے جو در پردہ قاری اور مصنف کے درمیان ایک سمجھوتے کے طور پر موجود رہتی ہے۔ واضح رہے کہ مابعد جدید نظامِ فکر تاریخ کو وقوعات کا شفاف بیانیہ تسلیم نہیں کرتا بل کہ اس کی ساختہ حیثیت کو محلِ نظر رکھتا ہے۔ لہٰذا ادبی واقعات کی موضوعی صداقتیں تو نظر انداز کی جا سکتی ہیں مگر اقداری تعینات سے رو گردانی ممکن نہیں۔ یہ تعینات حقائق سے زیادہ ایقانی سرمایے کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی محاورہ "Perception is more powerful then reality" اسی معنویت کا اجمالی

بیان ہے۔ میرؔ نے اس امر کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا (۴۵)

لہٰذا جدید بصیرت کے مطابق تاریخ بہ ذاتِ خود ایک بیانیہ ہونے کے بہ موجب تشکیک سے کسی صورت ماورا نہیں۔ اس کے ظاہری متن یا تکلّم (Parole) کو ایک آئس برگ کی اوپری سطح سے مشابہہ گردانا جاتا ہے جس کے بین السطور تاریخی و ثقافتی تعیّنات پر مبنی لسان (Langue) کے وسیع سلسلے تہہ در تہہ پھیلے ہوتے ہیں۔ (۴۶) جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب ہاں میں ہے۔ ادبی بیانیے اور اس کے پس منظری اسباب کا معاملہ ٹائم اینڈ سپیس کا مثیل ہے؛ دونوں کی ایک دوسرے سے جدائی ادبی جمالیات کے ضمن میں بہت سے معنوی سرمائے کے ضیاع پر منتج ہو سکتی ہے۔ مثال کے لیے ایک عام سا شعر دیکھیے:

خلدِ بریں کے رہنے والو حوروں سے کہہ دو پردہ ہو
مہرؔ چڑھا ہے بامِ فلک پر پردے دارو پردہ ہو

یہ مہرؔ لکھنوی کا شعر ہے۔ اخلاق احمد دہلوی ''یادوں کے سفر'' میں لکھتے ہیں کہ جب آصف الدولہ نے دہلی سے وارد ہونے والے تباہ حال لوگوں کو روزگار دینے کے لیے امام باڑے بنانے پر لگایا تو اس دوران میں ایک سپاہی کو باڑے کی چھت پر جانے کا حکم ہوا۔ اس نے آصف الدولہ کے محلات کی طرف منہ کر کے یہ شعر کہا تھا۔ (۴۷) اس واقعے نے شعر کی معنویت پر اثر تو بہ ہر حال کیا ہے۔ کسی ادب پارے کی صحیح تر تفہیم میں معاصر تناظر کی اہمیت سے یک سر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ادبی حظ تو بہ ہر حال تفہیم کے بعد کی ایک منزل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے ذیل کے تین اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری (۴۷)☆

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا(۴۹)☆

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کے لذت خواب سحر گئی(۵۰)☆

ان اشعار میں حسّی تجربہ تخلیقی فکر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے مگر ممکن ہے کہ مخصوص تاریخی پس منظر سے نا آشنا قاری ان وجد آفرین اظہاریوں اور فکر افروز عکس بندیوں سے محض ''تک دیکھ لیا، دل شاد کیا'' جیسا معاملہ کرتے ہوئے آگے گزر جائے، مگر یہی اشعار جب کسی بالغ نظر قاری مثلاً تاریخی رعایت سے بات کریں تو غالبؔ اور اقبالؔ کی ''زندہ قرأت'' سے متعّمل ہوتے ہیں تو ان حضرات پر لغوی معنوں میں ایسا وجد طاری کر دیتے ہیں جس کا ذکر ہماری ادبی تواریخ میں اتنا عام ہے کہ یہاں اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان تینوں وجد آفرین اشعار کا پس منظر نوآبادیات کا وہی پر آشوب دور ہے جس کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ''اس دور کی شاعری کو آپ اس دور کی تاریخ کے حوالے سے پڑھیے تو یہ ہم سے مکالمہ کرنے لگے گی۔''(۵۱)

ایک مغربی ناقد فلپ ڈریو نے براؤننگ کی شاعری کا تنقیدی محاکمہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے:

"A reader who is not equipped with the historical information which Browning assumes is not equipped to read the poem fully."(52)

ریاض صدیقی کسی متن کی تفہیم میں سماجی تناظر کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر زمانہ اپنا ایک سماجی تناظر رکھتا ہے۔ کسی بھی رہنما شخصیت کا مطالعہ اس کے زمانے کے تناظر میں اپنی معنویت کی سند پیش کرتا ہے۔ اس کا مطالعہ اگر آپ نے بعد میں

آنے والے سماجی تناظر میں کیا تو آپ مسخ تنقیدی آرا ہی پیش کر سکیں گے۔،، (۵۳)

آج کل اگر متن کے تعبیری قرینے کے اہتمام میں مصنف کی موت کا غلغلہ عام ہے تو اس سے ادب پارے کے سیاقی تناظرات جاننے کی اہمیت سے قطعی انکار مراد نہیں۔ یوں بھی کسی تخلیقی سرگرمی میں مصنف کی حیثیت محض ایک عمل انگیز (Catalyst) کے معادل جاننی چاہیے۔ متن بہ ذات خود ایک خود کار عامل ہے اور مصنف اس کا محض ایک آلۂ کار۔ پس معلوم ہوا کہ ادبی متون کی صحت مند تخلیق اور نکتہ رس قرأت کے لیے تاریخی حقائق کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مقدمۂ شعر و شاعری اور اردو غزل

غالب نے ''تنگنائے غزل،، کی بات تو کچھ اور سیاق و سباق میں کی تھی (۵۴)☆ مگر اس ترکیب سے معنی کا ایسا چراغاں ہوا کہ ان کے شاگرد رشید یعنی مولانا حالی نے اس صنف کی باقاعدہ اصلاح کا بیڑہ اٹھا لیا۔ دراصل یہ ایک عصری میلان تھا جس کے تحت تمام تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کو جدید دور کی شعریات سے ہم آہنگ کیا جا رہا تھا۔ اس حوالے سے علی صفدر جعفری لکھتے ہیں:

> ''اصلاح غزل کی تحریک جو حالی کے ہاتھوں شروع ہوئی، صرف حالی کی جدّت پسند طبیعت کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کا محرک وہ سارا سماجی پس منظر ہے جس میں حالی کی شخصیت کا نشو و نما ہوا تھا۔،، (۵۵)

اردو تنقید ۱۸۵۷ء کے بعد تذکرہ نویسی کے محدود حصار سے نکلی تو اس میں ادبی سرمایے کے مربوط جائزے پیش کیے جانے لگے۔ اس پر آشوب دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ ادیبوں نے دفاعی مزاحمت کا رویّہ اپنایا اور اپنے شعر و ادب کو معاصر صورت حال سے مزید ہم آہنگ کرنے لگے۔ ان لوگوں میں مولانا الطاف حسین حالؔی خاص طور پر نمایاں ہیں۔ مولانا کا

مقدمہ شعروشاعری (۱۸۹۳ء) اردو شعریات کی جدید ضابطہ بندی میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقدمے میں تنقید کی مشرقی روایت اور بعض مغربی تصورات کی آمیزش سے فن شاعری کا ایسا چارٹر متعارف کروایا گیا جس کی اہمیت آج تک کم نہیں ہوئی۔ اسی بنا پر یہ مقدمہ اُردو تنقید کی ''بوطیقا''٭ بھی کہلاتا ہے۔

مولانا حالی متین طبیعت کے ایک حسّاس شاعر تھے۔ شعر گوئی میں جب وہ ''شیفتہ سے مستفید''٭ ہوئے تو اس سنجیدہ کار شاعر کے فیضِ صحبت سے مولانا کی شعری حسّیات بہت کچھ بدل گئیں۔ اسی تبدیلی کی بنا پر آگے چل کر انھیں جدید غزل کا بانی شاعر قرار دیا گیا۔(۵۶)٭

حالؔی کا مذکورہ مقدمہ دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلے حصے میں نظری مباحث ہیں اور دوسرے میں مختلف اصنافِ سخن پر ان شعریات کا اطلاق کر کے عملی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ خلطِ مبحث سے بچنے کے لیے یہاں صرف زیرِ بحث موضوع (یعنی غزل) سے متعلق مباحث جو تقریباً نصف صد صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، کا مرکزی خیال بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ غزل میں عشقیہ مضامین ہر نوع کی محبت (بہ شمول عائلی رشتوں کے) پر مشتمل ہونے چاہئیں۔(۵۷)

۲۔ غزل کی مروجہ لفظیات میں اضافہ کیا جائے تاہم سقمِ غرابت سے بچاؤ ضروری ہے۔(۵۸)

۳۔ روایتی لفظیات کو رمز و استعارہ کی نئی معنویت دی جائے۔(۵۹)

۴۔ نئے خیالات باندھے جائیں اور روایتی مضامین کو صنعتوں کے استعمال سے دل کش بنایا جائے، البتہ شعر کی سریع الفہمی متاثر نہ ہونی چاہیے۔(۶۰)

۵۔ صنائع و بدائع تاثیرِ کلام پر منفی اثر ڈالتے ہیں لہٰذا ان کا استعمال صرف اتفاقی صورتوں میں کیا جائے۔(۶۱)

۶۔ غیر مردف غزل کو رواج دیا جائے تاہم اگر ردیف کا لانا ضروری ہے تو اسے قافیے سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ قافیہ ہمیشہ رواں ہونا چاہیے۔(۶۲)

انھی بنیادی باتوں کے ضمن میں حالؔی نے محبوب کی جنس ظاہر نہ کرنے، غزلِ مسلسل کے

فروغ، اخلاقی مضامین باندھنے اور عشقیہ واردات کی زیادہ تکرار نہ کرنے جیسے نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا اپنے مجوزہ اسلوب غزل کی ممکنہ عدم قبولیت سے بہ خوبی آگاہ تھے تاہم انھوں نے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ جب لوگوں کا ادبی مذاق رفتہ رفتہ اس جدید طرزِ سخن سے ہم آہنگ ہو جائے گا اور وہ سچائی کی لذت وحلاوت کو پالیں گے تو یہ عدم قبول کی قباحت باقی نہ رہے گی۔ حالی کی مجوزہ اصلاحات کے اس اجمالی خاکے سے واضح ہے کہ انھوں نے غزل کی جن شعریات سے برأت کا اظہار کیا ہے وہ تخلیقی نہیں بل کہ اصلاحی نوعیت کی ہیں۔ دراصل ان کے ہاں خیال آرائی کی نسبت فکر کی ترجمانی پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔

غزل میں لکھنوی طرز کے عشقیہ مضامین پر ان کا اعتراض ایک بڑے مکتبِ فکر کے مطابق صائب ہے۔ ویسے بھی اس نوع کی شاعری پر تولاً بھیجنے کی روایت تقریباً گذشتہ نصف صدی سے برابر چلی آرہی تھی۔ جدید شاعری میں نئے خیالات سے ایسے قومی اور سماجی مسائل مراد تھے جوان کے خیال میں ناسخؔ، نصیرؔ اور ذوقؔ وغیرہ کی ذہنی مشقت والی شاعری میں راہ نہیں پاسکتے تھے۔ حالیؔ دراصل غزل میں معاشرتی معاملات کی مرکزیت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بلاشبہ ان کی یہ اصلاحات جزوی طور پر برحق بھی ہیں اور استدلالی پیش کش کے بہ موجب متاثر کن بھی البتہ فنونِ لطیفہ اس نوع کی شعوری کاوشوں کے بہ مشکل ہی متحمل ہو پاتے ہیں۔ اس ضمن میں شمیم حنفی کا یہ فرمان بہت بلیغ ہے کہ:

''اجتماعی فن کا مہلک ترین پہلو یہ ہے کہ اس کی صورت گری تخلیقی قوتوں کی بجائے طے شدہ فارمولوں کی مدد سے کی جاتی ہے اور یہ فارمولے شاعر کی انفرادی استعداد سے زیادہ اجتماعی تقاضوں اور سطحی شعور کے پابند ہوتے ہیں۔ نتیجتاً فن جنسِ بازار اور عام مذاقِ طبع کا غلام بن جاتا ہے۔''(۶۳)

امرِ واقعہ یہ ہے کہ حالی اپنے تمام تر فنی خلوص کے باوجود اسی مقتدر کلامیے سے متاثر تھے جسے استعماری قوتوں نے بڑے پراسرار طریقے سے ہر طرف پھیلا رکھا تھا۔ یہ اسی کلامیے کا سحر ہے کہ مدرسہ حسین بخش (جہاں کے لوگ انگریزی مدرسوں کو ''مہلے'' کہتے تھے)۔(۶۴) میں زیرِ تعلیم

رہنے والے حالی جب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں مترجم بنے تو انھیں فوراً:

''انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص طور پر عام فارسی لٹریچر کی وقعت (ان کے) دل سے کم ہونے لگی۔''(۶۵)

آخر ساحرانِ فرنگ ایسے خام کار بھی نہ تھے کہ محکوم قوم کو اپنے حاضر و موجود سے بیزار کرنے کے لیے کچا ٹوٹکا استعمال کریں۔ خود ترحّمی اور شرق بیزاری کی یہ وہی حالت ہے جس کے آثار علی گڑھ تحریک کے اکثر افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی بجا طور پر لکھتے ہیں:

''حالی بھی جس طرح پیرویٔ مغرب کو اردو شاعری، اور نئی معیار بندی کا پیمانہ بنا کر پیش کرتے ہیں وہ بھی غیر شعوری طور پر امپیریل ایجنڈا کی تکمیل میں تعاون دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔''(۶۶)

دراصل حالی مغربی لٹریچر کے سحر میں آ کر مقامی شعریات کی صدیوں پرانی تاریخ سے انصاف نہیں کر پا رہے تھے۔ انھوں نے ملٹن کے سادگی، اصلیت اور جوش والے نظریۂ شعر☆ کو اپنی فکر کا محور بنا کر اس حقیقت سے کسی حد تک صرفِ نظر کیا کہ مشرقی شعریات میں متن کی استعاراتی زبان کا تصور بہت پرانا ہے۔ موجودہ دور کا ایک اہم ناقد اس طرزِ فکر کو 'حالی کے جدید شعور کی یک جہتی'(۶۷) قرار دیتا ہے۔ یوں تو ابتدا ہی سے مقدمہ حالی پر ''لے دے'' ہوتی رہی(۶۸) مگر فی زمانہ ایسے لگتا ہے جیسے ہر نقاد اس سلسلے میں ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اس کی ایک معقول وجہ شاید یہ ہے کہ آج ہم سو سال سے زائد عرصے کی معروضی دوری بنا کر نوآبادیاتی دور کی سرگرمیوں کا زیادہ بہتر تجزیہ پیش کر سکتے ہیں۔ اس تجزیہ کاری کی ایک عمدہ مثال ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کا مضمون ''انجمن اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر'' ہے جس میں انجمن کے ''مقصد اصلی'' اور ''علوم مفیدہ'' کے فوق تصور کا بنیادی استدلال نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کا شاخسانہ ثابت گیا ہے۔ ہندوستان کے لیے مجوزہ جدید یورپی علوم اور کلاسیکل مشرقی علوم استعماری زاویۂ نظر کی پیداوار تھے۔ انگریزی علوم کی افادیت تو لارڈ میکالے کے معروف بیانات سے بالکل واضح ہے۔ مزید

برآں ''قدیم مشرقی علوم اس لیے مفید تھے کہ ان کے ذریعے ہندوستانیوں کے ذہن پر حقیقی گرفت حاصل کی جا سکتی تھی۔''(۶۹) اسی انجمن کا ایک بڑا کارنامہ جدید اردو شاعری کا عملی تعارف اور ترویج واشاعت ہے۔ مشرقی شعریات کے برعکس پہلی دفعہ تخلیقی فعلیت کو تنقیدی افکار کے تابع کر کے شاعری کو منظم اجتماعی منہاج عطا کی گئی۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر اس تبدیلی کو ''اردو کی تاریخ میں ایک پیراڈائم شفٹ کا فیصلہ کن آغاز'' قرار دیتے ہیں۔(۷۰) انجمن کے پلیٹ فارم پر شعری جمالیات کے نو متعارفہ آئین کی پاس داری کی جاتی تھی۔ شعر میں صداقت، مبالغے سے پرہیز، اصلیت کی پاس داری اور خیال کی سادگی کے مغربی تصورات روبہ عمل آنے لگے۔ حالی نے جدید شعری فضا میں بھرپور حصہ لیا اور محمد حسین آزاد کے ان لیکچروں کی پوری حمایت کی جو انجمن کے پلیٹ فارم پر کلاسیکل اردو شاعری میں کذب وریا اور مبالغہ آرائی جیسی ''خامیوں'' کے خلاف ایک استغاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آگے چل کر حالی کا یہی فکر وعمل مقدمۂ شعروشاعری کی صورت میں سامنے آیا جو فی الاصل اسی مقتدر کلامیے سے ہم آہنگ تھا جس نے مشرقی جمالیات کو نئے پیراڈائم میں لانے کی کوشش کی۔ اس کلامیے کا اصل مقصد ہندوستان کے آئیڈیالوجیکل سٹیٹ اپریٹس پر اجارہ داری قائم کر کے نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کے لیے فضا سازگار بنانا تھا۔ اسی وجہ سے انجمن پنجاب کی نیچرل شاعری سے لے کر مقدمۂ حالی کی نظری اور عملی سرگرمیوں تک ہر جگہ رمز واستعارہ کی حاکمیت ختم کرنے کا تاثر ابھرتا ہے۔ ☆ حاکمانِ وقت جانتے تھے کہ:

> ''زبان کی استعاراتی قوت، غالباً واحد ایسی چیز ہے جس پر کسی مقتدرہ کا اجارہ ممکن نہیں۔''(۷۱)

ایسے میں صنف غزل، جس میں زبان کا علامتی اور استعاراتی تفاعل پورے عروج پر ہوتا ہے، کیوں کر عتاب شاہی سے مامون رہتی؟ اس تناظر میں دیکھیں تو یہ مقدمہ دراصل برطانوی استعمار کی طرف سے اردو غزل کے خلاف دائر کردہ وہ استغاثہ ہے جس کا مقصد صنفِ غزل کو متخیلہ سے نکال کر ممیّزہ (نقلی) قوتوں کے تابع کرنا تھا تاکہ اس کی متنی تشکیل کسی مزاحمتی کلامیے کی محفوظ پناہ گاہ نہ بن پائے۔ اسی مقدمے کی جدید شعریاتی سفارشات صنفِ غزل کو اس کے اساسی طریق

اظہار یعنی عشقیہ بیانیے (Erotic Expression) سے ہٹا کر ترجمانیِ احوال (Hermeneutic Expression) پر لانے کا ایک حربہ تھیں۔ اگر چہ اس پیوند کاری سے صنفِ غزل کی شاخِ فکر پر وہ اکھوا پھوٹا جس نے نمو پا کر فکر و خیال کی ایسی رنگا رنگ گل کاریاں کیں کہ چمنِ معنی میں بہار آ گئی، مگر سرِ دست مولانا حالی کے پورے خلوص کے باوجود اس کا اساسی جذبۂ محرکہ نو آبادیاتی مفاد تھا۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی؟ اس بات کا جواب حالی کی جدید غزل میں بھی ہے اور انجمن کے پلیٹ فارم پر برپا ہونے والے بہ مشکل دس مناظموں میں بھی۔ تاہم لطف یہ ہے کہ مقدمے پر یہ تنقیدی حملے اس کی ناقدانہ اہمیت زائل نہیں کر پائے۔ آج بھی ہر تنقیدی کام کا حرفِ آغاز مقدمۂ حالی ہی بنتا ہے۔ مزید بر آں اسی مقدمے کی بہ دولت حالیؔ کو پہلا با قاعدہ عمرانی نقاد بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ (۷۲) ڈاکٹر شمس الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ ''یہ حالی ہی کا اثر تھا کہ ان کے ہم عصر شعرا نے اردو شاعری کو سماجی زندگی کے سارے میلانات کا آئینہ بنا دیا۔'' (۷۳)

حالی نے اپنی جدید شعریات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے مغربی اثرات کا بہت کھل کر اظہار کیا ہے:

حالیؔ ! اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ کر چکے (۷۴)

اس تقلیدی روش سے قبل موصوف کی شاعری اپنے فن کی بلندیوں پر تھی مگر اس تبدیلی کے بعد ان کی کارگاہِ فکر میں اس قماش کے اشعار ڈھلنے لگتے ہیں: مشتے از خروارے:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ (۷۵)

کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح (۷۶)

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر

ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر (۷۷)

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم

پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم (۷۸)

حالی کی یہ غزلیں بہ ظاہر منظوم کلام تو ہیں مگر خدا لگتی یہ ہے کہ ان میں شعریت نام کی کوئی چیز نہیں۔ ناقدین نے اس طرز کلام کو سپاٹ،(۷۹) بے کیف و بے نمک،(۸۰) سطحی،(۸۱) بے رنگ(۸۲) اور جانے کیا کیا کہا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ اشعار دراصل کوئی سی چھ جدید غزلوں کے مطلعے ہیں جو اس نوع کے بقیہ ''کلام موزوں'' کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ مولانا خود بھی اس کلام میں کسی شعریت کا زعم نہیں رکھتے تھے:

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالؔی

الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ (۸۳)

اصل میں تخلیقی سرگرمیوں کو قومیانے یا سیاسیانے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس میں خیال خام کی فراوانی تو ہوتی ہے مگر پختہ تخلیقی سانچے بہ مشکل ہاتھ لگتے ہیں۔ یہ وہی حالی ہیں جو بزمِ احباب میں تماشائیوں کے ساتھ ساتھ اہل نظر کی موجودگی کا ادراک کرتے ہوئے ''اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی'' کے دستور العمل کا پرچار کرتے تھے۔ حالی کا یہ روکھا پھیکا کلام اپنے تاریخی تناظر میں بعض پہلوؤں سے اہم بھی ہے۔ ان کا مقدمہ شعروشاعری اگر اقلیم سخن کا جدید نظری منشور تھا تو اس کلام سے انھوں نے اپنے ہی مرتب کردہ ضابطہ سخن پروری کو عملی بنیادیں فراہم کی تھیں۔ تاہم نشانِ خاطر رہے کہ حلقہ غزل کی حرّیت پرور فضا میں حالی پر مقتدر کلامیے کا سحر پوری طرح کارگر نہیں رہتا اور یہاں وہی حالؔی جو کھلے بندوں ''ایک شائستہ قوم مغرب کی۔''☆ مدح اور غزل کے استعاراتی نظام کی مخالفت کرتے ہیں، اس صنف کے پردے میں اپنے ممدوحین کے متعلق ''کار دیگر'' میں بھی مصروف عمل نظر آتے ہیں:

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گل چیں یا ہے قزاقی (۸۴)

خوانِ نعمت نے ترے اے عاملِ مردار خور
کردیے آفاق کے سب خان و خاں سالار ہیچ (۸۵)

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی
لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث (۸۶)

کلامِ حالی کے تناظر میں ڈاکٹر محمود الرحمٰن کا یہ کہنا کہ ''حالی کا نقطۂ نظر مفاہمت اور مسلک مادیت کی طرف تھا''،(۸۷) کم از کم ان اشعار کے پیرایۂ اظہار کو سامنے رکھتے ہوئے پوری طرح قابل قبول نہیں رہتا۔ یہاں حالی انجمن کے شعری منشور سے انحراف کرتے اور مقامی کلامیے کے ترجمان بنتے نظر آتے ہیں۔ کون ایسا سفاک گل چیں تھا جس کی لٹس نے چمنستانِ ہند سے برگ و بار اڑا لیے؟ قزاقی عموماً بحری ڈکیتی کا ترجمان لفظ ہے اور یوں شاہ عالم گیر کے دور میں تجارتی رکاوٹیں بننے پر بحری ڈکیتیاں اور حاجیوں سے لوٹ کھسوٹ کی شہرت کس نے کمائی تھی؟ کس ''عامل مردار خور'' نے ''آفاق گیر'' استحصالی نظام کے ذریعے ہر شاہ و سالار سے خراج اُچک کر اپنے خوانِ نعمت کو سجایا تھا؟ ہندوستان کے سیم و زر کو ڈھو کے لے جانے کا باقاعدہ نظام کس نے بچھایا تھا؟ یقیناً ایسی کھلی باتوں کی تفہیم کے لیے کسی غیر معمولی ذہن کی ضرورت نہیں تاہم نظم میں حالی کے افکار کی نوعیت بسا اوقات دوسری ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے حالی کی نظم ''حبِّ وطن'' کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کرتے ہوئے یہاں مذکور اہل ہند کی نکبت و افلاس کو نوآبادکاروں کے بجائے مقامی افراد ہی کی باہمی لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ قرار دینے پر مولانا کو شاعر نہیں بل کہ محض بدیہی خیالات کا منظوم کار کہا ہے(۸۸) اور وہاں یہ بات بجا بھی ہے مگر غزل کے مذکورہ اشعار پر اسی تجزیاتی نتیجے کا انطباق کیا جائے تو نتیجہ محل نظر ٹھہرے گا۔ یہاں یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نوآبادیاتی دور کے انتہائی ناسازگار حالات میں اردو غزل مصلحت کوش طبائع کے لیے بھی حالِ دل کی ترجمانی

کا وسیلہ فراہم کرتی رہی ہے۔

اپنی غزلوں میں سمندر پار سے آئے نو آبادکار کے استحصالی ہتھکنڈوں کو دیکھ کر حالی بہ ہر حال دل برداشتہ ہوتے، اپنے ہم وطنوں کو اس غیر معمولی صورت حال سے آگاہ کرتے اور محتاط رہنے کا درس دیتے نظر آتے ہیں:

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت (۸۹)

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر
موج حائل ہے اور ہوا ناساز (۹۰)

اصلاح احوال کے لیے کہے گئے اشعار میں بھی صدق و اخلاص کی بھر پور آمیزش نظر آتی ہے:

حملہ اپنے پہ بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ایک یہی فتح و ظفر کی صورت (۹۱)

ایسی شعری مثالوں سے متبادر ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے علی گڑھ تحریک کے دستورالعمل کو اپنایا اور مقتدر کلامیے سے متاثر بھی ہوئے جس کے نتیجے میں ان کی جدید طرز پر مشتمل غزلیں، انجمن کے زیر اثر لکھی گئی نظمیں اور بالخصوص مقدمۂ شعر و شاعری جیسے منفرد شہ پارے سامنے آئے مگر غزل میں ایک معتد بہ حصہ ایسا ہے جو ان کی فکری شخصیت کا روایت دوست منظر پیش کرتا ہے۔

اُردو غزل کے حلیف و حریف دبستان ۔۔۔ ایک اجمالی جائزہ

اُردو غزل اپنی ابتدا ہی سے ایک مقبول صنفِ سخن رہی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک اسے کسی بڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب ہندوستانی عوام کو نو آبادیاتی ماحول میں ایک بالکل نئی صورت حال کا سامنا ہوا تو جدید عصری تقاضوں نے انھیں علم و ادب کے دیگر گوشوں کی طرح صنفِ غزل کی بھی از سرِ نو جائزہ کاری کی راہ سجھائی۔ دوسری طرف نو وارد مقتدر قوتیں بھی

یہاں کے مروّجہ پیراڈائم کا جائزہ لے کر اس میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں کر رہی تھیں۔ لٰہذا ایسے حالات میں ہماری ادبی شعریات کی اتھل پتھل ایک لازمی امر بن گئی۔ اردو غزل اپنے مخصوص مواصلاتی نظام اور ایمائی طرزِ اظہار کی وجہ سے بدیسی حکمرانوں کے جبر کا خاص طور پر نشانہ بنی۔ جدید ذہن رکھنے والے کچھ ''متاثرہ'' ناقدین اسے تقلیدی اور تفریحی صنف کہہ کر نئے دور کے لیے ناقابلِ قبول قرار دینے لگے جب کہ ایک بڑا مکتبہ فکر اس کی حمایت پر جما رہا۔ حامیانِ غزل یہ سمجھتے تھے کہ اس صنف کا ایمائی مزاج اسے ہر طرح کی صورتِ حال میں ڈھل جانے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ دونوں مکاتبِ فکر اپنے اپنے دلائل و براہین پیش کرتے رہے۔ اس منطقی آویزش کے بہ سبب غزل کی قلب ماہیت ہوئی اور اس کا وہ روپ سامنے آیا جو پختہ تر صورت میں ہمیں اقبالؒ کے ہاں نظر آتا ہے۔ اردو غزل کی مذکورہ ردّ و قبول کے سلسلے میں ان دونوں مکاتبِ فکر کا جائزہ عبدالرؤف امیر نے اپنے مقالے ''اردو غزل: مخالفت و مدافعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''(۹۲) میں بڑی صراحت سے پیش کیا ہے۔

اس صنفِ سخن کی مخالفت میں پہلی باقاعدہ آواز محمد حسین آزاد نے بلند کی(۹۳) جنھیں باقاعدہ نقاد کہنا تو شاید درست نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اردو تنقید کو نظری بنیاد فراہم کرنے والوں میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔ وہ نہ صرف مغربی شعریات سے متاثر تھے بل کہ انھیں فروغ دینے کے لیے بھی ڈاکٹر لائٹنر کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ ابوالکلام قاسمی کے مطابق ان کی نظریاتی تنقید ''منصوبہ بند طریقے سے نو آبادیاتی نظریہ سازی میں اسیر''(۹۴) تھی۔ اگرچہ آبِ حیات کی اطلاقی تنقید میں وہ مشرقی پیمانے ہی استعمال کرتے ہیں تاہم نظری مباحث اور فطری نظموں کی تشہیری مہم سے ان کی غزل مخالف حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ انجمن پنجاب میں آزاد کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ آزاد نے: ''غزل کی مقبولیت کے دور میں اردو نظم کی ترویج اور شاعری کو چند محدود داحاطوں کی قید سے نجات دلانے کا بیڑہ اٹھالیا۔''(۹۵)

روایتی غزل پر حالیؔ کے اعتراضات اور مجوزہ اصلاحات بہت معروف ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ عظمت اللہ خان بھی حالیؔ کے ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ شدید غزل

مخالف رویہ رکھتے تھے۔ انھیں غزل پر دو بڑے اعتراض تھے: ایک اس کی ریزہ خیالی اور دوسرا قافیے کی بندش۔ ان کا خیال تھا کہ غزل میں قافیہ، ردیف اور بحر کی یکسانیت کے سوا ربط ضبط نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ قافیے کی قید شاعر کے لیے آزادانہ طور پر خیالات نظم کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ وہ خیال کے مطابق قافیہ لانے کے بجائے قافیے کے مطابق خیالات باندھنے پر مجبور رہتا ہے۔ لہٰذا فیصلہ کن انداز میں لکھتے ہیں:

''اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان مار دی جائے۔''(۹۶)

عندلیب شادانی کے تنقیدی سرمایے پر بھی غزل مخالف ہونے کا التباس ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''دور حاضر اور اردو غزل گوئی''(۹۷) اسی سلسلے کی ایک تنقیدی کاوش ہے۔ اس کتاب میں ''فرسودہ مضامین'' کی ایک فہرست دی گئی ہے جو فارسی غزل کی تقلید کے باعث آج تک ہماری غزل کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کی لفظیات میں مشرق وسطیٰ بالخصوص ایرانی تہذیب کے عناصر پر بھی تنقید کی اور اسے مقامیت عطا کرنے کی سفارش کی۔ دراصل یہ اقدام غزل مخالف رویے کے بجائے اس کی اسلوبیاتی اصلاح کا عندیہ دیتے ہیں۔

غزل کے سب سے مشہور مخالف کلیم الدین احمد ہیں جن کا یہ جملہ ''غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔''(۹۸) غزل مخالف دبستان کا عنوان بن چکا ہے۔ انھوں نے بھی ریزہ خیالی، قافیہ کے جبر اور تقلیدی رجحان کی بنا پر غزل کی مخالفت کی تھی۔ انیس ناگی بھی اسی قبیل کے فرد ہیں۔ آج تک یہ روایت نظم طباطبائی، ممتاز حسین، شمس الرحمٰن فاروقی اور فارغ بخاری وغیرہ کے خیالات کی شکل میں زندہ ہے۔

غزل کا مدافعتی مکتبِ فکر بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس طبقے میں نہ صرف بڑے بڑے ناقدین شامل ہیں بل کہ اسے مخالف گروہ پر عددی برتری بھی حاصل ہے۔ اس سلسلے کا پہلا بڑا نام سید مسعود حسین رضوی ادیب کا ہے۔ ان کی کتاب ''ہماری شاعری ـــ معیار و مسائل'' اردو کی تنقیدی

کلاسیک کا حصہ بن چکی ہے۔ اس تصنیف کا بنیادی محرک پیروئ مغرب کے نتیجے میں سامنے آنے والی جدید شعریات کا جائزہ لینا تھا۔[99] انھوں نے غزل پر لگائے گئے تمام اعتراضات کا مسکت جواب دینے کی کوشش کی اور غزل کی ایمائی صلاحیت، متنوع مضامین، محبوب کی جنس، عشقیہ کرداروں کی سماجی معنویت اور نئی خیال بندی پر مدلل اظہار خیال کیا۔

فراق گورکھ پوری اردو غزل کے حامی بھی ہیں اور اچھے غزل گو بھی۔ ان کی کتاب ''انداز ے'' اطلاقی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے جس میں سات کلاسیکل اردو شعرا کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ وہ ہماری کلاسیکل غزل کی فی زمانہ ترویج کے اس قدر قائل ہیں کہ نئی نسل کے لیے ولؔی سے لے کر حسرتؔ تک کے دواوین سے چھ سات سو صفحوں کا یک جلدی انتخاب شائع کرنے کی بھی تجویز دیتے ہیں[100] کیوں کہ ان کے خیال میں:

''خاص کر پرانی غزلوں سے جو شخص اچھی طرح مانوس نہیں اس نے اردو کیا پڑھی اور وہ نیا اردو ادب بھی کیا سمجھے گا۔''[101]

ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب ''اردو غزل''[102] نظری و عملی تنقید کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح محمد حسین ادیب، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مجنوں گورکھ پوری، سید عبداللہ، عابد علی عابدؔ، رشید احمد صدیقی اور شمیم احمد جیسے اصحاب نے بھی غزل کے حق میں بات کی ہے۔ طرفین کے مباحث سے یہ امر مترشح ہے کہ خلوص کے باوجود دونوں طرف جذباتیت کا عمل دخل بھی ضرور تھا۔ مخالفین یہ کہنے میں حق بہ جانب تھے کہ لکھنوی طرز کی غزل گوئی اس دور کے لیے موزوں نہیں جب کہ مدافعین کی یہ بات بھی دل کو لگتی ہے کہ اپنے اشاری نظام کے باوصف غزل ہی استعاری کلامیے کے مقابل آزادانہ فلسفۂ عمل کی ترجمان اور محافظ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا غزل میں اصلاحات بجا، مگر کلیتاً اسے رد کرنا کسی طور درست نہ تھا۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ شمس الرحمٰن، فاروقی، ڈاکٹر: تعبیر کی شرح،ص ۱۷۶

۲۔ ایضاً،ص ۴۷

☆ قدیم عربوں میں بھی یہ خیال رائج تھا کہ کسی متن کو پڑھنے کے کئی طریقے ہیں۔اسی بات سے وضعیاتی نقادوں کا یہ قول کہ شعریات دراصل ''فلسفۂ قرأت'' (Theory of Reading) ہے، جنم لیتا ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر: شعر شور انگیز، ج: اول، طبع: سوم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۶ء،ص ۱۸)

۳۔ غالب، دیوان غالب کامل، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷،ص ۲۸۰

۴۔ نیاز احمد شاہ: دیوانِ شاہ نیاز، لاہور: سیرت فاؤنڈیشن، ۲۰۰۶ء،ص ۲۴۲

۵۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء،ص ۵۰۸

۶۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر؛ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، پیش لفظ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان وادب،ص ۱۱

۷۔ فیض، فیض احمد: موج زر، مرتبہ: احمد سلیم،ص ۲۵۶

۸۔ عابد، عابد علی: انتقاد ادبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء،ص ۱۴۷

۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتب)، دیباچہ: دیوانِ ولا، از: مظہر علی ولا، لاہور: ادارہ ادب وتنقید، ۱۹۸۳ء،ص ۱۱

۱۰۔ دیوانِ ولا،ص ۱۲۴

۱۱۔ ایضاً،ص ۱۷۵

۱۲۔ عابد، عابد علی: اصول انتقاد ادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء،ص ۳۳۷

۱۳۔ اختر اورینوی: غالب کی فن کاری، مشمولہ: احوال ونقد غالب، مرتبہ: محمد حیات خاں سیال، لاہور: نذر سنز: ۱۹۶۸ء،ص ۲۰۰

۱۴۔ دیوان غالب کامل،ص ۲۴۳

۱۵۔ علی اکبر دھخدا (مؤلف): لغت نامہ دھخدا، شمارہ حرف ''غ'' :1 تہران: سال ۱۳۳۵ء خورشیدی

۱۶۔ المنجد، کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۶۲ء،ص ۸۷۵

۱۷۔ الیاس، الیاس انطون (مؤلف): القاموس العصری، قاہرہ: المطبۃ العصریہ، طبع: ہشتم، ۱۸۵۷ء، ص ۳۷۶

۱۸۔ ایضاً
مختار صدیقی: غزل اور شہزاد کی غزل، مشمولہ: فنون (جدید غزل نمبر): لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۳۸۶

۱۹۔ اُردو میں ساختیے (Structure) کے معنی ساخت یا ہیئت کے ہیں۔ اصل میں یہ سٹرکچرلزم کی ایک
☆ شاخ ہے جو تخلیقی اظہاریے کی اوپری سطح کے بجائے اسکے باطنی معنیاتی نظام سے بحث کرتی ہے۔ یہ نظام فی نفسہٖ بہت مبہم، مجرد اور گریز پا ہوتا ہے جس کے استعاراتی اور ایمائی سلسلے مربوط کرنا تعبیر خواب کی طرح ہی مشکل امر ہے۔
نارنگ، گوپی چند: ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۸۵۔۱۸۶

۲۰۔ بہ حوالہ، میر حسن (مرتب): تذکرہ شعرائے اردو، تصحیح و تنقید: مولانا حبیب الرحمٰن خاں، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۰ء، ص ۱۵۰

۲۱۔ میر حسن نے لکھا ہے کہ موزوںؔ سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ نواب کی شہادت
☆ پر یہی ایک فی البدیہہ شعر کہہ کر شہرت پائی۔ انھوں نے اسے ''آشنا پرست'' کا لقب بھی دیا ہے۔
(میر حسن، مولوی (مرتب): تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۵۰)

۲۲۔ اثر، امداد امام: کاشف الحقائق، مرتبہ: ڈاکٹر وہاب اشرفی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء، ص ۳۳۷

۲۳۔ منظور حسین، خواجہ: اُردو غزل کا خارجی روپ بہروپ، لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۸۱ء

۲۴۔ منقول از: شعر الھند، حصہ دوم، طبع چہارم، اعظم گڑھ: معارف، ۱۹۵۴ء، ص ۳۲۱

۲۵۔ ایضاً ص ۳۲۲

۲۶۔ دیوانِ غالب کامل، ص ۲۴۳

۲۷۔ عبدالسلام ندوی: شعر الھند حصّہ دوم، ص ۳۲۳

۲۸۔ رضی مجتبیٰ: جدید ادب کا تناظر، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۴ء، ص ۳۴۵

۲۹۔ اکبر الہ آبادی: کلیاتِ اکبر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء ص ۲۰۲

۳۰۔ اکبر الہٰ آبادی: کلیات اکبر، ص ۱۶۲

۳۱۔ دیوان غالب کامل، ص ۱۹۴

۳۲۔ نامۂ غالب بہ نام چودھری عبدالغفور خاں سرور، مشمولہ: خطوط غالب، مرتب: غلام رسول مہر، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۵۵۰

۳۳۔ ولاؔ، مظہر علی: دیوانِ ولا، ص ۱۷۹

۳۴۔ نیاز احمد شاہ: دیوانِ شاہ نیاز، ص ۵۸

۳۵۔ داغ: مہتاب داغ، مرتبہ: سید سبطِ حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۵
۳۶۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۹۸
۳۷۔ ایضاً، ص ۳۳۳
۳۸۔ حنیف رامے: غالب اور میں، مشمولہ: سویرا، ش: ۷۰، مقام: ندارد، قوسین، ص ۵۶
۳۹۔ فتح محمد ملک: اندازِ نظر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۴۲
۴۰۔ السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن: الاتقان فی علوم القران، کراچی: میر محمد کتب خانہ، س۔ن، ص ۲۷
۴۱۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۷۲
42. Stall worthy, Jon: Between the lines, London: Oxford uni. press, 1963
۴۳۔ سہیل احمد، ڈاکٹر: طرفین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۔۲۵
۴۴۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، ص ۴۰
۴۵۔ میر، میر تقی: کلیات میر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۴۲۰
۴۶۔ نارنگ، گوپی چند: ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۴۷
۴۷۔ اخلاق احمد دہلوی: یادوں کا سفر، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۹۷
۴۸۔ موزوں، رام نرائن، منقولہ: تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۵۰
☆ اس شعر کو نوآبادیاتی صورت حال کی ترجمانی کے بہ موجب وہ شہرت ملی کہ اردو شعر و ادب کا ہر بالغ نظر ناقد اس کے فکری و فنی حسن کی داد دیتا ہے۔ شعر کا اسلوب بیان اگر نوآبادیوں کے بکھرتے نظامِ زیست کا ترجمان ہے تو بین السطور کی ان کہی داستاں نوآبادکار سے نفرت (دشت و بیاباں کے خوں خوار شکاری کا تصوراتی لازمہ) اور ان کی فتنہ سامانیوں (قفس آرائیاں، جدید بند و بستِ چمن بندی، غمازی اہل چمن پر تشویش وغیرہ کے لوازمات) کی مظہر ہے۔ اپنے مخصوص تناظر کی بہ دولت اس شعر کو ایسی پزیرائی ملی کہ اسے نوآبادیاتی صورت حال کا تخلیقی عنوان کہا جا سکتا ہے۔
۴۹۔ مومن، مومن خاں: کلیاتِ مومن، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۸۱
☆ یہ شعر مومن کا ہے جو غالب کو بہت پسند تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے اس ضمن میں غالب پر وجدانی حالت طاری ہونے کی روایت یوں نقل کی ہے کہ: ''غالب جیسے صاحبِ نظر نے یہ شعر سن کر وجد کیا اور کہا کہ کاش مومن خاں میرا پورا دیوان لے کر یہ شعر مجھے دے دیتے''
(ڈاکٹر یوسف حسین خاں: اردو غزل، طبع چہارم، لاہور: آئینہ ادب ۱۹۶۴ء ص ۱۷۴)

۵۰۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۷۹

☆ ایک دفعہ اقبال مرزا غالب کے مزار پر آئے اور یہاں بیٹھ کر انھوں نے ولایت نامی ایک خوش آواز لڑکے کی زبانی مرزا کی وہ معروف غزل سنی جس سے مذکورہ شعر ماخوذ ہے؛ بالخصوص اس شعر کی سماعت کے دوران اقبال پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں:

''مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پرنم ہوگئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا''

(محمد اقبال: کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد: اوّل، مرتبہ: سید مظفر حسین برنی، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء، ص ۹۶)

۵۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج:3، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء ص ۸۷۷

52. Philip Drew: The Poetry of Browning (A critical Introduction) London: Methuen and Co. L.T.D. 1970, P.98.

۵۳۔ ریاض صدیقی: فراق کی شاعری کا سماجیاتی مطالعہ، مشمولہ: مجلّہ، ارتقا (فراق نمبر)، کراچی، ش:۳۶، س۔ن، ص ۹۷

۵۴۔ یوسف سلیم چشتی: شرح دیوانِ غالب، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۹ء، ص ۷۷۴۔۷۷۵

☆ یہ ترکیب غالب کے اس شعر میں استعمال ہوئی ہے:

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

(کلیات غالب کامل، ص ۱۸۸)

یوسف سلیم چشتی اسے گریز کا شعر قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں غزل کے بیانیہ امکانات کی بات نہیں کی گئی بل کہ شخصی مدح سے اس صنف کی عدم موزونیت بیان ہوئی ہے۔

۵۵۔ علی صفدر جعفری، ڈاکٹر: نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور: عذرا پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۲۹۱

☆ بوطیقا: یہ یونانی فلسفی ارسطو کی تنقیدی کتاب "Poetics" کا ترجمہ ہے جس میں شعر و ادب کے اولین مستند مباحث ملتے ہیں۔ ارسطو شاعری پر اخلاقیات کی پابندی نہیں لگاتا۔ جب یہ کتاب عربی میں ترجمہ ہوئی تو یہاں بھی یونانی اثرات در آئے اور نتیجتاً دروغ گوئی اور مبالغہ آمیزی کو عربی شعریات میں پھر سے پزیرائی ملنے لگی۔ واضح رہے کہ ماقبل اسلام کی شعریات میں مبالغہ آرائی موجود تھی۔

☆ شیفتہ (م: ۱۸۶۹ء) مبالغہ آرائی کے بجائے جذبات کی سچائی اور کلام کی سادگی کو کمال شاعری جانتے

تھے۔ حالی آٹھ نو سال تک ان کے ہاں رہے۔
(علی صفدر جعفری: نواب مصطفی خاں شیفتہ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۲۹۰)

۵۶۔ جذبی، معین احمد: حالی کا سیاسی شعور: لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۹۵

☆ ڈاکٹر عبادت بریلوی غالب، مومن اور شیفتہ کو ''جدید غزل کے ہیرو'' قرار دیتے ہیں۔ حالی ان سب اساتذہ سے فیض یاب تھے۔
(عبادت بریلوی، ڈاکٹر: غزل اور مطالعہ غزل، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء ص ۱۴۷)

۵۷۔ حالی، الطاف حسین: مقدمہ شعر و شاعری، لاہور: کشمیر کتاب گھر، س۔ن۔ ص ۱۱۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۶۰۔ ایضاً، ص ۴۵۔۱۴۷

۶۱۔ ایضاً، ص ۴۹۔۱۵۱

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۶۳۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، ص ۱۹۔۲۰

۶۴۔ حالی، الطاف حسین، مولانا: حالی کے خودنوشت حالات، مشمولہ: حالی کا نظریہ شعری، پیش کار: ناظر کاکوروی: الہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۱۷

۶۵۔ ناظر کاکوروی: حالی کا نظریہ شعری، ص ۲۱

۶۶۔ ابوالکلام قاسمی: معاصر تنقیدی رویے، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص ۷۰

۶۷۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، ص ۱۸

۶۸۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر: اردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س۔ن، ص ۱۴۶

۶۹۔ نیّر، ناصر عباس، ڈاکٹر: انجمن اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر، مشمولہ: نقاط، (نظم نمبر): فیصل آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۵۷

☆ حالی کا یہ مقدمہ انجمن پنجاب (بنیادی طور پر ایک برطانوی این جی او) کے اس ''مقصد اصلی'' سے پوری طرح ہم آہنگ تھا جس کی ایک جہت یہ ہے کہ نوآبادکار متن سازی اور تعبیر متن کے وسائل پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتے تھے (ڈاکٹر ناصر عباس نیّر: انجمن اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر، مشمولہ: نقاط، ص ۵۳۔۵۰)

۷۰۔ ایضاً، ص ۶۱

۷۱۔ ایضاً، ص ۷۰

ضیاء الحسن، ڈاکٹر: اردو تنقید کا عمرانی دبستان، ص ۵۶

۷۲۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: ادبی منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان

۷۳۔ وہند، ج: ۹، ص ۵۴

☆ اگرچہ حالی کی ان کاوشوں سے روایت کے دفاع کا ردعمل بھی سامنے آیا جس کی مثالیں حسرتؔ، جگرؔ، فانیؔ اور اصغرؔ وغیرہ کے ہاں ملتی ہیں مگر مجموعی طور پر غزل میں لکھنوی عناصر کی کمی، لکھنوی شعرا مثلاً صفیؔ، عزیزؔ، محشرؔ اور ثاقبؔ وغیرہ کے ہاں سماجی مسائل کی ترجمانی، ادبی انجمن ''معیار ادب'' اور اس کے موقر مجلے ''معیار'' کا اجرا وغیرہ مقدمہ حالی کی تقلیدی مثالیں ہیں۔ (شبیہ الحسن سید: لکھنؤ کی اردو تنقیدی شاعری (۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک)، مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، مخزونہ: پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔ ص ۱۴۷)

۷۴۔ حالی، الطاف حسین، مولانا: دیوان حالی، لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن، ص ۱۴۱

۷۵۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۷۶۔ ایضاً، ص ۹۲

۷۷۔ ایضاً، ص ۹۶

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۷۹۔ وارث کرمانی، ڈاکٹر: جدید شعری تنقید، مشمولہ: نقوش، لاہور، ش: ۱۵، ص ۲۴

۸۰۔ رشید حسن خاں، مقدمہ: دیوانِ حالی، ص ۹

۸۱۔ ایضاً، ص ۶

۸۲۔ ایضاً، ص ۷

۸۳۔ حالی، دیوان حالی، ص ۲۸

☆ انجمن کے ایک مشاعرے میں حالی نے اپنی نظم ''حبِّ وطن'' پیش کی۔ مقتدر کلامیے کی ترجمان اس نظم کے چند اشعار دیکھیے:

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی درّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی

یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام
کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام

(منقول از عارف ثاقب: انجمن پنجاب کے مشاعرے، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۴)

۸۴۔ دیوانِ حالی، ص ۱۳۲

۸۵۔ ایضاً، ص ۹۲

۸۶۔ ایضاً، ص ۸۹

۸۷۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: جنگ آزادی کے اردو شعرا، ص ۵۸۵

۸۸۔ نیّر، ناصر عباس، ڈاکٹر: انجمن اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر، ص ۷۶

۸۹۔ دیوانِ حالی، ص ۸۸

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۹۱۔ ایضاً، ص ۸۷

۹۲۔ امیر، عبدالرؤف: اردو غزل: مخالفت و مدافعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، مخزونہ: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

۹۳۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند: ج: ۹، ص ۵۸

۹۴۔ ابو الکلام قاسمی، ڈاکٹر: جدید اردو تنقید، محمد حسین آزاد اور نوآبادیاتی مضمرات، مشمولہ: آزاد صدی مقالات، مرتبہ: ڈاکٹر تحسین فراقی؛ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، لاہور: شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۹

۹۵۔ انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں، لاہور: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۳ء، ص ۳۶۸

۹۶۔ عظمت اللہ خان: انتخاب مضامین عظمت، راول پنڈی: نور آرٹ پریس، ۱۹۶۵ء، ص ۸۱

۹۷۔ عندلیب شادانی: دور حاضر اور اردو غزل گوئی: طبع: دوم، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء

۹۸۔ احمد: کلیم الدین، اردو شاعری پر ایک نظر، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء، ص ۵۶

۹۹۔ ادیب، مسعود حسین رضوی، سیّد: ہماری شاعری۔ معیار و وسائل، تلخیص و ترتیب: ایس۔ایم۔شاہد، لاہور، نذر سنز، طبع دوم، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۱

۱۰۰۔ فراق گورکھ پوری: اندازے، طبع: دوم، لاہور: ادارہ فروغ ادب، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰

۱۰۱۔ ایضاً

۱۰۲۔ یوسف حسین، ڈاکٹر: اردو غزل، لاہور: آئینہ ادب، طبع چہارم، ۱۹۶۴ء

نوآبادیاتی نظام کا تشکیلی دور اور اُردو غزل

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور
(میرؔ: کلیاتِ میر، ص ۲۶۸)

عہدنو کی کاذب حقیقتیں اور جدید آئیڈیالوجی کی تشکیل

اردو غزل کے آئینے میں

یورپی اقوام محض تجارتی مقاصد کے لیے ہندوستان وارد ہوئی تھیں مگر یہاں کے حالات سازگار پا کر انھوں نے سیاست میں بھی دل چسپی لینا شروع کر دی۔ جب انھیں سیاسی اثر و رسوخ حاصل ہوا تو ایوانِ اقتدار سے قریب تر ہونے اور مزاحمتی کلامیے کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے سماجی انصاف، تہذیبی ترقی اور جدید علوم کی ترویج و اشاعت کا جھانسہ دے کر اپنا جدید کلامیہ متعارف کروانا شروع کر دیا۔ نوآبادیاتی کلامیے کا ایک اساسی مقصد مقامی افراد کو اپنے قدیمی فکر و فلسفہ، اقدار و روایات اور طرز زندگی کے دیگر شعبوں سے متنفر کرنا بھی ہوتا ہے۔ جس کے لیے نئے نظام خیال پر مشتمل ایسا استدلالی مواد پیش کیا جاتا ہے کہ عوام کو اپنی تہذیب و ثقافت کی کھوکھلاہٹ اور دقیانوسیت کا یقین ہونے لگے۔ نوآبادکار کی متعارفہ آئیڈیالوجی مقامی تہذیب کی ہمہ جہتی تردید پر کاربند رہتی ہے۔ بہ قول اکبرالہ آبادی:

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا
ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں (۱)

ایک نو آبادکار قوت اپنے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے عموماً یہی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ ہندوستان میں بھی نو آبادیاتی عہد کے دوران میں مقامی رعایا کی تہذیب و ترقی اور انھیں ''علوم مفیدہ'' سے بہرہ مند کرنے کا تمام پروپیگنڈا محض ایک حربہ تھا۔ ان فلاحی کاموں کی منصوبہ بند تشہیر کر کے برطانوی کمپنی اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ باری علیگ نے اس نوع کی تہذیبی مداخلت کو ''منظّم بربریت'' کہا ہے۔(۲) ایسے حالات میں عموماً تین طرح کا ردّعمل متاثرہ قوم کی طرف سے سامنے آتا ہے:(۳)

i۔ روایت پرستی

ii۔ جدیدیت

iii۔ روایت اور جدیدیت کا ادغامی رویہ

جدید اور قدیم کے اس مناقشے میں مقتدر کلامیے سے ہم آہنگ رویّے کو ہمیشہ برتری حاصل رہی ہے۔ فرنگی استعمار کی اس تہذیبی دھونس کے نتائج یہ سامنے آئے کہ مقامی سماج کے فنونِ لطیفہ، اقدار و روایات حتّٰی کہ ایمانیات تک متاثر ہونے لگی۔ پروفیسر فتح محمد ملک اسی نوع کی تبدیلی کو ''غلامی کا اولین باب'' قرار دیتے ہیں۔(۴) دراصل ایسی حالت میں دل و دماغ کی دنیاؤں میں واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مفتوح قوم کے خارجی افعال نئے کلامیے سے مطابقت پذیر ہونے لگتے ہیں مگر اس کے باطن کی دنیا اپنی روایت سے پوری طرح جڑی رہتی ہے۔ اس طرح ظاہر و باطن کی ایک کشاکش اسے ہمہ وقت بے قرار کیے رکھتی ہے۔ ہر شخص نئے دور کی کاذب حقیقتوں کی اصلیت جانتا ہے مگر ایک فریب خوردگی کے انداز میں اس پر عمل کرنے پر بھی خود کو مجبور پاتا ہے۔ اس تناظر میں شمیم حنفی کا یہ تجزیہ بالکل بجا ہے کہ:

> ''قدیم و جدید کے دوراہے پر ایک شدید ذہنی اور جذباتی کشمکش انیسویں صدی کے تمام مصلحین کے یہاں نظر آتی ہے۔''(۵)

یہ اسی کش مکش کی کارستانی ہے کہ اس دور کا ادبی طرزِ احساس بدلا بدلا محسوس ہوتا ہے۔ یوں تو شاعری بھی کذب ہی کی ایک قسم ہے مگر مطلق کذب، شاعرانہ کذب اور کاذب حقیقت میں

نمایاں فرق ہوتا ہے۔ کاذب حقیقت تو محض صداقت کا لبادہ اوڑھے ایک سفید جھوٹ ہوتی ہے۔
ایک شاعر جب مسلّمہ حقائق میں ایسے بیانیوں کا ادغام ہوتے دیکھتا ہے تو ادبی قرض اسے پکارنے
لگتا ہے۔ نوآبادیاتی دور کی غزل میں ہمیں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں جدید کلامیے کی
ترویج، اس کے ناموافق اثرات اور اس کی تردید میں مزاحمتی رویوں کا اظہار ہوتا ہے؛ چند اشعار
ملاحظہ فرمائیں:

کہوں کیا انقلاب اس وقت میں یارو زمانے کا
جسے سب عیب سمجھے تھے وہ نظروں میں ہنر ٹھہرا (۶)

وہ جس گناہ کو کہہ دیں ثواب ہو وہ ثواب
جسے قصور بتادیں، قصور بن کے رہے (۷)

کل کے مقبول آج ہیں مردود
آہ اس دورِ انقلاب کے رنگ (۸)

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے (۹)

شارحِ دیوانِ ہستی ہے قیاس مغربی
ہے ازل بھی تجربوں کے زیرِ فرماں ان دنوں (۱۰)

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے (۱۱)

نوآبادیاتی دور میں اس نوع کے مزاحمتی اشعار ایک فکری رجحان کی حیثیت رکھتے ہیں۔
اس عہدِ کشاکش کی تشکیل سے لے کر عروج تک تقریباً ہر بڑے شاعر کے ہاں ایسے آثار موجود ہیں۔

اقبالؔ نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں ایسے جدید حقائق کی پذیرائی کا یہ تجزیہ کیا ہے کہ فاتح اقوام اپنے مفتوحہ سماج کا زاویۂ نظر تبدیل کر دیتی ہیں۔اس ضمن میں ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غلامی کیا ہے؟ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا (۱۲)

الغرض مغربی آقاؤں نے اپنے مقتدر کلامیے کے ذریعے جو نئے حقائق متعارف کروائے تھے اور جس طرح مقامی سماج کے زاویۂ فکر کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی، اس کی پوری داستان اردو غزل کے دامن میں محفوظ ہے۔

کمپنی کی حکومت..... تشکیل وارتقا اور اس کے شعری نشانات

ہندوستان میں یورپی اقوام کے ورود سے لے کر خروج تک ہر واقعہ اردو غزل کا حصہ بنا ہے۔ جب ہم ماضی کی تاریخ، آثار اور تذکروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معاصر غزل کی روایت میں ہمیں اس کے تمام جزیات کی جھلک ملتی ہے۔ برطانوی قوم کے حوالے سے بات کریں تو ان کی آمد، سورت میں ابتدائی قیام، تہذیبی رکھ رکھاؤ، مقامی سیاست میں دلچسپی، فوجی قوت کا اہتمام اور گاہے بہ گاہے اس کا مظاہرہ کرنے جیسے امور اردو غزل کا فکری سرمایہ ہیں۔ مثال کے طور پر تجارتی کمپنیوں کی ہندوستان آمد اور ان کی ریشہ دوانیاں سراج اورنگ آبادی کے اس شعر سے نمایاں ہوتی ہیں:

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی (۱۳)

سراج کا ہم عصر شاعر ولی دکنی (۱۷۴۴۔۱۶۶۸ء) چوں کہ جنوبی ہند کا ہی باشندہ تھا لہٰذا اسے بھی اہل فرنگ کی ابتدائی سرگرمیوں کا عینی شاہد خیال کیا جا سکتا ہے۔ ولی کے دیوان میں اس سلسلے کی معاصر شہادتیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں جس سے ان کی غزل میں نئے ابعاد کا سراغ ملتا ہے:

معنی کی طرف چلیا ہے صورت سوں یوں میرا دل
سورت ستی چلیا ہے کعبے جہاز گویا (۱۴)

ہوئی ہے دھنگ تصویر فرنگ دیکھ
تیری صورت کہ یہ رشک دمن ہے (۱۵)

کفار فرنگ کو دیا ہے
تجھ زلف نے درس کافری کا (۱۶)

ہر پلک تیری کہ ہے تیغِ فرنگ
عاشقاں کے مارنے کوں تیز ہے (۱۷)

ولی نے کمپنی کے صدر مقام سورت کو صرف غزل ہی میں منزل کعبہ کا نقطۂ آغاز قرار نہیں دیا بلکہ اس کی شان میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جس میں اہل فرنگ کے دل کش حسن و عمل کا بہت فن کارانہ اظہار کیا گیا ہے۔ ☆ ولی کی غزلیات میں کئی جگہ پختہ سیاسی آگہی ملتی ہے مگر المیہ یہ ہے کہ اسے معاصر تناظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

اہل فرنگ جب کرناٹک کی لڑائیوں میں اپنے فرانسیسی حریف پر غالب آگئے تو انھیں اپنی عسکری قوت میں بہت سے مزید امکانات نظر آنے لگے۔ اس دوران میں ہندوستانی حکمران نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی دست برد کا بھی نشانہ رہے۔ جب انگریزوں نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تو نظام حیدر آباد کو اعتماد میں لے کر سراج الدولہ پر حملہ کر دیا اور اسے پلاسی کے میدان میں عبرت ناک شکست دی۔ اس تاریخی سانحے سے منسوب راجہ رام نرائن موزوںؔ کا یہ شعر اساسی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری (۱۸)☆

میر حسنؔ لکھتے ہیں کہ یہ شعر سراج الدولہ کی شہادت کے موقع پر کہا گیا تھا۔ (۱۹) یہ وضاحت پا کر اس شعر کے معنوی حسن اور تاریخی انسلاک کے پیش نظر تقریباً سبھی بڑے ناقدین نے اس کی تعبیر و تحسین کے ایسے ہی اشارے دیے ہیں، جس سے یہ شعر اپنی مخصوص معنویت کے تاریخی منظر نامے کا عنوان بن کر اردو ادبیات کا مستقل حوالہ بن چکا ہے۔ اس میں غزالاں، مجنوں کی موت اور اس کے بعد ویرانے کی حالتِ زار کے الفاظ کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ "غزالاں" یہاں سراج الدولہ کے جاں نثار سپاہیوں اور خیر اندیشوں کی علامت ہے؛ مجنون کی موت نواب کی شہادت کا اشارہ ہے جب کہ "ویرانے پہ کیا گزری" کہہ کر شاعر نے سرزمین بنگال پر ٹوٹنے والے سامراجی ظلم و استبداد کی بپتا بیان کی ہے۔ یوں گویا یہ شعر سامراجی نظام کی تشکیل و ترقی اور مقامی

معاشرے میں اس کی پیدا کردہ تخریب کاری کا بھرپور اجمالی بیانیہ قرار پاتا ہے۔

جنگ پلاسی کے بعد بکسر کی لڑائی میں ہندوستانی حکمرانوں کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی۔ جب شاہ عالم مرہٹوں کی پناہ میں چلا گیا تو انگریزوں نے بنگال کی دیوانی کا معاوضہ دینا بند کر دیا۔ اب وہ اس قدر بارسوخ ہو چکے تھے کہ لارڈ ہیسٹنگز نے شاہ عالم سے خطاب لینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اسی لارڈ کے کہنے پر شجاع الدولہ نے شاہِ برطانیہ کے نام کا سکہ جاری کرنے کی حامی تک بھر لی تھی جسے بعد ازاں کمپنی ڈائریکٹروں کی مداخلت پر نظر انداز کر دیا گیا۔ شاہ عالم کے نام پر کی جانے والی مراسلت میں اب شاہانہ القاب و آداب کا تکلف بھی برقرار نہ رہا تھا۔ فتح علی ٹیپو کی شکست سے ان کے راستے کا آخری پتھر بھی ہٹ گیا۔ چناں چہ لارڈ ولزلی کے دور (۱۷۹۸۔ ۱۸۰۵ء) میں شاہ عالم کو مرہٹوں کی پناہ سے نکال کر کمپنی کا دستِ نگر بنا لیا گیا۔

یہ تمام سیاسی تناظرات اس دور کی غزل پر اثر انداز ہوئے تاہم اس عہد کے شمالی ہند میں اردو شاعری ابھی زیادہ مروج نہ تھی۔ اس سلسلے کی باقاعدہ ابتدا محمد شاہی عہد (۱۷۱۹۔۱۷۴۸ء) کے متقدمین شعرا سے ہوتی ہے جن میں آرزوؔ، آبروؔ، حاتمؔ اور مظہرؔ جانِ جاناں وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ اس زمانے میں اردو غزل ایہام گوئی کی تحریک کے زیرِ اثر تھی جو فکری ساخت کے بجائے زیادہ تر لفظی شعبدہ بازی سے علاقہ رکھتی مگر بعض شعرا کے ہاں اس عہد میں بھی نوآبادیاتی شعور کا ابتدائی سراغ ملتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ملک حسن اختر کی کتاب ''اُردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''[۲۰] نوآبادیاتی فکریات کے بعض کم یاب اشعار کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ان شعرا کے شعری مجموعے تو کچھ زیادہ نہیں ملتے البتہ قدیم تذکروں میں ان کا کچھ کلام ضرور شامل ہے تاہم مشکل یہ ہے تذکروں میں شامل کسی شاعر کے دو ایک اشعار سے اس کے نوآبادیاتی شعور کا سراغ لگانا خاصا دقیق کام ہے۔ ان شعرا میں سے ظہور الدین حاتمؔ (کہ ان کا دیوان دستیاب ہے) کے کچھ اشعار بہ طور مثال یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

سانولے رخسار اوپر کھول کر زلفوں کے تئیں
ہند میں کافر نے عالم کو کیا قید فرنگ[۲۱]

نہ ہس اس گل بدن صیّاد آگے کھل کھل اے بلبل
تجھے ہے پنجرۂ تابوتی اوّل منزل اے بلبل (۲۲)

زلف کے دل رُبا کا آج خیال
دل کو قید فرنگ ہے یارو (۲۳)

ہم بہت دیکھے فرنگستان کے حسنِ صبیح
چرب ہے سب پر بتانِ ہند کا رنگ ملیح (۲۴)

نظر میں اس کی جو چڑھتا ہے سو جیتا نہیں بچتا
ہمارا سانولا اس شہر کے گوروں میں کالا ہے (۲۵)

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ متقدمین غزل گو نو آبادیاتی دور کی ابتدائی تشکیلات سے ضرور علاقہ رکھتے تھے اور ان کی غزلوں میں یورپین متعلقات بہ ہر طور موجود ہیں جن کے تجزیاتی مطالعے سے ہمیں مقامی معاشرے میں نو وارد اقوام کی ابتدائی حیثیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایہام گوئی کی یہ تحریک عہد محمد شاہی میں ابھری اور اسی میں ختم ہوگئی۔ مرزا مظہر جانِ جاناں نے اس رجحان کے متوازی تازہ گوئی اور اصلاح زبان کی تحریک کا ڈول ڈالا تو اردو شاعری کو جلد ہی اس لفظ بازی کے جھن جھٹ سے آزادی مل گئی۔ تازہ گو شعرا نے تخلیقی اظہار اور ترجمانی کا نسبتاً بہتر تال میل قائم کیا تاہم ایہام گو شعرا اگر صنعتِ ایہام کے سحر میں مبتلا رہے تو تازہ گو حضرات نے بھی اپنی زیادہ تر توجہ اصلاح زبان پر صرف کیے رکھی۔ ان دونوں تحریکوں سے زبان کی اظہاری صلاحیت اور لغوی سرمائے کو تو فائدہ پہنچا مگر اس کی فکری ابعاد زیادہ فعال نہ ہوسکیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانے میں کوئی بڑا شاعر موجود ہی نہ تھا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اس دور کا اہم ترین واقعہ جنگ پلاسی ہے جسے بجا طور پر "۱۸۵۷ء کا ریہرسل" (۲۶) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سانحے میں ہندوستانی قوم مغربی سامراج کے ہاتھوں یرغمال بنالی گئی مگر اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس تاریخی واقعے پر

لسانی تحریکیں اس شان دار عہد کی پیش رو بنیں جسے ''غزل کا زرّیں دور'' کہا جاتا ہے۔[۲۷] اس دور میں یہ صنفِ سخن اپنے فن کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ ان شعرا کے کلام میں معاصر سیاسی آشوب اپنے تخلیقی پیرہن میں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہ ہماری تنقید کا المیہ ہے کہ آج ہم ان متغزلین کو محض ''آہ'' اور ''واہ'' یا ''ہوحق'' کے خانوں میں بانٹ کر مطمئن ہو جاتے ہیں حال آں کہ انھوں نے اپنے نازک دور سے فن کارانہ علاحدگی کا اہتمام کر کے ایسے شاہ پارے تخلیق کیے ہیں جن میں عصری آگہی کا ہر رنگ موجود ہے۔ ان شعرا کی غزلیں جب ہم نو آبادیاتی تناظر میں دیکھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تاریخی واقعات کا البم دیکھ رہے ہوں۔ یہ نکتہ رس شاعران حادثات کی چاپ بھی بہ خوبی سن رہے تھے جنھیں نصف صدی بعد وقوع پذیر ہونا تھا لہٰذا ان کی غزل میں استعماری غلبے کی جھلک نمایاں طور پر ملتی ہے۔ مثال کے لیے اس دور کے نمائندہ شعرا کے چند اشعار دیکھتے ہیں؛ سب سے پہلے مغربی اقوام کے پھیلائے استعماری فتنہ و فساد کی جھلک ملاحظہ فرمائیں:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں[۲۸]

وہ فتنہ خیز ہے ظالم جہاں میں تیرا حسن
کہ باپ بیٹے کو مشکل پڑا بہم جینا[۲۹]

دل اس مژہ سے رکھیو نہ تو چشمِ راستی
اے بے خبر برا ہے یہ فرقہ سپاہ کا[۳۰]

دبے پاؤں آنے والے نو آبادیاتی آشوب کو ان شعرا نے یوں بیان کیا ہے:

نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمتِ امکان زائل ہو
چھڑاوے آہ کوئی زندگی سے اس سیاہی کو[۳۱]

ہزار حیف کوئی باغ میں نہیں سنتا
چمن چمن پڑی کرتی ہیں بلبلاں فریاد (۳۲)

دل نہیں کھنچتا ہے بن مجنوں بیاباں کی طرف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف (۳۳)

دردؔ کا یہ محاکاتی شعر تو اپنی مثال آپ ہے؛ شاہ عالم کی بے اختیاری کا اس سے بہتر اظہار شاید ہی کسی نے کیا ہو:

میں دل کے ساتھ کب تئیں کشتی لڑا کروں
اب اختیار ہاتھ سے جاتا ہے، آئیو! (۳۴)

فرنگی استعمار نے ملک کی تمام چھوٹی بڑی ریاستوں پر اپنا جال پھیلا رکھا تھا۔ فتنہ و فساد کی آگ سے سبھی بے قرار تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ کی رعایت سے بات کریں تو گویا ہمارے چمنستان '' کی جڑوں میں انگریز محافظ، باغباں بن کر، تیزاب ڈالنے میں لگا ہوا تھا۔''(۳۵) ایسے میں دردؔ نے قید فرنگ کا وہ تصور جس کا سباق بہادر شاہ ظفر اور رنگیلے پیا (محمد علی شاہ رنگیلا) کی اسیری یا بعد میں انڈیمان کے قیدیوں سے تیار ہوا، بڑے واضح پیرائے میں پیش کر دیا تھا:

کب ہے دماغ عشقِ بتانِ فرنگ کا
مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قید فرنگ ہے (۳۶)

نوآبادکار کی تیزی سے پنپتی قوت نے آزادیٔ اظہار پر پابندی کا تاثر دیا تو شعرا نے یوں اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا:

سر تا قدم زباں ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں (۳۷)

بسانِ شیشہ نکالوں میں کیوں کہ دل کے بخار
کہ بولتے ہی گلا یاں تو داب لیتے ہیں (۳۸)

انصاف کس کو سونپیے اپنا بجز خدا

منصف جو بولتے ہیں سو تجھ سے ڈرے ہوئے [39]

یہ آخری شعر رفیع الدین سودا کا ہے۔ نشانِ خاطر رہے کہ یہ وہی سودا ہیں جنھیں بیسویں صدی کے شروع میں اگر محمد حسین آزاد نے مکتبِ میر کے مقابل ''سودائی'' طرز فکر کا سرخیل بنا کر پیش کیا تھا تو اکیسویں صدی کی شروعات بھی اسے ''پرابلم چائلڈ''[40] کا مونوگرام لگا کر پیش کرنے سے ہوتی ہیں۔

ان اشعار کا روئے سخن بالکل واضح ہے۔ تاہم اس دور کے شعرا کا یہ اعزاز ہے کہ انھوں نے تخلیق شعر میں فن کارانہ علاحدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تغزل کو خارجیت کی نظر نہیں ہونے دیا۔ سودا نے اپنے اس سنہری دور کا فلسفۂ شعر یوں بیان کیا ہے:

تیری سمجھ کے آگے ناقص نہیں عبارت

گو ہم سے حرفِ مطلب لکھنے سے رہ گیا ہے [41]

اُردو غزل کے اس اہم ترین دور کا سب سے بلند مرتبہ شاعر میر ہے لہٰذا مغربی اقوام سے متعلق تخلیقی آثار جانچنے کے لیے ان کی غزلیں بہ طور نمونہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ یوں بھی اگر ہم فی صدی ایک شاعر کا انتخاب کریں تو سترھویں صدی سے بیسویں صدی تک بالترتیب ولی، میر، غالب اور اقبال کے نام سامنے آتے ہیں۔ ان میں میر سب سے بلند رتبہ ہیں۔[42] اگر ہم ادبی دنیا کے تمام دانش ور طبقات یعنی تخلیق کاروں اور ناقدین کی مجموعی آرا کا ماحصل نکالیں تو اردو کے سب سے بڑے شاعر میر تقی میر ___ المقلب بہ ''خدائے سخن ___'' قرار پاتے ہیں۔ ہماری زبان کے شعر و ادب میں تحسین میر کی ایک مضبوط روایت قائم ہو چکی ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ آج ان کا عمومی تصور محض ایک قنوطی، شکست خوردہ اور حد درجہ دروں بیں شاعر کے طور پر ذہنوں میں آتا ہے حال آں کہ وہ اٹھارھویں صدی میں متن کی اسی معنوی کثرت آرائی کے نقیب تھے جسے آج کی مغربی دنیا نے دریافت کیا ہے:

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر

کیا کیا کہا کریں ہیں زبان قلم سے ہم [43]

میر نے سخن کی تہہ داری پر ایک دو نہیں، بیسیوں شعر کہے ہیں۔ نوآبادیاتی تناظر میں یہ شاعری نہایت پر مغز اور اہم دستاویز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ معاصر زمانی محسوسات کو مربوط تخلیقی پیرہن عطا کرنے کی بنا پر انھیں "نظم گو غزل گو" بھی کہا جاتا ہے۔ (۴۴) بلاشبہ "ان کی شاعری کے تخم" موجود ہیں۔ (۴۵) یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ میر کا نام فورٹ ولیم کالج میں بہ طور منشی زیر غور آیا تھا جو بہ وجہ کبر سنی نظر انداز کر دیا گیا۔ (۴۶) مگر ان کا نئے آقاؤں کی نگاہ انتخاب میں آنا علمی برتری کی بنا پر تھا نہ کہ انگریز دوست رویّے کے بموجب۔ انھوں نے اپنا فلسفہ عمل اس شعر میں بیان کیا ہے:

مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروشِ چمن نہیں (۴۷)

فرنگی استعمار دبے پاؤں ہندوستانی تخت و تاج کی طرف بڑھ رہا تھا اور میر کھلی آنکھوں سے یہ سب معاملات دیکھ رہے تھے۔ وہ جب لکھنؤ میں آصف الدولہ کے مصاحب تھے تو اسی دوران میں فرنگی حاکم لارڈ ہیسٹنگز نواب کے دربار میں وارد ہوئے۔ نواب کی خواہش تھی کہ میر ان کی شان میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائیں۔ ادھر میر نے اپنے سرپرست کی خواہش کا احترام تو کیا مگر استقبالیہ تقریب کے معاملات اور ضیافت کی عمدگی وغیرہ کا ذکر کر کے انگریزوں کی مدح سرائی سے صاف احتراز برتا۔ (۴۸)☆ میر کی غزل سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے ان کی نوآبادیاتی فکر کے تعین میں یقیناً مدد ملے گی:

مار گیری سے زمانے کی نہ دل کو جمع رکھ
چال دھیمی اس کی ایسی ہے کہ جوں اجگر چلے (۴۹)

چشم چرائی دور سے کروا مجھ کو لگا پھر کہتے گیا
صید کریں گے کل ہم آ کر ڈال چلے ہیں چارا آج (۵۰)

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب
شہر پر شور اس غلام سے ہے (۵۱)

غیر نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے

اس کتّے نے کر کے دلیری صید حرم کو مارا ہے (۵۲)

میؔر نے اپنے اشعار میں متکلم کا صیغہ بہ کثرت استعمال کیا ہے۔ اردو غزل کی اپنے قارئین سے یہ خاموش مفاہمت رہی ہے کہ اس کا صیغہ متکلم مختلف کرداروں کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مغنی تبسّم لکھتے ہیں کہ ''غزل میں ضمیر متکلم کی تعمیم کے ساتھ ہر ضمیر اور وصف کی تعمیم ہو جاتی ہے۔'' (۵۳) میؔر عموماً اس قسم کا شعری اسلوب یورپی استعمار کے لیے ہی اپناتے ہیں۔ وہ اپنے شعر میں کوئی ایک دو قرینے ایسے ضرور رکھ دیتے ہیں جن سے واضح طور پر ان کا ہدف تنقید قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً آخری شعر لیں تو ''اُس کتے'' کا ''صیدِ حرم'' کو مارنا اور پھر پہلے مصرعے میں ''ذبح'' کا لفظ اور ''طاقت ہے نے یارا ہے'' کا نوحہ نو آبادیاتی تناظر کا سب معاملہ صاف کر دیتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک (۵۴)☆ اور ڈاکٹر معین الدین عقیل (۵۵) وغیرہ نے اسی تناظر پر صاد کیا اور ''اس کتے'' سے مراد فرنگی آبادکار ہی لیا ہے۔ واضح رہے کہ عام سگ یا کتے کے معنوی انسلاکات میؔر کے ذہن میں اس قدر کریہہ نہیں۔ اپنی ایک مثنوی ''در تعریف مادہ سگ'' میں وہ اسی جانور کے لیے ''سگِ اصحابِ کہف کی خالہ'' (۵۶) کا مصرع بھی موزوں فرماتے ہیں۔ اس موقف کی ایک داخلی شہادت پر نظر کی جائے تو مبینہ انسلاکات کھل کر متبادر صورت اختیار کر لیتے ہیں؛ میر کا ایک شعر اسی مضمون میں یوں بھی ملتا ہے:

لڑکے دلی کے ترے ہاتھ میں کب آئے میؔر

پیچھے ایک ایک کے سو سو پھرے ہیں ڈاگ لگے (۵۷)

میؔر نے آشوب آگہی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ وہ حالات کی نزاکت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

کیا پتنگے کو شمع روئے میؔر

اس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش (۵۸)

غفلتِ دل سے ستم گزریں ہیں سومت پوچھو

قافلے چلنے کو تیار ہیں، ہم خواب میں ہیں (۵۹)

ذرا سوچیے کس شمعِ تیرہ شب کو سحر کا خطرہ درپیش تھا؟ غفلتِ دل کا اشارہ کس جانب ہے؟ ایسے تمام سوالوں کا جواب مغلوں کے شاہی نظام میں بالعموم اور شاہ عالم ثانی کی ذات میں بالخصوص پوشیدہ ہے۔ فرنگی کے ہاتھوں میں کھیلتے اس ''کٹھ پتلی'' (۶۰) حکمران کے لیے بادشاہ کے لفظ کو میر نے ''تہمت'' (۶۱) قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنی سوانحی تحریر ''ذکرِ میر'' میں اس بدقسمت بادشاہ کی در بدری اور جنگِ بکسر میں مع اپنے حواریوں کے، پس پائی کا حال بڑی غیر جانب داری سے پیش کیا ہے۔ (۶۲)

میر کی غزلیات کی صحیح تاریخی ترتیب تو فی الحال معلوم نہیں ہو سکی تاہم غالب امکان یہ ہے کہ ان کے بہت سے کلام کا سیاق ایسے سیاسی ماحول میں تیار ہوا جب شمالی ہند کا وسیع علاقہ بھی انگریزی تسلط میں آچکا تھا۔ ان کی بعض غزلیں تو نو آبادیاتی استبداد کا منظوم بیانیہ معلوم ہوتی ہیں:

قفس تو یھاں سے گئے پر مدام ہے صیّاد

چمن کی صبح کوئی دم کو شام ہے صیّاد

بہت ہیں ہاتھ ہی تیرے نہ کر قفس کی فکر

مرا تو کام انھیں میں تمام ہے صیّاد (۶۳)

گرفتہ دل ہوں سرِ ارتباط مجھ کو نہیں

کسو سے شہر میں کچھ اختلاط مجھ کو نہیں

ہوا ہوں فرط اذیت سے میں تو سُن اے میر

تمیزِ رنج و خیال نشاط مجھ کو نہیں (۶۴)

جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی فتح کیا تو ہندوستان کا نابینا تاج دار شاہ عالم ثانی اسے خوش آمدید کہنے کے لیے اپنے بوڑھے ہاتھوں میں ہار لیے کھڑا تھا۔ اس تناظر کو ذہن میں رکھیں تو یہ اشعار اپنا پورا معنوی سرمایہ آپ کے حوالے کر دیں گے:

کہوں سو کیا کہوں نے صبر نے قرار ہے آج
جو اس چمن میں یہ اک طرفہ انتشار ہے آج
سر اپنا عشق میں ہم نے بھی یوں تو پھوڑا تھا
پر اس کو کیا کریں اوروں کا اعتبار ہے آج
جہاں کے لوگوں میں جس کی تھی کل تئیں عزت
اسی عزیز کو دیکھا ذلیل و خوار ہے آج
کسو کے آنے سے کیا اب کہ غش ہے کل دن سے
ہمیں تو اپنا ہی اے میر انتظار ہے آج (۶۵)

دراصل ۱۸۰۳ء کا واقعہ محض آقاؤں کی تبدیلی یعنی شاہ عالم کا مرہٹہ دست برد سے نکل کر انگریزوں کی پناہ میں آنا نہ تھا بل کہ میرؔ اس تبدیلی میں ۱۸۵۷ء کے سقوط دہلی کی جھلک دیکھ رہے تھے لہٰذا انھوں نے اس واقعے پر اسی تخلیقی ردعمل کا اظہار کیا جس کا مظاہرہ جنگ آزادی پر لکھے گئے غالبؔ کے قطعے ''بسکہ فعّال ما یرید ہے آج،،(۶۶) میں ہوا ہے۔ میرؔ کے ہاں سیاسی شعور کا نظام بہت مربوط ہے۔ انھوں نے استعماری خطرات کی محض چاپ ہی نہ سنی تھی بل کہ اس کے بھیانک نتائج بھی محسوس کیے تھے۔ ان کے کلام میں اس صورت حال سے نکلنے کی حکمت عملی بھی کسی قدر بیان ہوئی ہے:

مت کھا فریبِ عجز عزیزاں حال کا
پنہاں کیے ہیں خاک میں یاروں نے دام یاں (۶۷)

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دِلوں کی بجھی ہے آگ (۶۸)

معرکہ گرم تو ٹک ہونے دو خوں ریزی کا
پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے (۶۹)

تا چند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر
اے آہِ صبح گاہی آشوبِ آسماں ہو(۷۰)

میرؔ کے مذکورہ بالا شعروں میں اتنی خود اعتمادی، پرسوزی اور جرأتِ مبارزت پائی جاتی ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے اقبال کا رنگِ تغزل یاد آنے لگتا ہے۔ کلامِ میر سے فراہم ہونے والے ان آثار سے متبادر ہوتا ہے کہ مزاحمت کاری کے لیے مشترک محاذ بنانے کی جو قومی سوچ آگے چل کر پروان چڑھی اس کا آغاز عہدِ میر سے ہوا۔

جب شہر دہلی پے در پے افتاد کی زد میں رہا تو ناچار یہاں کے ادیب نسبتاً پر امن ریاستوں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ اس دور کے نامور شعرا آرزوؔ، فغاںؔ، میرؔ، سوداؔ، قائمؔ، سوزؔ، ضیاءؔ اور حسرتؔ وغیرہ لکھنؤ چلے گئے۔ اس عظیم ادبی ہجرت کے تھوڑا عرصہ بعد انشاؔ، مصحفیؔ اور جرأتؔ بھی یہیں چلے آئے۔ یہاں کا معاشرتی و سیاسی ماحول دہلی سے بہت مختلف تھا لہٰذا مؤخرالذکر شاعروں نے یہاں آکر ایک الگ شعری اسلوب اختیار کیا جسے لکھنوی اسلوب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور کی لمبی لمبی غزلوں میں مشکل قافیے، متبذل مضامین، سطحی خیالات اور سنگلاخ زمینوں کی بہتات نظر آتی ہے۔(۷۱) یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر وقار احمد رضوی اس دور کو غزل کا دورِ زوال قرار دیتے ہیں۔(۷۲)

یوں تو اس عہد میں فرنگی استبداد پوری طرح واضح ہو چکا تھا مگر اودھ کے حکمرانوں نے سیاسی مصلحت کے طور پر عیش و عشرت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ مغربی تہذیب کی پیروی میں فنِ تعمیر، رقص، لباس کی تراش خراش حتّٰی کہ انگریز عورتوں سے شادی بیاہ تک کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ان تکلّفات کا بالواسطہ مقصد اپنے اقتدار کو فرنگی دست برد سے بچائے رکھنا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی شاعری زیادہ تر درباری سرپرستی میں ہی پروان چڑھی تھی مگر زمانہ ماقبل کے شعرا نقد و نظر کے اپنے بنیادی استحقاق پر کبھی سمجھوتہ نہ کرتے تھے۔ انھوں نے شاہانِ وقت کی کج روی پر بھی ہمیشہ کھل کر تنقید کی تھی لیکن چند مستثنیات سے قطع نظر لکھنوی دور کے شعرا میں اپنے حکمرانوں کی زمانہ ساز پالیسی کے زیر اثر سیاسی و سماجی بصیرت کا اظہار ایک نمائندہ خاصیت کے طور پر سامنے نہیں

آسکا البتہ نو آبادیاتی طرز معاشرت کی تجزی و توضیح کے حوالے سے ان لوگوں کے مطابقت پذیر یا مصلحت کوش رویّے بھی یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ طبقہ استعماری قوتوں اور مقامی باشندوں کے باہمی ثقافتی رشتوں کا ایک نیا رخ دکھاتا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان شعرا نے کلیتاً مقتدر کلامیے کو گلے لگا کر اس کی ترویج شروع کر دی اور قوموں کی اجتماعی زندگی میں ایسا ممکن بھی نہیں ہوتا۔ بیگانوں کی نسبت اپنوں سے بغاوت کرنا مشکل تر ہوتا ہے۔ اور ایسی بغاوت کو عمل کی نسبت بیانیے میں لانا مزید کڑی منزل ہے۔ بنا بریں ایسے بیانیے اگر کچھ تھے بھی تو زیادہ تعداد میں نہیں ملتے۔ اردو تنقید میں یہ خیال کافی حد تک مسلم ہو چکا ہے کہ دہلوی شاعری میں مضمون اہم ہے تو لکھنوی میں زبان، وہاں داخلیت ہے تو یہاں خارجیت، اہل دلی اگر عاشق کی محسوسات کو اپنا نقطۂ ماسکہ بناتے ہیں تو لکھنوی حضرات معشوق کے ناز و انداز اور دیگر متعلقات پر جان دیتے ہیں۔ اگرچہ نقد و نظر کے اعتبار سے ایسی حد بندیاں مستحسن نہیں مگر تدریسی ضرورت کے تحت انھیں روا رکھا جائے تو چند مستثنیات سے قطع نظر نو آبادیاتی حوالے سے دبستان دہلی کو مزاحمتی اور مؤخر الذکر کو نسبتاً مفاہمتی رویّے کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس دبستان کا نمائندہ شاعر جرأت ہے۔ جب دارا شکوہ اودھ آئے اور انگریز کے اشارے پر آصف الدولہ نے انھیں وظیفہ دینا شروع کر دیا تو اسی دور میں جرأت ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں ان کی سفارش پر مصحفی اور انشا کو بھی یہاں جگہ مل گئی۔ عہد نو کے ناقدین نے میر اور مصحفی کی کچھ قافیہ بند تنقیدی آرا (۷۳) سے متاثر ہو کر جرأت کو محض ''حیوانی اور نفسانی'' جذبات کا شاعر بنا کر پیش کیا ہے (۷۴) حال آں کہ ان کے ہاں سیاسی شعور کا بیان بھی ملتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسے اشعار بھی ان کے چلبلے اسلوب میں کہے گئے ہیں:

نہ گرمی رکھے کوئی اس سے خدایا
شرارت سے جی جس نے میرا جلایا (۷۵)

یہ کس پردہ نشیں سے دل لگایا
کہ اک عالم سے ہم نے منہ چھپایا (۷۶)

جرأت کی چٹکلا بازی اور لکھنوی چکا چوند کو نظر انداز کر کے صرف متن سے معنی نکالے جائیں تو ان اشعار کو تنقیدی جبر کے ذریعے تو محض جنسی واقفیت تک محدود رکھا جا سکتا ہے ورنہ ان میں معاصر سیاسی گھٹن کے اظہاری امکانات کا رد نہیں کیا جا سکتا۔ کلام جرأت کا مجموعی تاثر یہی ہے جو عموماً بیان کیا جاتا ہے تاہم اسی اسلوب میں انھوں نے سیاسی بصیرت کو بھی حتی المقدور جگہ دی ہے۔ مذکورہ بالا پہلے شعر میں بات صرف اتنی ہے کہ اس شوخ حیلہ جو (فرنگی) سے راہ و رسم بڑھا کر ہم اپنے دل و جاں (ہندوستانی ریاستیں اور اقتدار) سے محروم ہو بیٹھے ہیں؛ ایسے تپاک سے تو ناشناسائی بہتر تھی۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ''پردہ نشیں'' سے بالواسطہ حکمرانی کرنے والی کمپنی، ''عالم'' سے شاہ عالم ثانی اور ضمیر متکلم سے لکھنؤ کے وہ کوتاہ نظر حکمران مراد ہیں جو کمپنی کی شہ میں آ کر مرکز سے علاحدہ ہوئے اور مصیبت میں گھر گئے۔ اسی مضمون کو دردؔ نے یوں ادا کیا ہے:

یہ نہ سمجھے اور ہی شاطر نے شہ دی تھی انھیں
زعم میں اپنے سلاطین آپ کو شہہ کر گئے (۷۷)

جرأتؔ کی شاعری سے نوآبادیاتی تناظر کی واضح شہادتیں ملتی ہیں؛ انگریزوں کی آمد سے ہمارے معاشرتی معمولات میں جو مثبت عناصر در آئے ان میں ایک احساسِ زماں بھی ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی اقدار سے ہٹ کر عام سماجی سرگرمیوں میں پابندیِ وقت کا خیال کم ہی رکھا جاتا تھا۔ مغرب کی صنعتی زندگی میں وقت کی پاس داری ایک اہم سماجی قدر ہے۔ کچھ ایسے ہی ملے جلے احساس سے مستنبط یہ شعر دیکھیے:

اب اضطراب دل سے جوں ساعتِ فرنگی
ہر ساعت اپنے گھر میں ہم عازمِ سفر ہیں (۷۸)

بلاشبہ جرأت کا بیشتر کلام چٹکلے بازی اور عیش کوشی کا مجموعہ ہے اور اس کے ''خارجی پہلو سے تعلق'' (۷۹) کے بہ موجب اسے ڈاکٹر جمیل جالبی ''افسانہ'' (۸۰) قرار دیتے ہیں مگر انھیں کے مطابق یہ افسانہ بھی ''غم دوراں اور سنگین کے ساتھ دہلیز پر کھڑے انگریز'' (۸۱) کی تلخ یادیں محو کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ اس عہد میں اگر کسی شاعر نے طبقہ خواص کی ترجمانی کی اور استعمار موافق

تاثر دیا ہے تو وہ انشاء اللہ خاں انشا (۱۷۵۶۔۱۸۱۷ء) ہیں۔ وہ اپنے انگریز دوست حکمرانوں کی ناک کا بال بنے رہے۔ مصحفی سے ان کی سخت ان بن رہی۔ (۸۲) انشا زمانہ سازی میں تاک، چرب زبان اور خوشامد پیشہ شاعر تھے۔ (۸۳) اسی بنا پر انھیں ''بھانڈ'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ (۸۴) انھوں نے شاہِ برطانیہ جارج سوم کے روبہ صحت ہونے پر ایک مشہور قصیدہ لکھا اور انگریزی اردو کے ملے جلے الفاظ میں مغربی تمدن کی خوب تعریفیں کیں۔ اس بنا پر ڈاکٹر جمیل جالبی تو انھیں انگریزی الفاظ استعمال کرنے والا پہلا اردو شاعر بھی گردانتے ہیں۔ (۸۵) واضح رہے کہ اردو میں انگریزی الفاظ کے اولین استعمال کاروں کی تعیین میں کلامِ میر سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔ بعض احباب مصحفی کے کلام سے انگریزی الفاظ ڈھونڈ کر انھیں اس سلسلے میں اوّلیت کی مسند پر بٹھا دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کی کئی دیگر اوّلیات کی طرح یہ شرف بھی میر کو حاصل ہے؛ ان کا یہی شعر دیکھیے:

لڑکے دلّی کے ترے ہاتھ میں کب آئے میرؔ
پیچھے ایک ایک کے سو سو پھرے ہیں ڈاگ لگے (۸۶)

آمدم برسرِ مطلب انشاؔ ایک مشّاق غزل گو تھے۔ ان کے کلام میں چوں کہ مفاہمتی نوعیت کے واضح نوآبادیاتی اشارے موجود ہیں لہٰذا چند مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

مروڑی فوج انگریزی نے دی ایک ایسے ہی بل کی
کہ رسی کٹ گئی ہُلکر کی ٹوٹا جاٹ کا جوڑا (۸۷)

اٹھتی نہیں جو دل سے صدا آہ کیا ہوا
اس ساعتِ فرنگ کی کیا کل بگڑ گئی (۸۸)

چار نا چار ہوا جانا ہی لندن اپنا
لے گئی چھین کے دل ایک فرنگن اپنا (۸۹)

یہ نہیں برق اک فرنگی ہے

رعد و باراں قشون جنگی ہے [90]

کرچ لے کر آہ کی کہتا ہے یوں دل چرخ سے

"تم سے ول بوگر بڑا صاحب لڑائی مانگتا" [91]

بتِ کافر، مسیحا دم، فرنگی ملت اے ترسا

نصاریٰ کر تو مجھ مومن کو یا مجھ پاس بے ترس آ [92]

انگریز کے اقبال کی ہے ایسی ہی رسّی

آویختہ ہے جس میں فرانسیس کی ٹوپی [93]

بلاشبہ ان اشعار سے فرنگی اقتدار کی تسلیمات اور پزیرائی کا واضح تاثر مل رہا ہے۔ ان کے کلام میں عاشق و معشوق کے باہمی معاملات ایک سازشی سرگرمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے میں انشا کا عوام کے سامنے ہدفِ تنقید بننا فطری سا امر لگتا ہے۔ خود پر کی جانے والی شدید نکتہ چینی کے ردِعمل میں انھوں نے جو مدافعتی اسلوب اپنایا ہے اس سے بھی موصوف کی فکری ساز باز کے اشارے ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ امثلہ کلیاتِ انشا کی جلد اوّل سے ماخوذ ہیں، بقیہ کلام میں بھی ایسا ہی بیانیہ ملتا ہے۔

انشا کے برعکس مصحفی (۱۷۴۷۔۱۸۲۴ء) اس دور کے نمائندہ عوامی شاعر اور مزاحمتی کلامیے کے نمایاں ترین ترجمان تھے۔ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ کی کمی تھی جس سے مختلف علاقوں میں سیاسی تبدیلیوں کا علم مبہم اور غیر واضح رہتا تھا۔ خصوصاً انگریز کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے پیدا ہونے والے مزاحمتی معاملات بہت کم لوگوں کی نظر میں آتے تھے۔ اس کے باوجود مصحفی نے استعماری خطرے کو پوری ادیبانہ ذمہ داری سے محسوس کیا ہے۔ ایسے میں فراق گورکھ پوری نے انھیں اگر "حواس خمسہ کا شاعر" کہا ہے۔ [94] تو پورا انصاف نہیں کیا بل کہ "چھٹی حس"

کی گردن ماری ہے۔ ان کی غزل میں برطانوی سامراج پر کھل کر تنقید کی گئی ہے:

ہے مصحفی کہیں کا کہیں فرد کی طرح

جب سے ہوا ہے دفترِ ہندوستاں غلط (۹۵)

تیغ ابرو کا تری کاٹ غضب ہے ظالم

جس کے منہ پر نہ ہلاکو ہی نہ چنگیز آیا (۹۶)

ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی

کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر چھین لی (۹۷)

ان اشعار کی سیاسی تہہ داری اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ مصحفی حریت پسند نفسیات کے بے لاگ ترجمان ہیں۔ ان سے قبل اردو شاعری میں انگریزی الفاظ اور ان کے مترادفات کا استعمال شروع ہو چکا تھا مگر انھوں نے اس روایت کو اور آگے بڑھایا اور ایسے الفاظ قوافی یا ردیف کے طور پر بھی استعمال کیے جانے لگے:

مصحفی دور ہے فرنگیوں کا

کام ایسا نہ کر کہ کھاوے کیٹ (۹۸)

مصحفی کے آٹھ شعری دیوان ہیں۔ ان میں سے ساتویں دیوان پر فرنگی کلچر کی پرچھائیں سب سے زیادہ ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی آمادۂ فنا روش، استعمار نواز پالیسیوں، باہمی انتشار اور مرکز سے بغاوت کے بے باکانہ مظاہروں پر بھی شدید تنقید کی ہے:

زخمِ شمشیر نگہ حیف کہ اچھا نہ ہوا

کرنے کو اس کی دوا ڈاکٹر انگریز آیا (۹۹)

یا رب شفا دے اس کو کہ عضووں کو چین ہو

خیلے خلل میں ہے سرِ ہندوستاں کا مغز (۱۰۰)

یارانِ سخن گو کہ ہے وہ کمپنی اپنی
نت جس کی سلامی ہے فرانسیس کی ٹوپی (۱۰۱)

اپنے سنجیدہ سیاسی شعور، تجزیاتی فکر اور مزاحمتی کلامیے کی بھر پور ترجمانی کے باوصف لکھنوی روایت شعری کی بھی مکمل پاس داری کرنے پر اگر مصحفی کو مذکورہ دو دبستانوں کے اتحاد کا سفیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شعرا میں آتش (۱۷۷۸ء-۱۸۴۶ء) اور ناسخ (۱۷۷۲ء-۱۸۳۸ء) کے نام زیادہ اہم ہیں۔ یہ شعرا بھی فرنگی استعمار کے اس طوفان سے بہ خوبی آگاہ تھے جو ہندوستان کے سیاسی افق پر نمودار ہو رہا تھا۔ مثال کے لیے صرف آتش کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہشیاری رنج دیتی ہے قید فرنگ کا
دیوانگی نشانہ بناتی ہے سنگ کا
رخسار صاف چاہیے نظارے کے لیے
آئینہ ہو، حلب کا ہو یا ہو فرنگ کا
مہماں بہار باغ ہے دو چار روز کی
چندے ہے دور دورہ شراب فرنگ کا
تیار رہتی ہیں صفِ مژگاں کی پلٹنیں
رخسار یار ہے کہ جزیرہ فرنگ کا (۱۰۲)

جن اشعار کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے وہ بھلے اپنے خالق کی بہترین تخلیق نہ ہوں تاہم ان میں یہ مشترکہ خصوصیت بہ ہر حال موجود ہے کہ ان کا موضوع برطانوی استعمار ہے اور یوں نو آبادیاتی دور کی تہذیبی و ثقافتی حسیات کو جاننے میں ان کی اہمیت دو چنداں ہے۔

متذکرہ شعرا میں انشا کی استثنائی مثال کو چھوڑ کر سب کے ہاں استعماری کلامیے کے خلاف بھر پور مزاحمتی رویّہ پایا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ تقریباً سبھی معروف شعرا کسی نہ کسی حکمران یا

رئیس کے دربار سے منسلک رہے ہیں۔ مقتدر طبقہ مغربی قوت سے مرعوب یا متاثر ہونے کی بنا پر
ایسی نکتہ چینیوں کی ہرگز سرپرستی نہ کرسکتا تھا مگر اس کے باوجود غزل کے ایمائی انداز کی وساطت
سے شعرا نے اپنے اپنے رجحان طبعی کے مطابق درجہ بہ درجہ مقامی کلامیے کی پاس داری کی ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

''لارڈ میکالے کے زیرِ اثر حالی اور حالی کے زیرِ اثر جدید اردو تنقید نے اس جھوٹ کی شد و مد سے اشاعت کی کہ طبقۂ امرا کی طرف سے اہلِ فن کی سرپرستی اور قدر دانی فن کاروں کی آزادیٔ رائے کے حق میں زہرِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔''(۱۰۳)

چند مغل حکمرانوں اور اکابرین سیاست کی غزل

برصغیر کے مغل حکمران انتظامِ سلطنت کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ میں بھی گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف مختلف فن کاروں کی سرپرستی کرتے تھے بل کہ خود بھی کئی فنون کے ماہر تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بعد جوں جوں مغل حکومت کمزور ہوتی گئی توں توں حکمرانوں کا شعری ذوق ترقی کرتا گیا۔ اس دور کے اکثر حکمران اور مرکز سے آزاد ہونے والی ریاستوں کے راجے مہاراجے شعروشاعری سے شغل فرماتے تھے۔ انھیں اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ اقتدار بند مٹھی کی ریت کے جیسے ان کے ہاتھ نکلا جا رہا ہے۔ اس زوال کی اصل وجہ بھی متحدہ ہندوستان کا مختلف اکائیوں میں بٹنا تھا۔ یہ ریاستی انتشار اس فرنگی حیلہ جوئی کا نتیجہ تھا جس نے بہ ظاہر ابھی تک تجارتی سرگرمیوں کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ (۱۰۴) رفتہ رفتہ جب انگریز قوم واقعی سیاسی قوت کے طور پر ابھرنے لگی تو مقامی حکمران مختلف معاہدوں کے تحت ان کے زیر سایہ آنے لگے۔ اس بدیسی قوت کے آنے پر باہمی جنگیں نسبتاً کم ہو گئیں لہٰذا مقتدر طبقات میں عیش وعشرت فروغ پانے لگا۔ فرنگی طالع آزماؤں کے لیے یہ صورت حال بہت موزوں تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے درست تجزیہ کیا ہے کہ:

> ''سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ اس کا طبقہ خاص ناکارہ، بدچلن، عیش پرست، بے ایمان، خودغرض وخود پرست ہو گیا تھا۔'' (۱۰۵)

چوں کہ اس دور کے حکمران برطانوی استعمار سے خائف یا براہِ راست ان کے وظیفہ خوار بن چکے تھے لہٰذا نوآبادیاتی کلامیے سے اختلاف کا خیال پالنا بھی ان کے لیے آسان کام نہ تھا۔ مختلف تواریخ اور دیگر معاصر آثار سے ان کے مفاہمانہ رویّے کی بہ خوبی شہادت ملتی ہے۔ اس ضمن میں ان کا تخلیق کردہ شعروادب ایک معتبر تر داخلی شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں ہم ان حکمرانوں کا صحیح طرز فکر جاننے کے لیے چند ایک کے شعری آثار کا جائزہ لیتے ہیں تا کہ نوآبادیاتی

سکے۔

متعلق استخراجِ نتائج ممکن ہو

صورت حال میں ان کے ردّعمل سے

اس سلسلے کا سب سے مقبول نام بہادر شاہ ظفرؔ کا ہے جن کا عہد حکومت (۱۸۳۷ء-۵۷ء) مغلیہ اقتدار کا آخری باب ثابت ہوا۔ موصوف بہادر تھے نہ شاہ اور نہ ہی ظفریاب۔ جنگ آزادی ان کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ انھوں نے اس معرکے میں کس حد تک حصہ لیا، یہ ایک متنازعہ امر ہے۔ تاہم یہ بات ضرور مسلّمہ ہے کہ ظفرؔ اور اس کے خاندان کے بہت سے افراد مزاحمتی تحریک کے مشکوک اور متذبذب گروہ کا حصہ بنے۔ مجموعی طور پر یہ شاہی گھرانہ عزت و احترام سے زیادہ ہم دردی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ظفرؔ کو انگریزی سرپرستی وراثت میں ملتی تھی۔ فرنگی ریذیڈنٹ حقیقی اختیارات کا مالک تھا۔ لوگوں میں یہ مقولہ کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا'' عام مروج تھا۔ ظفرؔ کو اپنی کم حیثیتی کا اچھی طرح علم تھا:

مرغ دل یوں تیرے مژگاں نے ہے لے کر گانٹھا
جیسے چنگل میں ہو شاہیں نے کبوتر گانٹھا (۱۰۶)

اب کہاں ہے طاقتِ پرواز تا بام قفس
کر دیا صیّاد نے بے بال و پر میرے تئیں (۱۰۷)

تجھے خطِ غلامی لکھ دیا یار اپنے ہاتھوں سے
ہوئے ہم اور بھی تیرے گرفتار اپنے ہاتھوں سے (۱۰۸)

نہ تنگ کیوں، ہمیں صیّاد نہ قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے (۱۰۹)

ظفرؔ کے دور حکمرانی میں اختیارات مکمل طور پر کمپنی کے پاس آچکے تھے۔ کمپنی کی طرف سے ہر شاہی دربار میں ایک ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا تھا جو ان نام نہاد حاکمین کی کڑی نگرانی کیا کرتا۔ ریذیڈنٹ کی مرضی کے بغیر انھیں کوئی بڑا قدم اٹھانے کی مجال نہ ہوتی تھی۔ دہلی دربار میں متعین ریذیڈنٹ کے متکبرانہ رویّے اور ناروا چونچلے ظفرؔ کی غزل کا اہم موضوع رہے ہیں:

خاک ساروں میں تم اپنے خاص کہتے ہو ہمیں
اور ملتے ہیں سوا ہم خاک میں ہیں خاک خاص (۱۱۰)

ہوا ماہ کیا کیا خجل جب وہ مہ وش
لب بام آکر مقابل میں بیٹھا (۱۱۱)

محال ہے کہ موافق ہو صحبتِ ناجنس
لگا نہیں کبھی باز و کلنگ کا جوڑا (۱۱۲)

بنا کے خالِ سیاہ خط سبز پر اپنے
بٹھا یہ آپ نے طوطی کے پاس زاغ دیا (۱۱۳)

جنگ آزادی میں ناکامی کا ایک سبب فرنگی حیلہ گروں کا منظّم جاسوسی نظام بھی تھا۔ انھیں یہاں کے طبقۂ خاص سے کئی ایک جاسوس اور غدّار افراد کا تعاون حاصل ہو گیا تھا۔ شاہِ ہند کے بہت سے درباری حتّٰی کہ ان کی اہلیہ ممتاز محل تک انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ ظفؔر کی شاعری میں اس صورت حال کی عکاسی بھی ملتی ہے:

سرخرو ہوں اے ظفؔر کیوں کر عزیزوں سے عزیز
بے مروت ہے زمانہ ہو گئے لوہو سفید (۱۱۴)

غماز ہیں تم جن کو ہم راز سمجھتے ہو
جو کہتے ہو وہ ہم سے سب آن کے کہتے ہیں (۱۱۵)

بیگانگی کا دل کے گلہ کیا کہ عشق میں
جب جان بھی نہ اپنی رہی غیر ہو گئی (۱۱۶)

کہیں کہیں انھوں نے فرنگی استبداد کا پردہ چاک کرتے ہوئے بڑے واضح مزاحمتی

اشارے بھی دیے ہیں۔ اس امر سے یہ مترشح ہے کہ انھوں نے استعماری قوتوں کا بلاواسطہ ہدف ہونے کے باوجود مزاحمتی کلامیے کی ادبی تشکیل میں اپنا پورا حصہ ڈالا ہے؛ اس نوع کے کچھ اشعار دیکھیں:

بہم ہے کیوں کہ وہ رخسار و زلف حیراں ہوں
کہ متفق نہ کبھی زنگی و فرنگی ہوں (۱۱۷)

حلقہ ہائے موئے پیچاں سے بنا کر پھانسیاں
اس فرنگی زادہ نے کتنے ہی عاشق گل دیے (۱۱۸)

غضب ہے توپ پر عاشق کا رکھ کر
فرنگی زاد تیرا فیر کرنا (۱۱۹)

دل میں کیا، میرے جگر میں کیا، میرے سینے میں کیا
ہر جگہ ڈالا ہوا ہے ایک ناسور آپ کا (۱۲۰)

ظفر کی نظروں میں سراج الدولہ، ٹیپو سلطان اور تحریک مجاہدین کی شان دار سرگرمیاں بھی تھیں۔ ان کے اشعار میں ان سب واقعات کے اشارات ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایسے سرفروشوں کو پیش آنے والے المناک حادثات کے باعث پژمردگی اور بے چارگی کی فضا ہمہ وقت بنی رہتی ہے، تاہم بعض اوقات آزادی کے لیے اٹھنے والی آواز کے تصور سے ان کے یہاں زندہ دلی اور رجائیت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں اس قبیل کے اشعار ملتے ہیں:

نے خرد، نے ہوش نے تدبیر پر شاکر ہیں ہم
دوستو! اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم (۱۲۱)

ایک دن وہ تھا کہ تھے وہ لوگ ہم سے کانپتے
ایک دن یہ ہے کہ ہیں ہم لوگ ان سے کانپتے (۱۲۲)

تو دوسری طرف فرنگی غاصبوں کے مقابل مزاحمت کاروں اور تحریک حریت کے نمائندوں کی بھرپور ترجمانی کے لیے بھی بے باکی دکھائی دیتی ہے:

کمر بستہ ہو دل کیوں کر نہ میدانِ محبت میں
کمر کا کھولنا زیبا نہیں مرد سپاہی کو (۱۲۳)

بہار آئی اسیران قفس آپس میں کہتے ہیں
پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ (۱۲۴)

ہاتھ سے تیرے ہو اگر ایک اے قاتل شہید
دوسرا موجود خواہانِ شہادت اور ہے (۱۲۵)

ظفؔر کے کلام میں اخلاقیات اور تصوف کی جھلک بھی خوب ملتی ہے مگر یہ اخلاقی نظام ایک غلام ذہنیت کا عکاس ہے۔ تقدیر پرستی اور فقر و مسکنت کے ایسے منفعل تصورات ہی دراصل غاصب قوت کو تسلیم کرنے کا اوّلین اشارہ ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر بات کریں تو ظفر کا کلام نو آبادیاتی دور کا معلوماتی خزینہ ہے۔ عمر فیضی اگر انہیں غالب اور مومن کے بعد اس عہد کا تیسرا بڑا شاعر مانتے ہیں (۱۲۶) تو شاید اس میں کچھ مبالغہ ہو مگر رام بابو سکسینہ کا اپنی ادبی تاریخ میں اسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھنا بھی کسی طور قرین انصاف نہیں۔

مغلیہ خاندان ہی کے ایک جواں سال شاعر جہاں دار خاں (۱۸۸۸۔۱۷۷۴ء) شاہ عالم ثانی کے بیٹے تھے۔ ان کا نام رزم و بزم ہر دو حوالوں سے جانا جاتا ہے۔ علم و فضل میں ید طولا رکھتے تھے۔ ان کے ادبی آثار میں ایک شعری دیوان بھی ملتا ہے۔ موصوف کی شاعری پر بھی نو آبادیاتی دور کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جنگ بکسر (۱۷۶۴ء) میں جب شاہ عالم معاہدہ کے تحت کمپنی کے ایک وظیفہ خوار ''بادشاہ'' کی حیثیت اختیار کر گئے تو اس کے اثرات جہاں دار کی شخصیت پر بھی پڑے۔ بعد کے تلخ سے تلخ تر حالات نے یہ الم ناک کیفیت اور بڑھا دی؛ اس تبصرے کی صحت ذیل کے اشعار سے مترشح ہے:

آہِ مژگاں کی کدالوں سے وہ کافر شوخ چشم

کعبۂ دل کی مرے یارو بنا ڈھانے لگا(۱۲۷)

دل جس سے دوستی ہم اک عمر سے تھے رکھتے

آخر کھلا اسی کا احوال دشمنی کا(۱۲۸)

آخر گلِ اپنی صرفِ در مے کدہ ہوئی

پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو(۱۲۹)

اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کا کلام بھی معاصر تذکروں میں عام ملتا ہے۔ موصوف سلیمانؔ تخلص کرتے تھے۔ جیسا کہ مغل شہزادوں کا معمول ہے کہ وہ تخت و تاج کے لیے باہم برسرِ پیکار رہتے ہیں، ان کے ہاں ایسی چپقلش کے آثار بھی ملتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ غاصب استعماری قوتوں کے خلاف احتجاج اور ان کی پیدا کردہ صورتِ حال پر آہ وزاری کا رنگ بھی نمایاں ہے:

تاج و تخت اپنے سلیمان کو اے شاہِ نجف

آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں(۱۳۰)

جنازہ تیرے دیوانے کا اس توقیر سے اٹھا

کہ شور نالہ ہر اک خانۂ زنجیر سے اٹھا(۱۳۱)

ابھی تک جن شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا مرکز دہلی تھا۔ اس دور میں فرنگی کمپنی نے اپنی سیاسی چال چلتے ہوئے مختلف ریاستی سربراہوں کو بغاوت پر اکسایا اور وہ مرکز سے علاحدہ ہو کر خودمختار حکمران بن بیٹھے۔ یہ حکومتیں سراسر کمپنی کے رحم و کرم پر تھیں۔ ان نوخیز ریاستوں نے عیش و عشرت کا وہ بازار گرم کیا جس کی نظیر ہندوستانی تاریخ میں اس سے قبل کم ہی ملے گی۔ اس عیش مشرب رجحان کی قوتِ محرکہ کا سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ ایسی ہی ایک ریاست حیدرآباد دکن تھی جہاں کی آصفیہ حکومت مکمل طور پر فرنگی حکمرانوں کا بغل بچہ تھی۔ ۱۸۰۳ء میں اس ریاست کا کمپنی سے

معاہدہ ہوا اور اس کے بعد یہاں کی مقامی مقتدر قوتوں میں غاصب قوم کے خلاف کوئی اہم مزاحمتی ردّعمل سامنے نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے خونی معرکے میں بھی یہ حکمران انگریزوں کی پشت پناہی میں لگے رہے تاہم یہاں کی عوام کا ردّعمل یقیناً دوسرا تھا۔[۱۳۲] آصف الدولہ (م: ۱۷۹۷ء) اسی ریاست کے ایک حکمران تھے۔ موصوف میر سوز سے اصلاح کلام لیتے تھے۔[۱۳۳] ان کے کلام میں روایتی مضامین کی کثرت ہے تاہم ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کی فضا واضح طور پر نوآبادیاتی اثرات سے مملو ہے۔ یہ بات البتہ صاف ہے کہ ان کے ہاں ظفر کا سا دوٹوک رویّہ نام کو بھی نہیں؛ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ایک دن یار سے یہ میں نے کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے
ہنس کے کہنے لگا کہ اے آصف
یہی کہہ کہہ کے لاکھوں جاں سے گئے[۱۳۴]

تذکرہ معرکہ خوش زیبا میں مذکور ان کے یہ اشعار بھی موصوف کے عمومی بیانیے کی غمازی کرتے ہیں:

تجھے غیر سے ہم بہم دیکھتے ہیں
نہ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں
تو جلدی سے آ ورنہ میرے مسیحا
کوئی دم میں راہِ عدم دیکھتے ہیں[۱۳۵]

اگر ہم چند لمحوں کے لیے کلاسیکل تنقیدی روایت کے آسیب سے باہر نکل کر تخلیق متن کے عصری محرکات پر توجہ دیں تو یہی اشعار جن کی حیثیت محض ایک کلیشے سے زیادہ نہیں، اپنے دور کی کھوکھلی اور زوال آمادہ فکر کی منظوم تاریخ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہندوستان کے دیگر بہت سے حکمران نواب اور امیر ایسے ہیں جن کا تذکرہ یہاں نہ کرنا قرین انصاف نہیں۔ ان میں شاہ عالم ثانی، واجد علی شاہ، سعادت علی خاں رنگیںؔ اور امیر خاں انجامؔ وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم ہمارا مقصد

صرف مقامی حکمران طبقے کا طرزِ فکر جانتا تھا جو محولہ بالا شعرا کے کلام سے کافی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہے کہ تمام حکمران طبقہ فرنگی قوت کا ہم خیال نہیں تھا۔ بعض کے ہاں کھل کر استحصالی جبر کے خلاف مزاحمتی کلامیے کی گونج سنائی دیتی ہے جن میں بہادر شاہ ظفر کا نام سب سے نمایاں ہے۔ البتہ برطانوی حکومت کی آلہ کار ریاستوں کے طبقہ خواص میں مزاحمتی کلامیے کے آثار نسبتاً کافی کم ہیں۔ بعض کے ہاں تو انشا کی طرح کھل کر مقتدر کلامیے کی ہم نوائی بھی کی گئی ہے۔ مثال کے لیے امیر خاں انجام کا ایک شعر:

اب یہی احسان ہے تیرا نہ ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے اے صیّاد ہم (۱۳۶)

غالب کی غزل اور نو آبادیاتی منظر نامہ

مرزا غالب کا کلام نو آبادیاتی صورت احوال کی اہم ترین دستاویز ہے۔ جس طرح ایک ماہر مصور اپنا شاہ کار تراشنے کے لیے بیک شیڈ کا استعمال بہت محتاط انداز میں کرتا ہے اسی طرح مرزا کی غزل کا نو آبادیاتی سیاق وسباق ان کے فنکارانہ حسن انتخاب کی دلیل ہے۔

ہندوستان میں برطانوی قوم کے سیاسی قوت بننے سے لے کر تخت وتاج ہتھیانے تک سبھی معاملات مرزا کے سامنے تھے۔ ان کا خاندان اس وقت کی تینوں بڑی طاقتوں (مغل، مرہٹے اور انگریز) سے قریبی رابطے میں تھا۔[۱۳۷] ان میں سے مرہٹہ قوت ۱۸۰۳ء میں سیاسی بساط سے عملاً باہر نکل گئی تھی۔ اگرچہ اس وقت مرزا نو عمر تھے تاہم اپنے ننھیال اور ددھیال کے زیر تربیت انھیں ایسے تمام امور کا بہ خوبی ادراک تھا۔ جب وہ سن تمیز کو پہنچے تو کمپنی اپنا تسلط جما چکی تھی۔ مغل فرماں روا کی حیثیت ''شاہِ شطرنج'' سے زیادہ نہ تھی۔ غالب نے اس پر آشوب دور کا بہ غور جائزہ لیا اور اس کے جملہ کوائف پورے فنی خلوص کے ساتھ اپنی غزل میں بیان کر دیے۔ اس دور میں مشرق ومغرب کی دو مختلف تہذیبیں آپس میں گلے مل رہی تھیں جس سے معاصر ادب میں ایک کش مکش، بے یقینی اور عدم ایقان کی سی کیفیت کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ غالب کے ہاں بھی اس تذبذب کے اشارے واضح ہیں:

ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے[۱۳۸]

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں[۱۳۹]

غالب کے کلام کو نو آبادیاتی تناظر میں دیکھتے ہوئے ہماری تنقید میں یہ تاثر بہت عام

ہے کہ ان کے ہاں کوئی واضح سیاسی تصور موجود نہیں۔ اس موقف کی بنیاد ان کے شعری متون سے زیادہ ایسی تنقیدی آرا پر ہے جو موصوف کے ذاتی طرزِ عمل سے اخذ کی گئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مصلحت کوشی یا دنیاداری کا شاید ہی کوئی داؤ ایسا ہوگا جسے انھوں نے حصول مقصد کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔"(۱۴۰)

اسی طرح مالک رام نے مختلف مصنّفین کی آرا کا تجزیاتی محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب دلی پر بدیسی سپاہ کے قبضے سے ہی گومگو کی حالت میں رہنے لگے تھے۔ اس دور میں انھیں شدید ذہنی کش مکش کا سامنا رہا۔ اسی بنا پر ان کا قلعہ معلّا سے کھوکھلا تعلق، جنگ آزادی میں انگریز موافق طرزِ عمل اور مغلیہ خاندان کی تاریخ نویسی کو پس پشت ڈال کر دستنبو لکھنے بیٹھ جانا، مطلب پرستی کے مختلف روپ ہیں۔(۱۴۱) مرزا کے سیاسی انسلاکات جاننے کے لیے سید احتشام حسین نے ۱۸۵۷ء کے معرکے کو ایک کسوٹی کے طور پر پیش کیا ہے اور حاصل بحث یہ نکالا ہے کہ "غدر کے متعلق غالب کوئی گہری سیاسی رائے نہیں رکھتے تھے۔"(۱۴۲)

اپنے مخصوص زاویہ نظر میں یہ محاکمات بجا ہیں مگر نشانِ خاطر رہے کہ مرزا اپنے ذاتی امور میں جو طرزِ عمل بھی اختیار کریں، تخلیق شعر میں انھوں نے پوری ادبی دیانت داری اور فن کارانہ علاحدگی کا مظاہرہ کیا ہے لہٰذا ان کی غزل میں ایسی "اشاریتی زرخیزی" پیدا ہوگئی ہے جو موصوف کے سیاسی خیالات کی غمّاز ہے۔ ان کا کلام ایک ایسے آئینے کی طرح ہے جس میں معاصر تاریخ کی ہر کروٹ دیکھی جا سکتی ہے۔ مرزا کی غزل کے بدیہی تصورات کے بین السطور توجہ دیں تو ان کی ترجیحات نشان زد کرنا چنداں مشکل نہیں رہتا۔ اسی ضمن میں عطا محمد شعلہ لکھتے ہیں:

"اس سماجی معنویت کے لیے جس پر آج جدید غزل نازاں ہے، غالب ہی نے پہلی بار میدان ہموار کیا۔"(۱۴۳)

یہ بات درست ہے کہ غالب کے ہاں ایسا کوئی واضح پیغام نہیں جس کی مثال ہمیں حالی یا اقبال کے کلام میں ملتی ہے۔(۱۴۴) تاہم یہاں وقت کے عامل کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا۔ اس دور

ہیں مرض کی تشخیص، گم رہی کا احساس اور نئی صورت حال کی تفہیمی کاوش ہی مقتضائے وقت تھی، جو غالب نے خوب اچھی طرح نبھائی ہے۔ ایک لحاظ سے اس دور میں یہ جسارت کرنا بھی بغاوت کے مترادف تھا۔[(۱۴۵)] اسی عظیم کام کی انجام دہی پر خلیل الرحمٰن اعظمی انھیں ''گھا گھ شاعر'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔[(۱۴۶)] غالبؔ کے ہاں اگر منتشر خیالی کی کچھ صورت بنتی ہے تو یہ حالات کی دین تھی مگر اس متذبذب ماحول میں بھی ان کے روشن خیال اور ترقی پسندانہ افکار کا تعین کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ مرزا کی شعری تخلیقات کے زمانے میں سب سے اہم واقعہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا تھا۔ اسی معرکے سے متعلق شعری نشانات ڈھونڈتے ہوئے بعض ناقدین مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اور عموماً اس واقعے کو مرزا کی شاعری کا نقطۂ اختتام سمجھا جاتا ہے۔[(۱۴۷)] ایسا دراصل اس لیے ہے کہ ہم جنگ آزادی کو ایک خاص وقت سے منسلک کر دیتے ہیں حال آں کہ جنگ اگر ایک شدید معاشرتی یا طبقاتی حالت کا نام ہے تو اس کا آغاز بہت پہلے سے ہو چکا تھا۔ معرکہ ۵۷ء کی زمانی تعین کے ضمن میں فراق گورکھ پوری نے بڑی اہم بات کی ہے کہ ''آخر اس واقعہ کو ہم ایک خاص تاریخ سے شروع کیوں سمجھیں۔''[(۱۴۸)] اس وسیع تناظر میں بات کریں تو مرزا کے ہاں یہ موضوع کچھ زیادہ تشنۂ اظہار نہیں رہتا۔ جب غالب کے ذہن پر یہ احساس اترا تو اس کا اظہار شاعری میں بھی ہوا؛ اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گلشن کا بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج[(۱۴۹)]

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مہر دہاں ہو جائے گا[(۱۵۰)]

ہے موج زن اک قلزم خوں کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے، کیا کیا میرے آگے[(۱۵۱)]

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل، آگے گرد تھا(۱۵۲)

یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ یہ اشعار تو ۵۷ء کے معرکہ سے بہت پہلے کے ہیں!! حقیقت حال بھی یہی ہے مگر یہ امر بھی ناقابل تردید ہے کہ غالب کو اس سیاسی کروٹ کا ایقان آغاز جوانی ہی سے ہو چلا تھا جس کا ثبوت ان کے ذاتی طرز عمل کے ساتھ ساتھ ادبی آثار مثلاً نجی خطوط اور روزنامچوں وغیرہ سے بہ خوبی مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر متذکرہ بالا آخری دو شعروں کو غالب کے ایک خط کی اس لائن سے ملا کر پڑھیں جو ۱۸۵۷ء کے تناظر میں لکھی گئی؛ آپ کو ان دونوں متون میں بُعد زمانی کا احساس نہیں ہوگا: ''میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں۔''(۱۵۳) اسی طرح غالب کی مشہور غزل، جس کے دو کلیدی شعر یہ ہیں:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر ، سو خموش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے(۱۵۴)

اس خونی سانحے کے جزیات تک بیان کر رہی ہے۔ ناقدین غالب نے یہ غزل (محررہ: ۱۸۲۶ء) اسی تناظر میں دیکھی، اور شمع خاموش سے مراد آخری مغل فرماں روا ہے۔ اگر ہم پوری معروضیت کے ساتھ جنگ آزادی کے واقعے پر بہ لحاظ تاریخ غالب کے ادبی آثار تلاش کریں تو غزل کے حوالے سے ہمیں خاصی مایوسی ہوتی ہے۔ کالی داس گپتا رضا کے متذکرہ دیوان میں ۵۷ء سے لے کر غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) تک کل چار غزلوں کا سراغ ملتا ہے جن کا اسلوب بھی ماقبل کے کلام سے ہم پلہ نہیں۔ اس عظیم سانحے پر غالب کی یہ پراسرار خاموشی بہت سی نزاعی باتوں کا باعث بنی۔ انیس ناگی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ۵۷ء کے بعد انھوں نے ''ایک پینترا بدلا'' اور خود کو انگریز کا جدی پشتی وفادار ثابت کرنے کے لیے قصیدہ نگاری کی شکل میں کمرشل ادب تخلیق کرنے لگ گئے۔(۱۵۵)

غالب نے جنگ آزادی کی تمام صورت واقعہ اپنے فارسی روز نامچے ''دستنبو'' میں رقم کی ہے جب کہ اس جنگ کے مابعدی اثرات موصوف کے خطوط میں کافی صراحت سے در آئے ہیں۔ اصل میں غزل کا معاملہ ایسے بیانیوں سے یک سر علاحدہ ہوتا ہے۔ اس صنف کا مقتضا ہی یہ ہے کہ یہاں مربوط فکر کے بجائے محض اشارے کنائے میں اظہار مدعا کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس زاویۂ نظر سے دیکھیں تو مرزا نے نوآبادیاتی صورت حال میں اپنی روشن خیال اور وطن دوست حکمت عملی پورے فکری اور فنی خلوص سے جا بہ جا واضح کردی ہے۔ انھوں نے واقعتاً ہندوستانی عوام کی اس مزاحمتی کاروائی کو ''سعیٔ بے حاصل'' سمجھا جو ان کے لیے سراسر خودکشی کے مترادف تھی۔ اس ضمن میں غالب کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے ان کے بہت سے اشعار ملا کر پڑھے جائیں تو ان کا غیر جذباتی طرز عمل بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے:

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعی بے حاصل میں ہے (۱۵۶)

سر پھوڑنا وہ ، غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے ، تیری دیوار دیکھ کر (۱۵۷)

پوچھتے ہیں وہ کہ ''غالبؔ کون ہے؟''
کوئی بتلا دو کہ ہم بتلائیں کیا؟ (۱۵۸)

غالب اس جنگ کے براہ راست متاثرین میں سے تھے۔ ان کے دوست احباب اس میں شہید ہوئے، دہلی کا نقشہ بدل گیا، خاندانی پنشن بند ہوگئی جس کے لیے انھیں برسوں پاپڑ بیلنا پڑے۔ انگریزوں نے دورانِ جنگ میں عوام سے نہایت سفا کانہ طرز عمل روا رکھا۔ بغاوت فرو ہوئی تو استحصالی حربے اور بھی فعّال کردیے گئے۔ غالب کے لیے یہ مشاہدات کچھ نئے نہ تھے۔ ان کی شاعری میں نو وارد حکمرانوں کے ظلم و تعدّی اور لوٹ کھسوٹ پر برابر تنقیدی اشارے ملتے ہیں:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی (۱۵۹)

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا (۱۶۰)

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے (۱۶۱)

غالبؔ کے لیے ۱۸۵۷ء کی جنگ کا ایک اہم مرحلہ اس وقت ختم ہو گیا تھا جب بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کو شہید ہوئے۔ (۱۶۲) مرزا کا حلقۂ احباب اگرچہ تقلید پسند علما کے زیرِ اثر تھا اور مذکورہ شاہ صاحبان وہابی یا غیر مقلد ہونے کی وجہ سے ان کے ہم مسلک نہ تھے مگر باطنی طور پر وہ ان مجاہدین کے شدت سے معتقد تھے۔ (۱۶۳) پروفیسر خواجہ منظور حسین نے ''تحریکِ جد و جہاد بطور موضوعِ سخن'' (۱۶۴) میں اس تحریک کے ادبی تناظرات واضح کرتے ہوئے کلامِ غالب سے بار بار رجوع کیا ہے۔ تحریکِ مجاہدین کی طرز پر کی جانے والی مزاحمتی کاوشوں سے متعلق چند اور اشعار دیکھیں جن میں متحارب قوتوں کا نقشہ اپنے تمام تر مد و جذر کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ موجود ہوتا ہے:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا؟
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں (۱۶۵)

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے (۱۶۶)

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی (۱۶۷)

یہ آخری شعر جس غزل سے ہے اس میں ''شرابِ طہور''، ''آوازِ صور''، ''آمد بہار''، ''کوہِ طور''، ''کعبہ'' اور ''حج کا ثواب'' جیسے الفاظ وتراکیب ایک روحانی سا حلقۂ خیال تشکیل کرتے ہیں جس سے عظمتِ شہدا کی تاثر آفرینی کے لیے سازگار فضا پیدا ہوتی ہے۔ سادات کرام کی یہ مزاحمتی تحریک جسے عابد علی عابدؔ نے بہ جا طور پر آزادیٔ وطن کی پہلی تحریک کہا ہے۔ (۱۶۸) جب ۶ مئی ۱۸۳۱ء میں ایک عظیم سانحے سے دو چار ہوئی تو اردو ادب کے معماروں نے بھی اس دردناک واقعے کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ غالب کے یہ اشعار اسی نوع کی مزاحمتی سرگرمیوں کی ترجمانی کرتے ہیں:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے (۱۶۹)

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں (۱۷۰)

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں در سے ترے بے صدا کیے (۱۷۱)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ ''اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے'' (۱۷۲)

مرزا غالب کے ہاں اس نوع کی تحریکوں یا مزاحمتی سرگرمیوں سے وابستہ کچھ زیادہ توقعات کا سراغ نہیں ملتا اسی لیے انھوں نے یہاں ''سادگی''، ''سعی بے حاصل'' اور ''مرغِ اسیر'' کا آشیاں بندی کے لیے قفس میں خاروخس اکٹھا کرنے جیسے اشارات استعمال کیے ہیں۔ واضح رہے کہ تحریک مجاہدین ابتداءً سکھوں کی سرکوبی کے لیے سرگرمِ عمل تھی، انگریز حکومت سیاسی مصلحت کے تحت اس کی پشت پناہی کرتی رہی۔ جوں ہی سکھ ریاست کا خاتمہ ہوا اور مجاہدین نے کمپنی کے خلاف براہِ راست کارروائیاں شروع کیں، ''سیاستِ درباں'' نے انھیں سختی سے دبا دیا۔ (۱۷۳)

سید برادران کی شہادت ہو یا اس سے ملتے جلتے دیگر الم ناک واقعات، اس سے وہ جذبہ حریت کچلا نہ جا سکا تھا جو ہندوستانی عوام کی حقیقی آزادی کا ضامن تھا۔ مرزا نہ تو مغل طرزِ حکمرانی کو پسند کرتے تھے اور نہ ہی مغرب کی نو وارد قوت سے انھیں کوئی فلاحی توقع ہو سکتی تھی، ان کی منزل تو ایسا نظام تھا جس میں انسانی وجود کا استحصال نہ ہو؛ اسی عظیم مطمحِ نظر کے زیرِ اثر وہ ہر سانحے پر سنبھلتے اور ہر خوں چکاں حادثے پر مزید جوش و جذبے کا فکری سامان کرتے نظر آتے ہیں:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم (۱۷۴)

نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدید تمنا ہے (۱۷۵)

مذکورہ بالا پہلے شعر کے ضمن میں پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں کہ "برق سے ماتم خانہ روشن کرنے کا یہ جذبہ۔۔ ہمارے قومی شعور کی خشتِ اول ہے۔" (۱۷۶) اسی طرح مذکورہ ناقد کے یہ الفاظ حرف بہ حرف زیرِ نظر موقف کے موید ہیں کہ:

"وہ طرزِ احساس جو بعد میں دو قومی نظریے کی صورت میں پاکستان کی فکری اساس بنا پہلے پہل غالب کے ہاں ہی نظر آتا ہے۔" (۱۷۷)

اس دور میں مغلیہ حکومت صرف برائے نام باقی تھی، ملک کا تمام بندوبست انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ مقامی حکمرانوں کی اس قابلِ ترس اور عبرت ناک حالت نیز اس کی مختلف وجوہات پر غالب نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں:

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز (۱۷۸)

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو غارت ہوتا
دشت گر دشت نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا (۱۷۹)

درماندگی میں، غالب، کچھ بن پڑے تو جانو
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا(۱۸۰)

سایۂ گل داغ و جوشِ نگہتِ گل موج دود
رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں(۱۸۱)

غالبؔ کے اشعار میں سیاسی عکس بندی کا ایک طریق یہ بھی برتا گیا ہے کہ ان کی غزل کے اسمائے ضمیر کسی نہ کسی سیاسی کردار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ روایتی نقد و نظر میں ایسے اشعار کو حسن و عشق کے پس منظر میں رکھ کر ایک طرح سے ان کی صحیح تر معنویت نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن و عشق صنف غزل کا بنیادی لازمہ ہے اور اس کی استعاراتی جہات اس قدر متنوع ہیں کہ حیات انسانی کا ہر پہلو بہ سہولت اس میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار اپنے زمانے کے سیاسی آشوب کی بھرپور ترجمانی بھی کرتے ہیں:

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا(۱۸۲)

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا(۱۸۳)

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا(۱۸۴)

ایسے ہی اشعار کی عشقیہ تعبیر سے ماورا مفہوم کی طرف آل احمد سرور نے یوں اشارہ کیا ہے:

"غالب سے پہلے غزل زیادہ تر حسن و عشق کی زبان میں حسن و عشق کی داستان تھی۔ غالب نے اسے حسن و عشق کی زبان میں ایک نئی شخصیت اور ایک نئے ذہن کا ترجمان بنایا۔"(۱۸۵)

مرزا غالب نے بیدلؔ کے ساتھ ساتھ میرؔ سے بھی بھر پور اکتسابِ فن کیا ہے۔ مرزا کے ہاں ہمیں ان اساتذہ کے کلام سے استفادہ اور تجدید متن کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ یوں تو شروع سے عشقیہ شاعری میں رموزِ حیات کو حدیث دلبری بنا کر پیش کرنے کا رجحان موجود تھا مگر مرزا کے زمانے تک آتے آتے یہ طرزِ اظہار پختہ تر اور مقبول خلائق ہو گیا لہٰذا غالب کے ہاں بزم، گل ستاں، قفس اور مے کدہ وغیرہ کی علامتوں نیز ان کے تلازمات سے بھی سیاسی معاملات کی فن کارانہ پردہ کشائی عمل میں لائی گئی ہے؛ اس ضمن میں ذیل کے اشعار بہ طور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں (۱۸۶)

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا (۱۸۷)

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر، ہم دم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟ (۱۸۸)
مے سے غرض نشاط ہے، کس رو سیاہ کو
اک گو نہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے (۱۸۹)

غالبؔ کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں کچھ نئی شروعات متعارف کروا رہا تھا۔ یوں تو یہاں کی تہذیب دنیا کی چند قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک تھی مگر زمانے کی تیزی سے بدلتی ہوئی ضروریات کے تحت اس میں تغیر و تبدل کا عمل متناسب حد تک نہیں ہو پایا تھا۔ انیسویں صدی تک آتے آتے معاصر دنیا میں اس قدر تغیرات رونما ہو چکے تھے کہ ان کے تعامل سے مقامی تہذیب کی کایا کلپ نوشتۂ دیوار بن گئی۔ غالبؔ جیسا عبقری آدمی نوائے وقت سے کیوں کر بے بہرہ رہ سکتا تھا؟ تاہم مرزا کے تغیر شناس رویّے کے باوجود ان کی وطن سے محبت قطعاً متاثر نہیں ہوتی۔ مرزا کا یہ شعر ان کے فلسفۂ حبِ وطن کا بہترین ترجمان ہے:

الفتِ گل سے غلط ہے دعوائے وارستگی
سرو ہے، باوصف آزادی، گرفتارِ چمن (۱۹۰)

مرزا غالب کو ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام حکومت کا مستقبل مخدوش نظر آرہا تھا۔ اس نظام نے عوام کی آزادیاں سلب کر رکھی تھیں۔ پیداواری ذرائع پر چند لوگوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ فکر و فلسفہ پر ایک جمود طاری تھا اور روایتی مفروضوں پر جدید تحقیق معیوب خیال کی جاتی تھی جب کہ اس کے مقابل مغرب کی نو وارد قوت میں غالب کو ترقی پسندی اور روشن خیالی کے زیادہ امکانات نظر آرہے تھے۔ بلاشبہ یہ تاثر سرمایہ دارانہ نظام کے اولین مشاہدے پر مشتمل تھا اور مرزا اس کے استحصالی پہلوؤں کو نظر انداز کر رہے تھے، تاہم ان کی تجزیاتی نگاہ میں ہندوستان کے جاگیردارانہ سماج کے لیے یہی نظام زندگی کی تازہ نمو کا ضامن بن سکتا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"غالب نے دورِ قدیم کے پرستاروں کی ذہنیت کا اندازہ تو کر ہی لیا تھا ساتھ ہی ساتھ آنے والے دور کی پرچھائیں بھی دیکھ لی تھی۔ مغلیہ تہذیب و تمدن کے بجھتے ہوئے چراغ کی روشنی میں زندگی کو صرف پراگندہ ہوتے ہی نہیں بلکہ ایک نئے مذاق کو شاہانہ انداز سے آتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔" (۱۹۱)

غالب بہ ذاتِ خود ایک جاگیردارانہ معاشرے کے ساختہ و پرداختہ تھے مگر ان کی بالغ نظری اور ترقی پسندانہ مزاج نے قدم قدم پر انھیں روایتی حصار سے گریز اور کھلی فضاؤں کی طرف لپکنے پر مجبور کیے رکھا؛ اس ضمن میں ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے (۱۹۲)

دوست دار دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا (۱۹۳)

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوس زر

کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے (۱۹۴)

ممتاز حسین نے بالکل بجا طور پر لکھا ہے کہ ''ہماری روشن خیالی اور ہمارے جدید ادب دونوں ہی کا آغاز غالب کی نظم ونثر سے ہوتا ہے۔''(۱۹۵)

برصغیر کی مزاحمتی قوتوں کا پسپا ہونا، ایک نئی تہذیب کا جبری ادغام اور مقامی روایات و اقدار کی بہ تدریج تحلیل جیسے عوامل یقیناً ایک کرب ناک احساسِ فنا کا باعث بن رہے تھے مگر غالب نے اس احساس کو ایک نئی زندگی کی امید اور استحصال سے پاک معاشرتی نظام کی نوید سے منسلک کر کے رجائیت پسند فلسفۂ عمل کی بھرپور ترجمانی کی ہے:

جادۂ راہ خور کو وقتِ شام ہے، تارِ شعاع

چرخ وا کرتا ہے، ماہِ نو سے آغوشِ وداع (۱۹۶)

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا (۱۹۷)

نہ پوچھ بے خودیٔ عیش مقدمِ سیلاب

کہ ناچتے ہیں پڑے سر بہ سر، در و دیوار (۱۹۸)

سیلاب بلا کے خیر مقدم میں در و دیوار کو خوشی کے مارے اچھل کود کرتے دکھانا یقیناً معاصر معاشرتی فضا میں حیرت ناک رویّہ قرار دیا جا سکتا تھا؛ مرزا نے خود بھی اس امکانی صورت کی طرف اشارہ کر دیا ہے:

میری ہستی ، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے

جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے (۱۹۹)

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری نے غالب کے تصورِ فنا کی گرہ کشائی کرتے ہوئے اسے ایک ''سیاسی منشا'' قرار دیا ہے۔(۲۰۰) مرزا کے بہت سے ایسے اشعار جنھیں بنیاد بنا کر انھیں

قنوطیت پسندی سے بھی وابستہ کردیا جاتا ہے، اسی سیاسی بصیرت کی ترجمانی کے امین بھی ہیں:

نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا غالبؔ
یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا[۲۰۱]

فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر[۲۰۲]

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا[۲۰۳]

غالبؔ کے اس ''تصورفنا'' کی سیاسی حکمتیں مدنظر رہیں تو اس معمے کا سلجھانا دشوار نہیں رہتا کہ انھوں نے عہد گذشتہ کی یادوں کو اپنے لیے ایک عارضہ یادیام (Nostalgia) کیوں کر نہ بنے دیا۔ غالبؔ اپنی مشرقی تہذیب کے دل دادہ بھی ہیں اور اس کی نارسائیوں کے سخت گیر ناقد بھی۔ وہ ہندوستان کے مقتدر ایوانوں میں برطانوی پزیرائی کا مشاہدہ کر کے غم زدہ تو ہوئے ہیں کہ اس سے حاکمانِ وقت کی نااہلی کا پہلو نکلتا ہے مگر بددل ہرگز نہیں ہوتے۔ جو اشعار عام طور پر ان کا دل شکستگی اور قنوطیت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں وہ نوآبادیاتی سیاق وسباق میں رجائیت کا ایک رخ بھی ہیں۔ مثلاً ۱۸۵۳ء میں لکھی گئی ایک معروف غزل کے دو کلیدی اشعار دیکھیں:

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟[۲۰۴]

''غالبؔ خستہ'' کو تج کر ''عہد تجدید تمنا'' کی فضا ہموار کرنا مرزا ہی کا خاصہ ہے۔ دراصل انھوں نے ہی ہمارے قومی شعور میں تجدد پسند روایت کی بنیاد رکھی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری انھیں اپنے دور کا سب سے بڑا تجدد پسند قرار دیتے ہیں۔[۲۰۵] غالب کا یہ شعر ان کے

رجائیت پسند مسلک کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے:

وہ تپِ عشقِ تمنا ہے کہ جوں رشتۂ شمع

شعلہ ، تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے[۲۰۶]

مرزا غالب نے برطانوی نظامِ حکومت کے متعلق جس حسنِ ظن کا اظہار کیا ہے اس کی بنیاد شخصی مشاہدہ بھی تھا اور اجتماعی احساس بھی۔ مرزا کی ولیم فریزر، جان جیکب سن اور گورنر جنرل لارڈ ایلین بر جیسے انگریزوں سے خاصی علیک سلیک تھی۔ آخر الذکر کی وساطت سے مرزا نے ملکہ برطانیہ کی خدمت میں اپنا ایک قصیدہ بھی اس امید پر بھیجا تھا کہ وہ انھیں اپنا درباری شاعر مقرر کریں مگر بہ وجہ یہ معاملہ اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچ سکا۔ مغربی طرز زندگی کے متعلق غالب کے تاثرات کا اہم ترین سبب ان کا سفر کلکتہ ہے۔ اس شہر میں انھوں نے مغربی طرز حیات، صنعتی ترقی، اوقاتِ کار کی پابندی اور تہذیبی رکھ رکھاو وغیرہ جیسے شان دار مناظر دیکھے جن سے ان کے روایتی ذہن میں پیدا ہونے والا روشن خیالی کا دھانہ یک لخت کئی گنا وسیع ہو گیا۔ مرزا کی شاعری اور مکتوبات میں اس شہر کو شان دار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔☆ ان کے فکری تغیرات میں اس سفر کی اہمیت اساسی نوعیت کی تھی۔ اب وہ پورے یقین سے محسوس کرنے لگے تھے کہ مستقبل قریب میں برصغیر کی سیاسی و تہذیبی قیادت برطانوی قوم کرے گی۔ غالب کے ترقی پسندانہ نظریات کی ایک ابتدائی دستاویزی شہادت وہ تقریظ مانی جاتی ہے جو انھوں نے سر سید احمد خاں کی کتاب ''آئین اکبری'' کے سلسلے میں لکھی تھی؛ اس میں سر سید کو یہ کہہ کر کہ ''مردہ پروردن مبارک کار نیست''،[۲۰۷] انھیں دراصل روایتی حصار سے نکلنے اور نئی تہذیب کے ہم قدم چلنے کی تلقین کی گئی تھی۔ ہندوستان میں سیاسی و معاشرتی انقلاب کا آنا ایک بدیہی حقیقت تھا جسے غالب کی عینیت پسندی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسی تناظر میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''انگریزوں کا نظام اٹھارویں صدی کے مسلم نظام سے بہتر تھا۔''[۲۰۸] غالب کی اہل مغرب سے توقعات کچھ انفرادی نوعیت کی حامل نہ تھیں بل کہ اس دور میں کمپنی نے جدید تعلیمی اداروں کے قیام، رسم ستی کے خاتمے، غلامی کی ممانعت، نابالغ بچوں کی شادی پر پابندی اور بیوگان کو دوبارہ

شادی کی اجازت جیسی اصلاحات سے باشعور لوگوں میں اپنا ایک مثبت تاثر قائم کر لیا تھا۔ انھی دنوں جنگِ آزادی شروع ہو گئی جس کے بعد یہ اصلاحاتی سلسلہ کافی تعطل کا شکار رہا۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے واقعات سے انگریزوں نے جو پہلا سبق سیکھا وہ یہ تھا کہ اہل ہند کے سماجی اور مذہبی معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ دینا چاہیے۔ وہ ایک شدید قسم کے خوف میں مبتلا ہو گئے تھے۔"(۲۰۹)

غالب کے دور میں شاہ ولی اللہ اور ان کے عزیز و اقربا کی تبلیغی سرگرمیوں سے معاشرے میں تقدیر پرستی اور ضعفِ ایمانی کا عنصر کافی حد تک کم ہو چلا تھا۔ عوام میں انفعالی رجحانات کے بہ جائے عملیت پسندی پیدا ہو چکی تھی۔ غالب کے افکار نہ صرف اس روحِ عصر سے ہم آہنگ تھے بل کہ وہ اپنی تمام تر مصلحت کوشی کے باوجود اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک روشن خیال اور ترقی پسند معاشرے کی تعمیر میں برابر اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔

نو آبادیاتی نظام کا تشکیلی دور اور اُردو غزل۔۔۔ایک اجمالی جائزہ

اردو غزل کا یہ دور کم و بیش ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے۔ اس عہد میں نو آبادیاتی صورت حال کی تشکیل سے لے کر حکومت انگلشیہ کے قیام تک کی اہم سیاسی حرکیات اور اردو غزل میں ان کے اظہاری قرینے زیر بحث آئے ہیں۔ ولی دکنی نے باقاعدہ اپنا روئے سخن مغربی تاجروں کی طرف پھیر کر اس نو وارد تہذیب کی تخلیقی ترجمانی کا ڈول ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی ایہام گو شعرا کا دور آتا ہے۔ جس میں آرزو، آبرو، حاتم اور مظہر جانِ جاناں وغیرہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔ بنیادی طور پر یہ شعرا صنعت ایہام کے لیے لفظی جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے، تاہم مغرب کی نو وارد قوت سے بھی انھیں کچھ نہ کچھ علاقہ ضرور تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ شعرا ابھی تک نئی تہذیب کے ممکنہ فوائد یا نقصانات کا صحیح درک نہ رکھنے کی وجہ سے اس کی ردّوقبول میں کسی واضح روّیے کا اظہار نہیں کرتے۔

میرؔ و مرزاؔ کے زریں عہد میں یقیناً جہاں غزل کی عشقیہ اور صوفیانہ جہات نکھریں وہاں سیاسی شعور کو بھی زیادہ سلجھاؤ سے پیش کیا جانے لگا۔ تیزی سے تبدیل ہوتے سیاسی منظر نامے کی وجہ سے لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بھی رنگ سخن بدل گیا تھا لہٰذا انشاؔ، مصحفیؔ اور جرأتؔ کے رنگین کلام میں ایک فکری آہنگ بھی موجود ہے۔ ان شعرا میں انشاؔ کے ہاں مفاہمتی اور مصحفیؔ کے ہاں مزاحمتی خیالات واضح شکل میں اظہار پذیر ہوئے ہیں۔ اس دور تک مغربی قوت بہت سی مقامی طاقتوں مثلاً سکھ، جاٹ، مرہٹوں اور روہیلوں کی طرح ہی کا ایک خطرہ تھی اس لیے بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کوئی مزاحمتی شعر نو وارد قوم سے متعلق ہے یا کسی مقامی قوت کے؛ تاہم ایسے موقعوں پر اکثر کوئی نہ کوئی قرینہ شعر میں رکھ دیا جاتا ہے جو اس التباس کو رفع کرنے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔

اسی دور سے وابستہ غالبؔ اور اس کے ہم عصروں کی غزل بھی ہے۔ جس میں سیاسی تناظر کے واضح تغیر و تبدل کی عکس بندی کی گئی ہے۔ اس زمانے میں فرنگی قوت ہندوستان کی سیاسی بساط پر اپنی جگہ بہ خوبی بنا چکی تھی لہٰذا میرؔ و مرزاؔ کا التباسی اسلوب اب واضح طور پر غم ذات سے نکل کر

تہذیبی زوال کے تلخ احساس میں ڈھل جاتا ہے۔ اس عہد کی تقریباً نصف صدی پر پچھلی غزل کی
ہاں اپنے اندر رنج والم، شکوہ وشکایت اور برہمی ودرشتگی جیسے بھی رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ غالبؔ
مومنؔ، ذوقؔ اور ظفرؔ وغیرہ تک آتے آتے غزل کے علامتی نظام اور اس کے اسمائے ضمیر کی نئی
معنویت مسلّم ہونے لگتی ہے۔ ان شاعروں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دو تہذیبوں کی آویزش اور
ان میں سے ایک کو پس پائی اختیار کرتے دیکھا تھا لہٰذا ان کے ہاں ناسٹلجیا، کرب ہجر اور آہ وشیون
وغیرہ جیسے تمام رنگ پوری تخلیقی پختگی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس وسیع دور کے مجموعی طرز احساس کو
سمجھنے کے لیے میرؔ اور غالبؔ کا کلام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مرزا غالب کے ہاں جہاں مٹتی ہوئی
شان دار تہذیب کا نوحہ موجود ہے وہاں اس زوال کی منطقی توجیہہ اور نئے نظام کو تسلیم کرنے کا
نہایت لطیف فکر وفلسفہ بھی کارفرما ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ اکبرالہ آبادی: کلیات اکبر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۸
۲۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت، لاہور: مکتبہ اردو، س۔ن۔ ص ۸
۳۔ فیض، فیض احمد: موج زر، مرتبہ: احمد سلیم، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۰ء، ص ۲۷۰
۴۔ فتح محمد، ملک: تعصبات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء ص ۳۶
۵۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱
۶۔ سودا: کلیات سودا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۵
۷۔ حسرت: کلیات حسرت، مرتبہ: بیگم حسرت موہانی، لاہور: علی ہجویری پبلشرز، س۔ن، ص ۲۱۵
۸۔ ایضاً، ص ۱۵۵
۹۔ ایضاً
۱۰۔ اکبر: کلیات اکبر، ص ۲۶۳
۱۱۔ ظفر: کلیاتِ ظفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰، ص ۵۵۱
۱۲۔ اقبال: کلیاتِ اقبال (اردو)، لاہور: اقبال اکادمی، طبع ہفتم، ۲۰۰۶ء، ص ۳۶۱
۱۳۔ سراج اورنگ آبادی، منقول از: گلشنِ ہمیشہ بہار، از: نصر اللہ خویشگی، مرتبہ: ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۱۷۳
۱۴۔ ولی دکنی: کلیاتِ ولی، مرتبہ: نور الحسن ہاشمی، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۵
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۸۶
۱۶۔ ایضاً، ص ۹۴
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۷۶

☆ اس مثنوی کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فرنگی اس میں اِتنے ہیں کلہ پوش
عدو وھاں جن کی گنتی میں ہیں بے ہوش
ختم ہے امرداں اوپر صفائی
ولے ہے بیش تر حسن نسائی
کشن کی گوپیاں کی ہمیں ہے یہ نسل
اہیں سب گوپیاں وہ نقل ، یہ اصل
اہے واں عاشقاں کوں عام آواز

کہ نکیں پردہ بغیر از پردۂ ناز
پڑا شیریں بچن سن اس کے بس جو
پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو
(ولی دکنی: کلیاتِ ولی، مرتبہ: نورالحسن ہاشمی، لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۱۹۹۶ء، ص ۷۱-۷۲)
موزوں، رام نرائن، منقول از: تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ: میر حسن، ص ۱۵۰

۱۸۔ غزالاں نے مجنوں کے بعد ویرانے کی صورت حال کیا بیان کی، معلوم نہیں ہو سکا تاہم یہ روایت ضرور ملتی ہے کہ خود رام نرائن موزوں نے پورے بنگال پر لارڈ کلائیو کا قبضہ ہونے پر پٹنہ کے دیوان کا عہدہ سنبھالے رکھا تھا۔ کیسا!!!! (صفدر میر: آخرِ شب، لاہور: کلاسیک، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱)

۱۹۔ میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۵۰

۲۰۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر: اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک، لاہور: یونی ورسل بکس، ۱۹۸۶ء

۲۱۔ حاتم، ظہور الدین: دیوان زادہ، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۹۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۲۶۔ اشرف، کے۔ ایم: احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب، شمولہ: ۱۸۵۷ء ادب، سیاست اور معاشرہ، مرتبہ: احمد سلیم، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۱ء، ص ۳۵

۲۷۔ نسیم، الف۔ د، ڈاکٹر: ادبی منظر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۷، ص ۴۷

۲۸۔ کلیاتِ سودا، ص ۱۲۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۰۔ درد: دیوانِ درد، مرتبہ: عبدالباری آسی، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، س۔ن، ص ۲۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۶۲

۳۲۔ کلیاتِ سودا، ص ۵۶

۳۳۔ یقین، انعام اللہ، منقولہ: مخزنِ نکات، مرتبہ: ڈاکٹر اقتدا حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۶

۳۴۔ درد: دیوانِ درد، ص ۶۴

۳۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج: 3، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء، ص ۸۷

۳۶۔ درد: دیوانِ درد، ص ۷۴

۳۷۔ دیوان درد، ص ۵۱

۳۸۔ کلیاتِ قائم، ص۱۵۹

۳۹۔ کلیاتِ سودا، ص۱۹۱

۴۰۔ امجد، امجد سلام: نئے پرانے، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۰ء، ص۹۱

۴۱۔ کلیاتِ سودا، ص۱۹۶

۴۲۔ نصیرالدین ہاشمی: دہلی کا دبستانِ شاعری، لاہور: بک ٹاک، ۱۹۹۱ء، ص۱۵۶

۴۳۔ کلیاتِ میر، ص۴۰۶

۴۴۔ عبداللہ، سید، نقد میر، لاہور: مکتبہ خیابان، ۱۹۶۸ء، ص۸۰

۴۵۔ عبدالقادر سروری: جدید اردو شاعری، حیدرآباد دکن: کتب خانہ عزیزیہ، ۱۹۳۹ء، ص۸۷

۴۶۔ عبدالحئی، مولوی: گل رعنا، لاہور عشرت پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۶۴ء، ص۱۴۲

۴۷۔ کلیاتِ میر، ص۴۲۳

۴۸۔ میر، میر تقی: میر کی آپ بیتی، مترجم: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، س۔ن، ص ۳۱۸۔۲۰

۴۹۔ کلیاتِ میر، ص۳۴۱

۵۰۔ ایضاً، ص۵۲۳

۵۱۔ ایضاً، ص۳۶۶

۵۲۔ ایضاً، ص۱۷۱

۵۳۔ مغنی تبسم: فانی بدایونی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۶۹ء، ص۲۴۶

۵۴۔ فتح محمد ملک، تعصبات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۳۶

☆ ڈاکٹر موصوف نے اس شعر کا دوسرا مصرع یہاں اس طرح درج کیا ہے:

ع "اس کتے نے کر کے دلیری صیدِ حرم کو پھاڑا ہے۔"

یہاں "پھاڑا ہے" کا لفظ زیادہ بلیغ ہے۔

۵۵۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص۶۲

۵۶۔ کلیاتِ میر، ص۷۹۷

۵۷۔ ایضاً، ص۳۴۱

۵۸۔ ایضاً، ص۴۰۰

۵۹۔ ایضاً، ص۴۰۸

۶۰۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (مترجم): میر کی آپ بیتی، ص۲۵۲

۶۱۔ ایضاً

۶۲۔ ملاحظہ فرمائیں، میر کی آپ بیتی، ص۲۸۲۔۲۸۳

٦٣۔ کلیاتِ میر، ص ٦٤

٦٤۔ ایضاً، ص ٤١٧

٦٥۔ ایضاً، ص ٥٥٤

٦٦۔ کلیاتِ غالب کامل، ص ٣٤٦

٦٧۔ کلیاتِ میر، ص ٩٣

٦٨۔ ایضاً، ص ٤٠٨

٦٩۔ ایضاً، ص ١٧٥

٧٠۔ ایضاً، ص ١٢٤

٧١۔ نسیم، الف۔د۔، ڈاکٹر: ادبی منظر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، ج: ٧، ص ٦٠

٧٢۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو غزل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ١٩٨٨ء، ص ٩٧

٧٣۔ ☆میر نے کلامِ جرأت کی بابت کہا تھا: ''تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو''
(حکیم قدرت اللہ قاسم: مجموعہ نغز، ج: اول، مرتبہ: حافظ محمود شیرانی، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ١٩٣٣ء، ص ١٥٦)

مصحفی نے اپنے اس شعر میں جرأت کے کلام کو ''چھنالے کی شاعری'' کہا ہے:

نخرہ بھی شعر میں ہو تو ہاں سوز کا سا ہو
کس کام کی وگرنہ چھنالے کی شاعری

(مصحفی، غلام ہمدانی: دیوانِ مصحفی، ج: 3، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ١٩٧١ء، ص ٣٩٦)

٧٤۔ احمد، محمد جمیل: اردو شاعری پر ایک نظر، کراچی: غضنفر اکیڈمی، ١٩٩٦ء، ص ١٢٩

٧٥۔ جرأت، کلیاتِ جرأت، ج: 1، مرتبہ: ڈاکٹر اقتدا حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ١٩٦٨ء، ص ٥٩

٧٦۔ ایضاً، ص ٦٠

٧٧۔ کلیاتِ درد، مرتبہ: عبدالباری آسی، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، س۔ن، ص 75

٧٨۔ کلیاتِ جرأت، ص ٥٢٩

٧٩۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج: ٣، ص ٨٢

٨٠۔ ایضاً، ص ٨١

٨١۔ ایضاً، ص ٧٧

٨٢۔ ایضاً، ص ١١٤

٨٣۔ عبدالحئی (مرتب): گلِ رعنا، ص ٢١٦۔٢١٧

٨٤۔ عبداللہ یوسف علی، علامہ: انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص ١٥٨

۸۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج:۳، ص ۱۱۳

۸۶۔ کلیاتِ میر، ص ۳۴۱

۸۷۔ کلیاتِ انشا، ص ۶۳

۸۸۔ ایضاً، ص ۳۸۰

۸۹۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۹۰۔ ایضاً، ص ۴۴۸

۹۱۔ ایضاً، ص ۴۹

۹۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۹۳۔ ایضاً، ص ۴۶۲

۹۴۔ فراق گورکھ پوری، مقدمہ: دیوان مصحفی، انتخاب: مولانا حسرت موہانی، طبع دوم، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۰ء، ص ۲۴

۹۵۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیات مصحفی، دیوان ششم، مرتبہ: نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۸

۹۶۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیات مصحفی، دیوان ہفتم، مرتبہ: نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۵ء، ص ۷۵

۹۷۔ کلیات مصحفی، دیوان سوم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۱

۹۸۔ کلیات مصحفی، دیوان دوم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۴

۹۹۔ کلیاتِ مصحفی، دیوان ہفتم، ص ۷۵

۱۰۰۔ کلیاتِ مصحفی، دیوان چہارم، مرتبہ: نور الحسن ہاشمی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۳ء، ص ۱۹۰

۱۰۱۔ کلیاتِ مصحفی، دیوان ششم، ص ۲۲۸

۱۰۲۔ آتش، حیدر علی: کلیات آتش، ج: اوّل، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۳ء، ص ۲۱۸۔۲۲۰

۱۰۳۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: انداز نظر، لاہور: سنگ میل ۱۹۹۹ء، ص ۸۵۔۸۶

۱۰۴۔ عابد، عابد علی: شعر اقبال، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۷۷ء، ص ۴۔۵

۱۰۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج:۳، ص ۳۴

۱۰۶۔ ظفر، بہادر شاہ: کلیات ظفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۴۷

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۵۲۳

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۵۵۷

۱۱۰۔ ایضاً،ص۶۵
۱۱۱۔ ایضاً،ص۲۱
۱۱۲۔ ایضاً،ص۲۸۷
۱۱۳۔ ایضاً،ص۱۹
۱۱۴۔ ایضاً،ص۵۰۳
۱۱۵۔ ایضاً،ص۱۰۲
۱۱۶۔ ایضاً،ص۲۱۰
۱۱۷۔ ایضاً،ص۴۲۸
۱۱۸۔ ایضاً،ص۶۲۵
۱۱۹۔ ایضاً،ص۲۱
۱۲۰۔ ایضاً،ص۲۷۲
۱۲۱۔ ایضاً،ص۹۱
۱۲۲۔ ایضاً،ص۵۵۱
۱۲۳۔ ایضاً،ص۲۴۱
۱۲۴۔ ایضاً،ص۲۵۱
۱۲۵۔ ایضاً،ص۵۰۵
۱۲۶۔ عمر فیضی، تعارفیہ: کلیاتِ ظفر،ص۳۶۷
۱۲۷۔ جہاں دار، مرزا جواں بخت: دیوانِ جہاں دار، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء،ص۶۳
۱۲۸۔ ایضاً،ص۸۵
۱۲۹۔ ایضاً،ص۱۲۴
۱۳۰۔ سلیمان، مرزا سلیمان شکوہ: منقول از: تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، ج:۱، از: سعادت علی خاں ناصر، مرتبہ: مشفق خواجہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء،ص۲۲۴
۱۳۱۔ سلیمان، مرزا سلیمان شکوہ، منقول از: گلشن بے خار، از: غلام مصطفٰے خاں شیفتہ، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء،ص۲۴۳
۱۳۲۔ نصیر الدین ہاشمی: دکنی کلچر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء،ص۱۳۶
۱۳۳۔ ناصر، سعادت علی خاں (مرتب): تذکرہ معرکۂ خوش زیبا،ص۲۱۶
۱۳۴۔ آصف، آصف الدولہ، منقول از: گلشن بے خار،ص۲۹
۱۳۵۔ آصف، آصف الدولہ، منقول از: تذکرہ معرکۂ خوش زیبا،ص۳۶

۱۳۶۔ انجام، امیر خاں، منقولہ: مخزنِ نکات، ص ۷۸

۱۳۷۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر: غالب اپنے زمانے میں، مشمولہ: احوال ونقد غالب: ص ۷۰۔۷۱

۱۳۸۔ غالب: دیوان غالب کامل، ص ۳۲۶

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۳۰۱

۱۴۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۶۱

۱۴۱۔ مالک رام: ذکرِ غالب، لاہور: مکتبہ شعروادب، س۔ن، ص ۱۰۹

۱۴۲۔ احتشام حسین، سید: غالب کا تفکر، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۱۷۹

۱۴۳۔ شعلہ، عطا محمد: غزل پر غالب کے احسانات، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۴۵۱

۱۴۴۔ سرور، آل احمد: غالب کا ذہنی ارتقا، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۳۱۸

۱۴۵۔ احتشام حسین، سید: غالب کا تفکر، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۱۹۱

۱۴۶۔ خلیل الرحمٰن اعظمی: غالب اور عصرِ جدید، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۲۶۶

۱۴۷۔ احتشام حسین، سید: غالب کا تفکر، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۱۸۵

۱۴۸۔ فراق گورکھ پوری: پہلی جنگ آزادی، مشمولہ: ۱۸۵۷ء ادب، سیاست اور معاشرہ، مرتبہ: احمد سلیم، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۱ء، ص ۲۶۲

۱۴۹۔ دیوانِ غالب کامل، ص ۳۴

۱۵۰۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۳۳۶

۱۵۲۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۱۵۳۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر (مرتب): محاسن خطوط غالب مع انتخاب خطوط غالب، لاہور: بزم اقبال، ۲۰۰۳ء، ص ۷۳

۱۵۴۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۷۲۔۲۷۳

۱۵۵۔ انیس ناگی: تشکیلات، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۶ء، ص ۲۹۔۳۰

۱۵۶۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۷۳

۱۵۷۔ ایضاً

۱۵۸۔ ایضاً، ص ۳۳۳

۱۵۹۔ ایضاً، ص ۲۴۳

۱۶۰۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۱۶۱۔ ایضاً، ص ۲۷۳

۱۶۲۔ فراق گورکھ پوری: پہلی جنگ آزادی، مشمولہ: ۱۸۵۷ء ادب، سیاست اور معاشرہ، ص ۲۶۲

ذکرِ غالب، ص ۴۹

۱۶۳۔ مالک رام: ذکرِ غالب، ص ۴۹

۱۶۴۔ منظور حسین، خواجہ: تحریک جدوجہاد بطور موضوعِ سخن، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۸ء

۱۶۵۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۶۳

۱۶۶۔ ایضاً، ص ۲۷۳

۱۶۷۔ ایضاً، ص ۳۰۳

۱۶۸۔ عابد: عابد علی: انتقاد ادبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۴۱

۱۶۹۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۸۶

۱۷۰۔ ایضاً

۱۷۱۔ ایضاً

۱۷۲۔ ایضاً، ص ۲۹۹

۱۷۳۔ جعفر حسن زیدی: تاریخ نویسی کے رجحانات، مشمولہ: نقاط، ش: ۹، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵

۱۷۴۔ دیوانِ غالب کامل، ص ۱۵۱

۱۷۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۱۷۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: انداز نظر، ص ۱۵

۱۷۷۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۷۸۔ دیوان غالب کامل، ص ۱۴۱

۱۷۹۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۱۸۰۔ ایضاً

۱۸۱۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۸۲۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۱۸۳۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۱۸۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۱۸۵۔ سرور، آل احمد: غالب کا ذہنی ارتقا، مشمولہ: احوال و نقد غالب، ص ۳۱۱

۱۸۶۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۸۷

۱۸۷۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۱۸۸۔ ایضاً، ص ۳۳۱

۱۸۹۔ ایضاً، ص ۲۴۳

۱۹۰۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۱۹۱۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر: غالب اپنے زمانے میں، مشمولہ: احوال و نقد غالب، ص ۷۵

۱۹۲۔ دیوان غالب کامل، ص ۲۴۲

۱۹۳۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۱۹۴۔ ایضاً، ص ۲۸۰

۱۹۵۔ ممتاز حسین: غالب ۔۔۔ ایک تہذیبی قوت، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۱۴۰

۱۹۶۔ دیوان غالب کامل، ص ۱۴۶

۱۹۷۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۱۹۸۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۱۹۹۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۲۰۰۔ اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر: غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر، مشمولہ: احوال ونقد غالب، ص ۲۲۷

۲۰۱۔ کلیاتِ غالب کامل، ص ۱۶۹

۲۰۲۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۲۰۳۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۲۰۴۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۲۰۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، ص ۲۰

۲۰۶۔ کلیات غالب کامل، ص ۱۸۵

☆ کلکتہ کے بارے میں غالب کا یہ قطعہ بہت معروف ہے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے جگر پہ مارا کہ ہائے ہائے!
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے!
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ! واہ!
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے!

(کلیات غالب کامل، ص ۲۷۶)

۲۰۷۔ غالب: کلیات غالب (فارسی)، ج: اول، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۷

۲۰۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج: ۳، ص ۲۳

۲۰۹۔ قاضی جاوید: ۱۸۵۷ء کی میراث، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، ص ۸۸

برطانوی راج میں اہلِ ہند کی دفاعی مزاحمت اور اردو غزل

(نوآبادیاتی نظام کا نصف اول ۱۸۵۷۔۱۹۰۰ء)

حال پہلو بچا کے لکھا ہے
تاڑ جائے وہ نکتہ چیں نہ کہیں
(داغ دہلوی: مہتاب داغ، ص ۱۰۴)

اُردو غزل کے روایتی کردار اور ان کی نوآبادیاتی معنویت

اُردو غزل میں عام طور پر محفل، مے کدہ اور گلستان سے متعلقہ کردار ہی زیادہ متحرک نظر آتے ہیں۔ اگر ان میں بھی مزید تخصیص برتی جائے تو محبت کی تثلیث یعنی عاشق، معشوق اور رقیب کے کردار اس صنفِ سخن کا بنیادی حوالہ کہے جا سکتے ہیں۔ حسن و عشق کے معاملات میں بے پناہ استعاراتی امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اُردو غزل جسے ابتداً حکیم سنائی غزنوی نے ایک سماجی صنفِ سخن کے طور پر متعارف کروایا تھا۔ بنیادی طور پر عشقیہ پیرایۂ بیان (Erotic Expression) ہی اختیار کرتی ہے۔ یہ طرزِ اظہار ادبی نگارشات کا اہم اور موزوں ترین وسیلہ رہا ہے۔ اگر ادبی اظہاریوں کو اصلیت اور حقیقت بیانی کے منشورات کا پابند بنا کر اس میں تعبیر و ترجمانی کا بیانیہ انداز (Hermeneutic Expression) برتا جائے تو ایسے میں ادب اور صحافت کا مابہ الامتیاز معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔ اس امر کی مثال ترقی پسندوں کی غزلیات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کلاسیکل غزل گو شعرا نے ہمیشہ انسان کے اس نفسیاتی تقاضے کا پاس کیا ہے۔ محبت کی جمالیاتی دنیا کے پردے میں معاصر سیاسی و سماجی جدلیات کی ایمائی عکاسی متغزلین کا خصوصی حربہ رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"غزل کا بنیادی حوالہ حسن و عشق ہے۔ حیات و کائنات، خدا اور انسان کے تعلق سے ساری باتیں اور زندگی کے سارے تجربے اس حوالے سے غزل میں آتے ہیں۔"(۱)

شعرا کرام نے عشق و محبت کے جامع اشاری نظام کو سلیقے سے برتا اور اس کے پردے میں اپنے معاصر حالات پر نہایت بلیغ تبصرے کیے۔ عشقیہ اسلوب پر مشتمل ایسی غزلوں کی متنی تشکیل کے بعد تفہیم شعر کا مرحلہ آیا تو شعریات کا جدید نظامِ خیال روبہ عمل ہو چکا تھا لہٰذا ایک عجیب مخمصے کی صورت پیدا ہو گئی۔ شعرا نے تخلیق شعر میں جن اشارتی لفظیات کا سہارا لیا تھا جدید شعریات کے زبیت یافتہ قاری نے انھیں کما حقہ، اپنے تفہیمی عمل کا حصہ بنانے میں سستی دکھائی جس کی بنا پر غزل اور غزل گو دونوں کو سخت سست الفاظ سے مطعون کیا جانے لگا۔ واضح رہے کہ عشق و محبت کی جملہ کیفیات بھی فی نفسہٖ اس صنف کی ایک اساسی پہچان ہیں۔ ایسے اشعار جن میں شاعر خود کو محض روایتی عشقیہ واردات تک محدود رکھتا ہے، اپنے اندر بالعموم مخصوص سوز و گداز، خود سپردگی اور ملاطفت کا پہلو رکھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہوس پرستی اور بازاری محبت کے معاملات بیان ہو رہے ہیں تو ان کی خارجیت سارا معاملہ کھول دیتی ہے۔ اہل لکھنؤ کی غزل کا عمومی رنگ اسی امر کی دلیل ہے۔ البتہ جب شاعر حسن و عشق کے پردے میں سیاسی تلخیوں اور سماجی ناہمواریوں کا اظہار کرتا ہے تو ایسے میں قاری کے سامنے تفہیم شعر کی ایک نئی منزل آ موجود ہوتی ہے جسے پانا مشکل بھی ہے اور ضروری بھی۔ اگرچہ ایسے اشعار کو مذکورہ بالا دونوں قسم کے عشقیہ اشعار سے الگ کرنے کا کوئی واضح قاعدہ یا ضابطہ موجود نہیں تاہم معاصر زمانی عوامل بسا اوقات شاعر کے اسلوب میں ایسے قرینے کھول دیتے ہیں جن سے معنی کی نئی دنیاؤں کا احساس ہونے لگتا ہے اور شعر کی تاثیر دو چند ہو جاتی ہے۔

نو آبادیاتی دور نے اردو غزل کو ایک نئے عاشق اور معشوق سے متعارف کروایا ہے۔ اس دور کی عشقیہ غزل کے متعلقات کی عصری تناظر میں معنویت متعین کی جائے تو ایک نئی فرہنگ تیار کی جا سکتی ہے۔ مثال کے لیے ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا(۲)

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے (۳)

پہلے شعر میں عاشق اپنے معشوق سے دستورِ الفت کو نظر انداز کر کے واقعتاً عشاق کی گردن مارنے پر شکوہ کناں ہے گویا معشوق یا تو آئینِ الفت سے نابلد ہے یا پھر اس آئین سے دانستہ روگردانی پر اتر آیا ہے جب کہ دوسرے شعر میں عاشق اپنے معشوق کو فریب دے کر اس کے دل کی خیر خبر لے رہا ہے تا کہ حسبِ حال لائحہ عمل مرتب کر کے اپنی مطلب برآری میں کام یاب ہو سکے۔ حسن و عشق کی یہ غیر روایتی وارداتیں نوآبادیاتی دور کے سیاسی داؤ پیچ کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اس طرزِ اظہار کے کچھ اور شعر دیکھیں:

نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی
یہ خلق اور ان کی زباں اور ہے (۴)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے (۵)

خط غیر کا پڑھتے تھے جو ٹوکا تو وہ بولے
اخبار کا پرچہ ہے خبر دیکھ رہے ہیں (۶)

ہے تیری جنس حسن میں تاثیر زہر کی
جس کی نظر پڑی وہ خریدار مر گیا (۷)

سو فتنے ہیں پنہاں نظرِ لطف میں اس کی
یہ لطف نہیں، اے دلِ ناشاد غضب ہے (۸)

زمیں سے وہ گئے تو آسماں سے تم اتر آئے
جگہ خالی نہ رہنے پائے عیسیٰ ابن مریم کی (۹)

مطیع وہ بتِ ترسا ہوا مبارک باد

سخا میں جنگِ صلیبی میں فتح یاب ہوا(۱۰)

ان تمام اشعار کے اسمائے ضمیر برطانوی نوآبادکار کے قائم مقام ہونے کا قرینہ بھی رکھتے ہیں اور اسی زاویۂ نظر سے ان کی صحیح تر تفہیم ممکن ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ہمارا مجموعی تنقیدی عمل ایسی معاصر تطبیق سے غیر مستحسن حد تک دامن کشاں رہا ہے۔ اس طرح نوآبادیاتی دور کا ادبی سرمایہ بالخصوص اردو غزل کا بین السطور بلیغ معنوی خزینہ عام قارئین کی نظروں سے اوجھل رہا۔ حال آں کہ درحقیقت اس دور کے شعرا نے محبوب کو وطن یا عوام کی علامت بھی بنایا ہے اور برطانوی نوآبادکار کی بھی۔ البتہ موخر الذکر معنویت خاص نوآبادیاتی دور کی دین ہے۔ غزل کی اس مقبول ترین علامت کے روایتی انسلاکات کچھ اس نوعیت کے تھے کہ برطانوی حاکم کی بہت سی خصوصیات اس میں عکس ریز نظر آئیں اور شعرا نے اس حسنِ اتفاق سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ فورٹ ولیم کالج کے منشی مظہر علی ولاؔ کا ایک شعر دیکھیے جس میں محبوب کی ضمیر کا فرنگی انسلاک بڑی وضاحت سے بیان ہوا ہے:

دہر میں شہرہ ہے اس کے حسن کا

ہے بتانِ ہند کا بازار سرد(۱۱)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ غزلیہ ضمائر کی اس تبدیلی پر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کلاسیکی عہد میں اردو غزل کے معنیاتی نظام کا ساختیہ مقتدر طبقے کی ظاہر داری اور عوامی باطنیت کی باہمی ٹکر سے عبارت تھا مگر ۱۸۵۷ء کے سیاسی المیے کے بعد اس آویزش کا ساختیہ نئے سیاسی سماجی ساختیے کو راہ دیتا ہے۔(۱۲) واضح رہے کہ اس تبصرے کے موید استدلالی اشعار ہر شاعر کے کلام سے بہ کثرت پیش کیے جاسکتے ہیں۔ میرؔ، مصحفیؔ اور غالبؔ وغیرہ کے کلام کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے ناقدین نے ایسے اشعار کی سماجی اور سیاسی معنویت کھلے دل سے تسلیم کی ہے۔ اس ضمن میں چند معتبر حوالے ملاحظہ فرمائیں:

(i) ''مصحفیؔ کے لیے غزل ان کے زندہ تجربوں اور مشاہدوں کے اظہار کا ذریعہ تھی

جس میں حسن وعشق علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔''(۱۳)

(ii)''غالب سے پہلے غزل زیادہ تر حسن وعشق کی زبان میں حسن وعشق کی داستان تھی۔ غالب نے اسے حسن وعشق کی زبان میں ایک نئی شخصیت اور ایک نئے ذہن کا ترجمان بنایا۔''(۱۴)

(iii) اکبر نے ''غزل میں حسن وعشق کے تاثرات کو ماحول کا آئینہ دار بنایا۔''(۱۵)

(iv) حسرتؔ کی شاعری ہر چند کہ عشقیہ ہے لیکن اس کی روح اس کے زمانے کی سیاسی تحریکوں کی بھی ترجمان ہے۔''(۱۶)

اُردو غزل کے وسیع تنقیدی سرمائے میں ایسے یک دوسطری بیانات ایک نئے تعبیری قرینے کی تشکیل کے لیے قطعاً ناکافی ہیں۔ آج بھی بالعموم غزل کو شاعر کا کلام سمجھنے کے بجائے عاشق کا رومانوی بیانیہ فرض کرلیا جاتا ہے اور نتیجتاً اس کے اسماوکردار کی ظاہری صورتوں میں الجھے سے منشائے مصنف کی حقیقی جان کاری ممکن نہیں رہتی۔ غزل گوشعرا نے اپنے عشقیہ اسلوب بیان کی سماجی معنویت پر خود بھی اصرار کیا ہے؛ مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور (۱۷)

پایا ہر ایک بات میں اپنے میں یوں تجھے
معنی کو جس طرح سخن عاشقانے میں (۱۸)

حال پہلو بچا کے لکھا ہے
تاڑ جائے وہ نکتہ چیں نہ کہیں (۱۹)

سمجھنے والے سمجھتے ہیں پیچ کی تقریر
کہ کچھ نہ کچھ تری باتوں میں فی نکلتی ہے (۲۰)

واضح رہے کہ عشقیہ غزل کی لفظیات بہ ظاہر ایک کلیشے کی حیثیت اختیار کرگئی تھی مگر شعرا کرام نے ان میں جدید سیاسی وسماجی شعور سمو کر انھیں نئی زندگی عطا کی اور نو آبادیاتی دور کے پرآشوب ماحول کا آئینہ دار بنایا۔ محولہ بالا شعری مثالوں سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ نو آبادیاتی دور کی غزل کے اسمائی کردار اور ضمائر محبت کی سہ فریقی سرگرمیوں کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ معاصر سیاسی وسماجی حالات و واقعات سے بھی نہایت گہرا سروکار رکھتے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ ایسا کلام جو معاصر عہد سے نظریاتی خمیر حاصل کرتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وقتیا (To be dated) بھی جاتا ہے مگر سیاسی عوامل کی ترجمانی جب غزل گو شاعر کے ہاں حسن وعشق کے جمالیاتی احساس میں ڈھلتی ہے تو اس کی حیثیت امر ہو جاتی ہے

داغ دہلوی کی غزل: مابعد نو آبادیاتی تعبیر

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد نو آبادیاتی کلامیہ اپنی پوری فعالیت کے ساتھ رو بہ عمل ہوا جس سے زندگی کے ہر شعبے میں ایک نئے نظامِ خیال نے اپنی آمریت مستحکم کر لی۔ اس عہد میں برطانوی استعمار کاروں نے مقامی ادبی رجحانات کو جدید شعریات سے ہم کنار کر کے انھیں ایک نئی ڈگر پر چلانے کی کوشش کی۔ شعر و شاعری میں حالؔی اور آزادؔ وغیرہ نے ''پیروئ مغرب'' کا چلن اپنایا مگر ان کی تخلیقات عوامی ذوق کی تسکین نہ کر سکیں۔ بنیادی طور پر یہی وہ دور ہے، جس میں نظم کی سرکاری سرپرستی کر کے صنفِ غزل کو نامقبول بنانے کی کوشش کی گئی۔ ناقدین ادب نے بھی اس دور کا احاطہ کرتے ہوئے زیادہ تر نظم گو شعرا پر توجہ مبذول کیے رکھی اور یوں اس پر آشوب عہد کے مقبول ترین شاعر داغ دہلوی کو اردو ادب کی تاریخ میں وہ مقام نہ دیا جا سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ نقد و نظر کی کم التفاتی سے اس عہد کے غزل گو شعرا پر اپنے معاصر حالات سے بے توجہی برتنے اور شراب و شباب میں محو رہنے جیسے الزامات بھی لگتے رہے۔ اس نوع کی سب سے زیادہ تنقید داغ ہی کے حصے میں آئی۔ موصوف کے متعلق جس قدر بھی تنقیدی سرمایہ ملتا ہے اس میں ان کی زبان و بیان کی تحسین سے قطعِ نظر، کہیں بھی انھیں اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ طوائف کو اس مظلوم شاعر کا ثانوی حوالہ بنا دیا گیا۔ میرؔ کے ہاں پسرِ زرگر یا عطار کے لونڈے، غالب کی ستم پیشہ ڈومنی اور مومن کی امۃ الفاطمہ صاحبہ کو تو محض بساطِ ادب کے علامتی مہرے قرار دے دیا گیا مگر داغ کی منی بائی حجاب بہ وجہ ان کے گلے کا ہار ہو کر رہ گئی۔ ان کی شعر گوئی محض تفننِ طبع کی چیز قرار پائی نیز ''داغی اشعار''☆ میں واسوخت رنگ کی جحت قائم کر کے ان کی سماجی معنویت سے چشم پوشی کی جانے لگی اور یوں لاہور سے کلکتہ اور دلی سے دکن تک کی سلطنتِ شعر کا یہ بے تاج بادشاہ ناقدریِ دوراں کا بری طرح شکار رہا۔ کلامِ داغ کے متعلق ناقدین کا مجموعی طرزِ احساس جاننے کے لیے ان کے ہم عصر ناقد اکبر الہ آبادی کی یہ رائے قابلِ حوالہ ہے کہ:

"انھوں (داغ) نے حسنِ بیان کی دھن میں حسنِ خیال سے بہت کچھ قطع نظر کی ہے۔"(۲۱)

اکبر کے اس تبصرے پر مقدمہ شعر و شاعری کی متعارفہ اصلیت پسندی اور حقیقت نگاری کے جدید شعریاتی چلن کا اثر نمایاں ہے۔ داغ کے بارے میں اسی نوع کے تبصرے ہماری تنقید کا حاصل ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ داغ دہلوی محض حسنِ خیال کی رو میں بہہ کر حالی کی سی روکھی پھیکی شاعری کرنا مستحسن نہ سمجھتے تھے، اور ان کا رنگِ سخن وہی ہے جو انھوں نے اختیار کیے رکھا۔ کلام داغ کی اس طرز بیان کا ایک بلیغ اشارہ اقبال نے دیا ہے:

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں (۲۲)

داغ اردو زبان کے عاشقِ صادق اور صنفِ غزل کے جاں نثار مجاور تھے۔ انھیں اردو زبان کی لسانی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ غزل کے صنفی تقاضوں اور کومل شعریات کا بھی پورا پورا درک تھا۔ وہ دانستہ طور پر ایسی صحافتی شعر گوئی سے پرہیز کر رہے تھے جس کی مثالیں غالب اور اقبال کے درمیانی عہد کے شعرا یا ترقی پسندوں کے ہاں عام ملتی ہیں۔ رسل جیسا ایک مستشرق بھی جانتا ہے کہ:

"غزل کا محاورہ اُس انداز کا نہیں جس میں آپ مخصوص سیاسی تحریکوں کی براہِ راست عکاسی کی توقع رکھ سکیں۔"(۲۳)

حقیقت حال یہ ہے کہ داغ دہلوی کی غزل اپنی سماجی معنویت کے اعتبار سے میر و مرزا کی غزل سے کسی طور کم تر نہیں۔ ان کا کلام ایسے پر آشوب دور کا ترجمان ہے جس میں نو آبادیاتی استعماریت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ داغ کے سوانحی حالات پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جانِ ناتواں پر عتاب شاہی نازل ہونے کے امکانات اردو کے کسی بھی بڑے شاعر کی بہ نسبت زیادہ تھے۔ ان کے والد شمس الدین خاں کو ریزیڈنٹ دہلی سر ولیم فریزر کے قتل کی سازش میں ۱۸۳۵ء میں پھانسی دی گئی تھی۔ اس وقت داغ کی عمر محض چار سال تھی۔ (۲۴)☆ ان کی والدہ وزیر

بیگم بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد بیٹے مرزا فخرو کے حرم سے منسلک ہو کر ۱۸۵۶ء تک لال قلعہ میں مقیم رہیں۔ اس دوران میں داغ بھی ان کے ساتھ تھے اور ولی عہد سلطنت کا 'گیلا بیٹا'[۲۵]☆ ہونے کی حیثیت سے شفقت پدری سے بھرپور مستفید ہوتے رہے۔

یہ بات سب پر عیاں ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خوف ناک ردعمل کا شکار سب سے بڑھ کر وابستگانِ قلعہ ہی بنے تھے۔ مرزا غالب کا اس وقت تک قلعہ سے تعلق محض برائے نام تھا اور وہ انگریزوں سے کافی حد تک متوازی تعلقات بنا چکے تھے، اس پر بھی جب انھیں جنگ آزادی فرو ہونے پر انگریز بہادر کے سامنے قلعہ سے اپنے تعلقات کی وضاحت کرنا پڑی تو موصوف نے بذلہ سنجی کا سہارا لے کر اپنے نصف ایمان کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ انھیں یہ کہہ کر جان بخشی کروانا پڑی کہ میں تو آدھا مسلمان ہوں: شراب پیتا ہوں اور سؤر نہیں کھاتا۔ اس معذرت خواہانہ طرزِ استدلال کو پروفیسر فتح محمد ملک نے ''ہندی مسلمانوں کی غلامی کا اولین باب'' کہا ہے۔[۲۶] غالب نے تو اس واقعہ کے بعد شعری تخلیقات کا عمل بہ وجہ روک دیا اور ان کے سوانحی سیاق و سباق کو مدِ نظر رکھیں تو اس امر کی مصلحت بھی بہ آسانی واضح ہو جاتی ہے مگر داغ یہاں ایک لحاظ سے غالب کا تکملہ ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے معاصر منظر نامے کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا بھرپور حصہ بنایا۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کی مخصوص طرزِ اظہار اپنانے کے اسباب کا تذکرہ بھی ہے اور اپنے اشعار کی سماجی معنویت سمجھنے کی دعوت بھی مگر گردشِ ایام ایسی ناموافق ٹھہری کہ انھیں سوانحی تنقید کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان کے کلام کو حقیقت نگاری کے جدید شعری پیمانوں کے لحاظ سے محض دل بہلاوے کی سرگرمی ٹھہرایا گیا حال آں کہ کلاسیکل دور کی غزل میں عشقیہ طرز کی بیانیہ انداز پر فوقیت مسلمہ شعریات کے عین مطابق تھی۔ مقتدر کلامیے سے ہم آہنگ مقدمہ حالی میں جس کلاسیکل اردو غزل کے خلاف استغاثہ تیار کیا گیا تھا اس کا سب سے مثالی ہدف کلامِ داغ ہی بنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوآبادیاتی دور کے نصف اول میں جب مقتدر کلامیہ پورے زوروں پر تھا، اردو ادب کا یہ مقبول عام شاعر اپنے بھرپور مزاحمتی بیانیے کے باوجود نہ صرف چھان بورا سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا بل کہ حقیقت نگار مکتبِ فکر کے دانش ور ''داغی اشعار'' کو سماجی بے نیازی کا مثیل بنا کر پیش کرتے رہے۔ اس مکتب

گرنے اگر علامت نگاری کی جدید تحریک کے رمزیہ اسلوب کو کچھ تسلیم بھی کیا ہے تو یہ محض ۴=۲+۲
کے معادل تھا۔ علامت میں ایک خاص طرح کا اشاری قرینہ موجود ہوتا ہے جس سے کشفِ متن کا
عمل زیادہ پیچیدگی کا شکار نہیں ہوتا۔ مثلاً دہکتے کوئلوں سے گزرنا پاک دامنی کا اشارہ ہے تو پَو کا پھٹنا
حصولِ آزادی کا تمثیل، شام زوال کی غماز ہے تو شفق کا غازہ انقلاب کا نقیب، مگر غزل کے اشاری
بیانے علامت سے ماورا خصوصیت بھی رکھتے ہیں؛ انھیں فوق تصور سے مطابقت کی بنا پر فوق رموز
کا اشتقاقی نام دیا جا سکتا ہے یعنی یہ رموز اپنے مشارالیہ سے لے کر متضاد مشارالیہ تک پہنچنے کی
صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً محبوب کہہ کر رقیب مراد لینا اور اس کی تعریف و توصیف کے پردے
میں تنقیدی اظہاریے کو چھپانا یا پھول خوب صورتی کا رمزیہ ہے مگر اس سے بلبل کو زیرِ دام لانے کی
چال بازی اور گل چیں پر رازِ چمن کھولنے کے امکان کا خیال بھی تخلیقی بیانیے میں جوڑا جا سکتا ہے۔
داغ کا کلام ایسی ہی فوق رمزیات سے مزین ہے۔ کلام داغ کی سماجی معنویت سمجھنے کی سب سے
اہم کاوش غالباً سبطِ حسن نے کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا مقالہ ''داغ کی شخصیت اور شاعری'' ایک
قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔

سبط حسن کلامِ داغ کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں: (۲۷)

(۱) قلعہ معلا کا دور

(۲) غدر کا دور؛ جس کے اثرات بہت بعد تک نظر آتے ہیں۔

(۳) ریاستی شاعری کا دور

۱۸۵۷ء کا معرکہ ہوا تو داغ دہلی میں تھے۔ آخری مغل بادشاہ کی بے کسی اور انگریز حیلہ
گروں کی ظلم و زیادتی کے مناظر انھوں نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیے ہوں گے۔ باپ کی پھانسی
کے بعد یہ ان پر ٹوٹنے والی دوسری قیامت تھی اور ہر دو کی قوتِ محرکہ برطانوی استعمار تھا۔ یقیناً
انھوں نے اس خونی معرکے کا بھرپور اثر لیا اور ان کے شعری نشانات تادیر ان کے قلم سے ٹپکتے
رہے؛ اس سلسلے کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے (۲۸)

برنگِ حسرت، مثالِ ارماں جو آ گیا یاں سے پھر نہ نکلا
رہے گا سینے میں تیر تیرا اسیرِ قیدِ فرنگ ہو کر (۲۹)

ذبح کر ڈالا اک اک سخت جاں کو ڈھونڈ کر
آج کل ہے تیز لوہا خنجرِ فولاد کا (۳۰)

بے سبب جس نے نکالا مجھے اپنے گھر سے
کاش وہ آ کے مرا دل بھی نکلتا دیکھے (۳۱)

دل ہے تنہا، یہ لڑائی کیسی
فوجِ مژگاں نے پرا باندھا ہے (۳۲)

ایک نو آبادکار استعماری قوت اپنے مفتوحہ علاقے میں مزاحمتی گروہ کی سرکوبی کے لیے ظلم وستم کا جو بازار گرم کرتی ہے اس کی مثالیں جنگ آزادی کی تواریخ، آثار اور اس دور کے روزنامچوں وغیرہ میں عام دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس جنگ کے پس منظر میں داغ کے یہ اشعار بڑے گہرے سیاسی شعور کے ترجمان ہیں:

کون سا طائر گم گشتہ اسے یاد آیا
دیکھتا بھالتا ہر شاخ کو صیاد آیا (۳۳)

ہوئے ہیں عشق میں عشاق رسوا چار سو کیا کیا
مٹی ہے آبرو والوں کی اس میں آبرو کیا کیا (۳۴)

مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور اس کے عزیز واقارب کی بے چارگی

اور درماندگی کے نشانات بھی ملاحظہ فرمائیں:

میت بھی ہماری نہ رہی کوچے میں ان کے
وہ کہتے ہیں رکھوا سے لے جا کے کہیں اور (۳۵)

داغ نے خطِ غلامی جو دیا فرمایا
ایسے ہی لوگ وفا دار ہوا کرتے ہیں (۳۶)

دل میں گھر یار کے پیکان کیے بیٹھے ہیں
مجھ پہ قبضہ مرے مہمان کیے بیٹھے ہیں (۳۷)

نہ گڑنے دی مری میت کئی دن
نہ چھوڑی بدگمانی بدگماں نے (۳۸)

۵۷ء کا معرکہ اوّل اوّل ہندوستانی عوام کی امیدوں کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ بہت جلد برطانوی استعمار سے نجات حاصل کر کے مقامی اقتدار کی ساکھ بحال کرنا چاہتے تھے مگر اہلِ نظر اس کاوش کو جذباتی اور ناموزوں خیال کرتے ہوئے اس کی کام یابی کے لیے زیادہ پرامید نہیں تھے۔
اس جنگ کے اختتامی منظرنامے پر یہ اشعار دیکھیں:

مجھ سے نفرت کس قدر ہے اس بتِ بے مہر کو
گنجفے میں بھی ورق رکھا نہ میری یاد (۳۹)

وعدہ جھوٹا کر لیا، چلیے تسلی ہو گئی
ہے ذرا سی بات خوش کرنا دل ناشاد کا (۴۰)

جب ریاست اپنی آبائی مٹی
نوکری کی ہم کو حاجت ہو گئی (۴۱)

جیسا کہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ نو آبادیاتی دور میں عشقیہ غزل کے کردار سیاسی مصلحت کے تحت بالخصوص نئی معنویت سے ہم کنار کیے گئے تھے۔ داغ کے ہاں حسن و عشق کا یہ اشارتی نظام سب سے منظم صورت میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ اسی لیے کلامِ داغ کی کرب ناک داخلی کیفیت ظاہری معاملہ بندیوں کے تناظر میں اور بھی کاٹ دار تاثیر کی حامل ٹھہرتی ہے۔ فراق نے اسی حوالے سے لکھا تھا کہ:

"افسوس داغ کی بولی کے پیچھے جو دنیائے خیال ہے وہ حسین نہیں ہے اگرچہ کبھی کبھی لیکن صرف کبھی کبھی وہ بہت حسین بھی ہے۔" (۴۲)

مثال کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں جو بہ ظاہر معاملہ بندی کے مختلف پہلوؤں کے عکاس ہیں مگر فی الاصل ان میں سماجی شعور کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں (۴۳)

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے (۴۴)

دل کے سو ٹکڑے ہوئے تن کو خبر تک نہ ہوئی
چشم بددور، یہ قاتل کی سبک دستی ہے (۴۵)

یہ ہماری تنقید کا جبر ہے کہ بالخصوص داغ کے حوالے سے ایسے اشعار میں مذکورہ ضمائر سے محبوبِ مجازی اور وہ بھی کوئی طوائف ہی مراد لی جاتی ہے جو تعبیر کا محض ایک سطحی قرینہ ہے۔ ایسی کتنی ہی نوبل انعام یافتہ تحریریں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں جہاں بہ ظاہر غیر ادبی نوعیت کے کردار و اماکن کو اعلا ادبی تخلیقات کی بنیاد بنایا گیا ہے مگر ان کے بین السطور ایک تہہ در تہہ سماجی معنویت مستور ہوتی ہے۔ صنفِ غزل میں تو بالخصوص ہمارے الفاظ و تراکیب لغوی معنوں کے بجائے اپنے دورانِ زماں کے خاص نظامِ خیال سے متعلق ہوتے ہیں جیسا کہ بہ قول ڈاکٹر یوسف حسین خاں

ایک غزل گو شاعر ''رمز میں کچھ چھپاتا ہے اور کنائے میں کچھ بتاتا ہے۔''(۴۶) مزید برآں داغ کے زمانے تک طوائف یا رنڈی کو آج کے ایسا معیوب معاشرتی کردار نہیں سمجھا جاتا تھا اور قدیم نسخوں میں ''رنڈی'' کا لفظ بہ معنی عورت بھی مستعمل رہا ہے۔(۴۷) ویسے بھی طوائف اس دور میں شاعری کے فروغ اور ترویج کا اہم ترین ذریعہ تھی۔ یوں اگر طرزِ اظہار میں اس کردار کی رعایت کے اشارے سے ملتے ہیں تو ان کی اہمیت مراعاۃ النظیر سے زیادہ نہیں بنتی لہٰذا کلیدی معنویت اصطلاحی نظام ہی سے مرتب ہوتی ہے۔ دراصل غزل کے محبوب اور حاکم وقت کی بعض بدیہی خصوصیات انھیں رمز و کنایہ کے یکساں نظامِ اظہار میں لانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''غزل کے محبوب میں بادشاہ، خدا اور طوائف کی صفات یکساں رہی ہیں اور تصورِ محبوب کی پیش کش سے شعرا اپنے عہد کے سیاسی، مذہبی اور جنسی استحصال کو بے نقاب کرنے اور ان کے خلاف شدید احتجاج کرنے میں مصروف رہے ہیں۔''(۴۸)

حقیقت تو یہ ہے کہ داغ نے اگر طوائف کے خصوصی مخاطبے میں بھی غزل کہی ہو تو اس کے رمز و کنایہ سے مرتب ہونے والے مربوط نوآبادیاتی شعور کو قابلِ ترجیح تعبیری امکان مانا جائے گا۔ بسا اوقات ان کے شعروں میں مشبّہ کا ذکر ہوتا ہے نہ مشبّہ بہ کا، مگر کوئی خاصیت ایسی مہارت سے ہر شعر میں رکھ دی جاتی ہے کہ مفہوم اپنا حقیقی جلوہ دکھائے بن نہیں رہتا۔ یقیناً یہ استعارہ کی اعلا ترین قسم ہے۔ آپ کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن سے نوآبادیاتی کلامیے کے زیرِ اثر داغ کی ساختہ شخصیت، ان کے حسب نسب سے متعلق تحقیق کاروں کے انکشافات اور شاعر کے معمولات زندگی نکال کر ذیل کے اشعار پڑھیے: یہ کلام کسی دلی کے لونڈے کی ادائیں یا بازارِ حسن والوں کی تانک جھانک کا منظر پیش کرنے کے بجائے نوآبادکاروں کے مکر و فریب اور سیاسی کارستانیوں کا بلیو پرنٹ پیش کرنے لگے گا:

تعجب ہے کہ اس بیداد پر بھی
تجھے اچھا کہا سارے جہاں نے(۴۹)

تو نے ایسے بگاڑ ڈالے ہیں
ایک کی ایک سے نہیں بنتی (۵۰)

مرض پیدا کیے لاکھوں دوا سے
مسیحا ہے ہمارا چارہ گر بھی (۵۱)

کہتے جاتے ہیں آپ سب کو برا
اور کہہ کر مکرتے جاتے ہیں (۵۲)

کس کی طاقت ہے کرے کوئی برائی آپ کی
ساری دنیا آپ کی، ساری خدائی آپ کی (۵۳)

ان اشعار میں مستعمل ضمائر داغ دہلوی کے مخصوص اشاری نظام میں ڈھل کر مختلف استعاری کرداروں کی نمائندگی کا فرض نبھا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ میر تقی میر کی طرح داغ نے بھی اپنے کلام کی بین السطور معنویت کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے:

مرے ہر لفظ خط میں دو ہیں پہلو
نہ کیوں ہوں دو زبانیں ہیں قلم کی (۵۴)

ہیں مجازی سے حقیقت آشنا
پہنچے ہیں اس راہ میں اس راہ سے (۵۵)

سرود و نغمۂ مطرب کی آوازیں تو دل کش ہیں
مگر میری زباں اس کے سوا کچھ اور کہتی ہے (۵۶)

اسی طرح کلامِ داغ سے کئی ایسے اشعار بھی نشان زد کیے جا سکتے ہیں جن میں ان کے فکر انگیز فلسفۂ کلام کی وضاحت ملتی ہے۔ ایسے منطقی طرزِ کلام کی روشنی میں احسن مارہروی کی یہ رائے کہ داغ کی شاعری عیاشانہ، سوقیانہ یا جاہلانہ نہیں بل کہ زمانے کے حسب حال اور موجودہ طبائع کا فوٹو ہے، (۵۷) محض شاگردانہ عقیدت کے بجائے عین حقیقت کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔

داغ نے اپنے تخلیقی اظہاریے کے لیے عشقیہ غزل کا جو قرینہ استعمال کیا تھا اس میں معاصر دور کے استحصالی نظام پر جامع نقد و نظر کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ ان کی غزلیں بہ ظاہر روایتی جمالیات کا سرمایہ خیال کی جاتی ہیں مگر یہاں بین السطور مزاحمتی کلامیے کا پورا نظام موجود ہے۔ وہ فرنگی تہذیب کی خامیوں پر طنز بھی کرتے ہیں اور اس کے مثبت پہلوؤں کا اعتراف بھی۔ نوآبادکار کی خفیہ حکمت عملی جاننے کے لیے داغ کی سنجیدہ فکر و نظر ایسے اشعار سے مترشح ہے:

سمجھنے والے سمجھتے ہیں پیچ کی تقریر
کہ کچھ نہ کچھ تری باتوں میں نی نکلتی ہے (۵۸)

اس شوخ و دغاباز کا کھلتا نہیں کچھ بھید
جب تک اسے باتوں میں ٹٹولا نہیں جاتا (۵۹)

ایک نوآبادکار اپنی نوآبادیوں میں ایسے نظامِ استدلال کی ترویج و اشاعت کرتا ہے جس سے مقامی تہذیب از کار رفتہ اور غیر افادی جب کہ اس کی اپنی متعارفہ طرزِ معاشرت خوبیوں کا مجموعہ نظر آنے لگے۔ اس کلامیے کی پذیرائی سے مقامی لوگوں کے فکر و عمل میں ایسی ہی اساسی تبدیلی راہ پانے لگتی ہے، جس کی زیرِ بحث دور میں مثالیں ملٹن، مل اور میکالے کی تعلیمات سے فروغ پانے والے حالی کے بعض علمی و ادبی تعقلات اور سرسید یا ڈپٹی نذیر احمد کا اپنی تحریروں میں رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو ''محمد صاحب'' اور ''پیغمبر صاحب'' جیسے القابات سے یاد کرنے کے واقعات ہیں۔ یہ فکریات اور اسلوب بیان ہے تو ہمارے اپنے اکابرین کا: ''ولیکن قلم درکفِ دشمن است۔'' داغ اس قسم کے نظامِ خیال کی تشکیلات اور انگریز کے استحصالی ہتھکنڈوں کی گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کہتا ہے زمانے سے برا مجھ کو وہ ظالم
کس کس کو مری لکھ کے برائی نہیں دیتا (۶۰)

یہ کہہ کے مجھ کو کیا قائل اس کے درباں نے
وہ اپنے گھر کا کریں انتظام بھی کہ نہیں (۶۱)

اس کو آیت حدیث کیا سمجھیں
جو تمھاری زبان سے نکلا[۶۲]

جور سے یا لطف سے پورا کیا
آپ پیچھے پڑ گئے جس کام کے[۶۳]

اس طرح کے طنزیہ اشعار ہجو ملیح کے انداز میں بھی بہ کثرت ملتے ہیں۔ کلام داغ کی کاٹ دار معنویت کا ذکر کرتے ہوئے فراق گورکھ پوری لکھتے ہیں:

''مغلیہ خاندان کی تلوار کی فاتحانہ شان اور چکا چوند پیدا کرنے والی چمک دمک جب زندگی اور جذبات کی تاریک پستیوں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے تو وہ داغ کی شاعری بن جاتی ہے۔''[۶۴]

مغربی تہذیب پر تنقید کے ساتھ ساتھ داغ کے ہاں یورپ کے ترقی پسندانہ رجحانات کی پزیرائی کا عندیہ بھی ملتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کے مقابل جدید سرمایہ دارانہ نظام کو جس میں ترقی، خوش حالی اور آزادہ روی کے نسبتاً زیادہ امکانات ہیں، داغ نے غالب ہی کی طرح خوش آئند جانا تھا یا نہیں؛ تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کے کلام میں دیسی نظمِ حکومت کا شکوہ اور نئے نظام کی خوبیوں کا اعتراف بھی ملتا ہے:

کون سا آرام پایا آج تک
کیا کروں جائے اگر جاتا ہے دل[۶۵]

وہ رنج اٹھائے ہم نے اگر کوچہ آپ کا
دارالسلام ہے تو ہمارا سلام ہے[۶۶]

قرینے سے عجب آراستہ قاتل کی محفل ہے
جہاں سر چاہیے سر ہے جہاں دل چاہیے دل ہے[۶۷]

داغ اس بات کے شدت سے قائل تھے کہ فرنگی استعمار کے ہندوستان پر قابض ہونے میں مقامی حکمرانوں کی نااہلی اور غفلت شعاری نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ایک بالغ نظر ادیب کی طرح انھوں نے مغل حکمرانوں کی ناقص منصوبہ بندی، باہمی انتشار، ریاستی امور میں فرنگی مشارکت اور مختلف ریاستوں میں انگریز ریذیڈنٹ کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ پر کھل کر تنقید کی ہے: اس ضمن میں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

غیروں سے التفات پہ ٹوکا تو یہ کہا
دنیا میں بات بھی نہ کریں کیا کسی سے ہم (۶۸)

خط غیر کا پڑھتے تھے جو ٹوکا تو وہ بولے
اخبار کا پرچہ ہے خبر دیکھ رہے ہیں (۶۹)

پان لگ لگ کے مری جان کدھر جاتے ہیں
یہ مرے قتل کے سامان کدھر جاتے ہیں (۷۰)

رقیب اور وفادار پھر یقیں اس کا
مٹے ہوئے ہیں ترے رنگ اعتبار سے ہم (۷۱)

سمجھ سوچ کر دل دیا ہم نے ان کو
کوئی آفتِ ناگہانی نہیں ہے (۷۲)

غیر یوں میرے سامنے بیٹھے
پاس تھا مجھ کو آپ کا کہ نہیں (۷۳)

زہے تقدیر کس آرام و راحت سے وہ بسمل ہے
کہ جس کے سر کا تکیہ دیر سے زانوے قاتل ہے (۷۴)

جنگ آزادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی داغ رام پور چلے گئے۔ (۷۵)☆ اس وقت یہاں نواب یوسف علی خاں (۱۸۶۵-۱۸۵۵ء) کی حکومت تھی جو اہلِ ادب کے بڑے مربّی تھے۔ یہاں داغ کی بسر اوقات بہ آسانی ہونے لگی۔ انھیں نواب کا خصوصی مصاحب ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ نواب یوسف علی خاں کی رحلت کے بعد جب ان کے بیٹے نواب کلب علی خاں نے ریاست سنبھالی تو انھوں نے داغ کو اپنا داروغۂ اصطبل مقرر کر دیا۔ تمام سرکاری مشاعرے اب انھی کی زیرنگرانی ہونے لگے۔ جب نواب صاحب ۱۸۷۲ء میں حج پر گئے تو داغ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس مقدس فریضے سے متعلق کلامِ داغ میں بہت سے عقیدت مندانہ اشعار ملتے ہیں۔

قیامِ رام پور کا معروف ترین واقعہ یہاں کے میلہ بے نظیر میں کلکتہ کی طوائف منّی بائی حجاب سے داغ کی ملاقات ہے۔ یہ عشقیہ وقوعہ ۱۸۷۹ء میں ہوا جب یہ اڑتالیس سالہ شاعر متعدد بیماریوں میں مبتلا رہ کر ایک ادھیڑ عمر آدمی بن چکا تھا۔ (۷۶) داغ نے انھیں اپنے حرم میں لانا چاہا مگر موصوفہ بہ وجہ رضامند نہ ہوئیں۔ مرزا نے یہ تمام داستان شوق اپنی مثنوی فریادِ داغ میں بیان کر دی ہے تاہم یہی وہ واقعہ ہے جسے ان کے دیگر سوانحی آثار سے مربوط کر کے ہمارے اکثر ناقدین ان کی ادبی نگارشات کا عمومی سیاق مرتب کرتے اور اپنی روایتی شرح و تعبیر کو مدلل بناتے آئے ہیں۔ داغ کی طبعی شرافت، صوم و صلات اور دیگر احکام شریعت کی پابندی، حب الوطنی کا غیر متزلزل جذبہ، مقتدر قوتوں کے قہر و غضب کا خصوصی ہدف ہونے اور اپنے دور کی بے مثال استادانہ مقبولیت کمانے جیسے امور کو اس قسم کا یک طرفہ تاثر قائم کرنے والے حضرات قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے یک رخے تاثر کو گہرا کرنے میں انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے شروع ہونے والی نیچرل شاعری کی تحریک اور بالخصوص حالؔی کے مقدمۂ شعر و شاعری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مغربی کلامیے سے ہم آہنگ حالؔی کے تجویز کردہ اس ضابطۂ شعر و سخن میں روایتی رمز و کنایہ کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی حال آں کہ مشرقی شعریات میں روایت کو زمانۂ ماضی کی کوئی چیز سمجھنے کے بجاے ایک نامیاتی قوت کا درجہ حاصل رہا ہے جو اپنے جلو میں حال کی ترجمانی اور مستقبل کی عکس بندی کا بھرپور امکان رکھتی ہے۔ الغرض حالی کے مقدمات کی پیروی میں درحقیقت پیروی مغرب کی روش

آباد ہوئی اور حسن وعشق کے روایتی رمز و کنایہ کو سیاست و معاشرت کا رد عمل سمجھنے کے بجائے سمت خیال کیا جانے لگا۔ اس دور میں صنفِ غزل کی شدید مخالفت کے ساتھ ساتھ مشرقی شعریات میں بھی بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ آگے چل کر یہ تغیر و تبدل اردو غزل کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا مگر سرِدست اس منصوبہ بندی کی نچلی تہوں میں استعماری ذہن بہ ہر طور کارفرما تھا جس کی غرض و غایت صرف اس قدر تھی کہ غزل کی شعریات جو زبان کو رمز و کنایہ کی تہ در تہہ معنویت کا خزینہ دار بناتی ہے اور جس پر مقتدر قوت کا کسی صورت اجارہ قائم نہیں ہو پاتا، یک سطحی اور شفاف بنا کر اپنے انتدابی نظام کے لیے قابلِ قبول بنائی جائے۔ ایسی صورت حال میں داغ کے کلاسیکل اسلوبِ غزل کا ہدف تنقید بننا باعث حیرت نہیں رہتا۔ البتہ جب ہم ان کے احوال و آثار کا پوری معروضیت سے جائزہ لیتے اور ان کے کلام میں پائے جانے والے بین السطور فکری نظام کو سمجھتے ہیں تو اس کلام کی صحیح اہمیت ہم پر واضح ہونے لگتی ہے۔

داغ نے جن حالات میں رہتے ہوئے معاصر مزاحمتی کلامیے کو اپنی شعری تخلیقات کا حصہ بنایا ہے اس کی نظیر لانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں کی پھانسی کا واقعہ ہو یا ۱۸۵۷ء کا معرکہ، ہر دو میں ان کا فرنگی عتاب کی بھینٹ چڑھنا بعید از امکان نہ تھا۔ رام پور میں انھوں نے اپنی زندگی کے تیس سال بافراغت گزارے مگر یہ قلق ضرور تھا کہ ان کے سرپرست انگریز ریزیڈنٹ کے تابع مہمل بنے ہوئے تھے۔ ۱۸۸۷ء کے بعد جب وہ میر محبوب علی خاں کی دعوت پر دکن چلے گئے تو وہاں کے حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ اس وقت کی تقریباً پانچ سو ہندستانی ریاستوں میں سے یہ ریاست بدترین فرنگی استبداد کا شکار تھی۔ اگر دیگر رئیسانِ ریاست ہز ہائی نس (His Highness) کہلاتے تھے، تو نظام دکن کو ہز ایگزالٹڈ ہائی نس (His Exalted Highness) کہا جاتا تھا۔[۷۷] اب ایسے درباروں میں جہاں حقیقی حاکم انگریز گورنر جنرل کے مقرر کردہ ریزیڈنٹ ہوں، داغ بے چارہ مقدمۂ حالی سے ہم آہنگ نیچرل طرز اظہار میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے سے تو رہا۔ لہٰذا انھوں نے اپنی فکریات کی ترسیل و ابلاغ کے لیے حسن وعشق کے روایتی رمز و کنایہ کی منہاج ہی اختیار کی اور بلاشبہ یہ اسی روایتی طرز

بیان کے انتخاب کا ثمرہ ہے کہ نوآبادیاتی دور کے نصف اوّل میں مقتدر کلامیے کی تردید اور عوامی جذبات واحساسات کی ترجمانی میں کوئی شعری یا نثری متن ان کے کلام کی برابری نہیں کرسکتا۔ قیام حیدر آباد کے دوران میں لکھے چند اشعار دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ آیا ان کی صحیح معنویت کسی مجازی محبوب یا طوائف کے تخاطب میں کھلتی ہے یا روے سخن نظام دکن اور اس کے ساتھ براجمان ریزیڈنٹ کی طرف ہے؛ ہر شعر سے فیصلہ نکلتا ہے:

حال پہلو بچا کے لکھا ہے
تاڑ جائے وہ نکتہ چیں نہ کہیں
کیوں کہیں تجھ سے آرزوئیں ہم
فائدہ کیا کہیں کہیں نہ کہیں (۷۸)

قتل جس کا تمھیں ہے مدّنظر
وہ گنہ گار ہوں ہمیں نہ کہیں
داغؔ پھر تاک جھانک کرتے ہیں
اب گھرے اب پھنسے کہیں نہ کہیں (۷۹)

ان اشعار کے بین السطور پائے جانے والی سیاسی شعور کی تیز رو کو ملحوظ رکھیں تو داغؔ ایسے قادر الکلام شاعر کے متعلق اکبر کی یہ رائے بہ ہر حال محل نظر ٹھہرتی ہے کہ ''وہ (داغؔ) دلوں کو بے چین نہیں کرسکتا ان کو لٹریری تعجب میں محو کیا چاہتا ہے۔'' (۸۰)

مرزا خان داغ غزل کے باکمال مزاج شناس تھے۔ اس صنف کی لطیف شعریات میں رہتے ہوئے انھوں نے اپنی ادبی ذمہ داری پورے خلوص سے نبھائی ہے۔ یہ کہنا عین بہ جا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شاعر نے غزل کی روایتی رسومیات پامال کیے بغیر نوآبادیاتی صورتِ حال میں اپنے افکار کی بھرپور ترجمانی کی ہے تو وہ داغ دہلوی ہیں۔ داغؔ کی عظمت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے نہایت ناسازگار حالات میں رہ کر بھی ہندوستانی عوام کے جذبات کی بھرپور ترجمانی

کی ہے۔ ان کی غزلوں میں بیسیوں ایسے اشعار ہیں جن میں برطانوی استعمار کے خلاف بھرپور مزاحمتی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے جذبہ حب الوطنی کے فروغ، مسلح جدوجہد کی ترغیب، استعماری قوت کے زوال کی اولین پیشین گوئیاں اور مستقبل میں مشرقی قیادت کے دوبارہ ابھرنے کی ترجمانی کی گئی ہے؛ چند اشعار بہ طور مثال:

کر گیا تاثیر نالہ بلبلِ ناشاد کا
ہاتھ لینا پاؤں اب جمتا نہیں صیاد کا (۸۱)

ہو اثر اتنا تو سوزِ نالہ و فریاد کا
ہم تماشا دیکھ لیں گھر پھونک کر صیاد کا (۸۲)

اپنی پہچان کو قیامت میں
کیجیے کچھ نشان دشمن پر (۸۳)

لذتِ سیر اگر چشم تماشا لے گئی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی (۸۴)

ایسے اشعار سے ظاہر ہے کہ داغ دہلوی اپنے عہد کے گھمبیر سیاسی و سماجی مسائل میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے۔ یہ بات ضرور ہے کہ ان کے کلام میں کسی منظم فکر یا اپنی غلام قوم کے لیے کوئی واضح سیاسی منشور نہیں ملتا اور نہ ہی ابھی تک شعر و ادب میں کسی اجتماعی فکر و عمل کی ترجمانی کا کوئی رجحان موجود تھا تاہم انھوں نے اس کش مکش اور تناؤ بھرے ماحول میں اپنا تخلیقی فریضہ پوری ادبی دیانت داری سے نبھایا ہے۔ داغ کے کلام کی معنوی تعیین میں ان کی حیاتِ معاشقہ کا عمل دخل بھی ضرور ہے مگر زندگی میں پیش آنے والے ایسے جمالیاتی واقعات کو ان کے فکر و عمل کا واحد ماخذ خیال کرنا اور اس کے برعکس نوآبادیاتی معاشرت میں ان کی حساس سماجی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے استظامِ خیال کے موثر ترین محرکات سے بے نیازی برتنا انتقادی دیانت کو اپنے ہاتھ

سے دینے کے مترادف ہے۔ داغ کی غزلوں کا مخصوص لحن، اشعار کی بین السطور نشتریت اور بلیغ دستاویزی رعایتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان میں کسی نازنیں سے مخاطبت کے بجائے فرنگی سامراج کے استحصالی ہتھکنڈوں، عوام کی سماجی محرومیوں اور اس پر آشوب دور غلامی سے نجات کی ممکنہ صورتوں کی ترجیحی بنیادوں پر ترجمانی کی گئی ہے۔ الغرض داغ کی غزلیں نوآبادیاتی دور میں استعماری قوتوں اور مقامی لوگوں کے باہمی سیاسی وثقافتی رشتوں کی مکمل تفہیم میں ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اکبر کی غزل گوئی۔۔۔نوآبادیاتی تناظر میں

نوآبادیاتی دور کے سیاسی امور کے سلسلے میں اکبر کا سرمایۂ غزل بھی کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ یوں تو اس ضمن میں چکبست اور اقبال نمایاں تر ہیں مگر جس تیکھے اسلوب میں اکبر نے استعماری سیاست کا کچا چٹھا کھولا اور اپنی قوم کو نوآبادکار کی چیرہ دستیوں سے آگاہ کیا ہے، اس کی نظیر لانا مشکل ہے۔(۸۵)

اکبر سے ماقبل اُردو شاعری زیادہ تر سرکار دربار سے وابستہ چلی آرہی تھی۔ اس بات میں شبہ نہیں کہ صاحب الرائے شعرا یہاں بھی خیالات کے آزادانہ اظہار میں اپنے سرپرست شاہ و سلطاں کو خاطر میں نہ لاتے اور رمزو کنایہ کے پیرائے میں سیاسی امور پر اپنے موقف کا کھل کر اظہار کرتے رہے تاہم ان کا داخلی اسلوب بہ ہر حال ایسے خیالات کی پردہ داری کا وسیلہ بن جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی وسماجی حالات بھی بدلے اور نتیجتاً شعروادب کے تقاضے بھی۔ حکومت انگلشیہ نے جن ریاستوں کی ''آزادیاں'' بحال رکھی تھیں وہاں بھی انگریزی بالادستی کا تاثر عوام و خواص کے شعور کا حصہ بن چکا تھا۔ یہاں کے سربراہان ریاست کا تمام تر انتظام وانصرام انگریزوں کی سیاسی مصلحت پر قائم تھا۔ ان ریاستوں میں فروغ پانے والی فنونِ لطیفہ کی سرگرمیاں بھی دراصل حاکم وقت کے دربار میں پیش کیا جانے والا عاجزانہ خراج تھا جس کے بدلے ریاستی زندگی کے لیے رحم کی اپیل کی جاتی تھی۔ ان ریاستوں کے والیان ہرگز اس بات کے روادار نہ تھے کہ ان کے ہاں سے مزاحمتی کلامیے کی بھنک بھی انگریز سرکار کے کانوں تک پہنچے، لٰہذا ان ایوانوں سے وابستہ شعرا نے اپنے مزاحمتی خیالات خاصے ڈھکے چھپے انداز میں پیش کیے ہیں۔ اکبر کا نمایاں ترین غزلیہ اختصاص یہی ہے کہ انھوں نے براہ راست انگریزی ملازمت کے باوجود مزاحمتی کلامیے کی ترجمانی میں سب سے بڑھ کر دوٹوک رویہ اختیار کیا۔ بلاشبہ علی گڑھ جیسی مصلحت اندیش تحریک کے دور میں انھیں مزاحمتی رجحان کا ممتاز ترین رہنما کہا جاسکتا ہے۔

اُردو غزل میں نوآبادیاتی استحصال پر ایسی بے باکانہ تنقید اکبر سے قبل بہت کم ملتی ہے۔ ہمارے ناقدین نے موصوف کا ادبی مقام بالخصوص بہ طور غزل گو متعین کرنے میں کافی تساہل سے کام لیا ہے۔ اس تنقیدی کم شناسی کے جملہ اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دور بالعموم سرکاری پالیسیوں کی بنا پر اردو نظم سے مخصوص ہو چلا تھا لہٰذا اکبر کی شاعرانہ پہچان بھی غزل کے بجائے ایک نظم گو شاعر کے طور پر کی گئی تھی۔ المیہ یہ رہا کہ اس ضمن میں بھی انھیں محض ایک فکاہیہ نگار اور طنز شاعر کے طور پر متعارف کروایا گیا لہٰذا ہر دو حیثیات میں ان آرا سے صرفِ نظر کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

”اکبر کے خیالات کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیں تو مغرب کی مخالفت میں سستی جذباتیت اور سطحیت ملتی ہے۔ اس لیے اقبال کی طرح وہ مغربی تہذیب کے اندرونی انتشار اور ظاہری چمک میں پوشیدہ داخلی تضادات کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو اقبال کی طرح فلسفہ کا گہرا شعور تھا اور نہ تخیلی نگاہ۔۔۔ اکبر کو First Hand معلومات نہ تھیں،،(۸۶)

اسی طرح ڈاکٹر محمد صادق نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"To him, the past was sacred and above criticism, and this spirit of reverence was not only confined to religion, it spread to every thing savouring of the past; to poetry, literature, dress, education; in short to every secular thing that had come down from the old world"(87)

اکبر کے متعلق اس نوع کی تنقیدی آرا ☆ اختلاف کی گنجائش سے مستثنا نہیں مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر کے ظریفانہ طرزِ سخن کی نفسیاتی وجوہات مذید اعتنا کی مقتضی ہیں۔ علاوہ ازیں ان پر سستی جذباتیت اور سطحیت کی مہر ثبت کرنا بھی عجیب سا لگتا ہے۔ اکبر نے نہ صرف خود عربی، فارسی اور انگریزی میں حسبِ ضرورت دست رس پیدا کر لی تھی بل کہ ان کا خاندان بھی روشن خیال اور علمی و ادبی ذوق کا حامل تھا۔ ان کے پردادا فوجی سروس میں صوبے دار کے عہدے پر

اُردو غزل میں نوآبادیاتی استحصال پر ایسی بے باکانہ تنقید اکبر سے قبل بہت کم ملتی ہے۔
ہمارے ناقدین نے موصوف کا ادبی مقام بالخصوص بہ طور غزل گو متعین کرنے میں کافی تساہل سے کام لیا ہے۔ اس تنقیدی کم شناسی کے جملہ اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دور بالعموم سرکاری پالیسیوں کی بنا پر اردو نظم سے مخصوص ہو چلا تھا لہٰذا اکبر کی شاعرانہ پہچان بھی غزل کے بجائے ایک نظم گو شاعر کے طور پر کی گئی تھی۔ المیہ یہ رہا کہ اس ضمن میں بھی انھیں محض ایک فکاہیہ نگار اور ہنسوڑ شاعر کے طور پر متعارف کروایا گیا لہٰذا ہر دو حیثیات میں ان آرا سے صرفِ نظر کرنا مشکل نظر آتا ہے۔
ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اکبر کے خیالات کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیں تو مغرب کی مخالفت میں سستی جذباتیت اور سطحیت ملتی ہے۔ اس لیے اقبال کی طرح وہ مغربی تہذیب کے اندرونی انتشار اور ظاہری چمک میں پوشیدہ داخلی تضادات کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو اقبال کی طرح فلسفہ کا گہرا شعور تھا اور نہ تخیلی نگاہ۔۔۔ اکبر کو First Hand معلومات نہ تھیں۔''(۸۶)

اسی طرح ڈاکٹر محمد صادق نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"To him, the past was sacred and above criticism, and this spirit of reverence was not only confined to religion, it spread to every thing savouring of the past; to poetry, literature, dress, education; in short to every secular thing that had come down from the old world"(87)

اکبر کے متعلق اس نوع کی تنقیدی آرا ☆ اختلاف کی گنجائش سے مستثنا نہیں مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر کے ظریفانہ طرزِ سخن کی نفسیاتی وجوہات مزید اعتنا کی مقتضی ہیں۔ علاوہ ازیں ان پر سستی جذباتیت اور سطحیت کی مہر ثبت کرنا بھی عجیب سا لگتا ہے۔ اکبر نے نہ صرف خود عربی، فارسی اور انگریزی میں حسبِ ضرورت دست رس پیدا کر لی تھی بل کہ ان کا خاندان بھی روشن خیال اور علمی و ادبی ذوق کا حامل تھا۔ ان کے پردادا فوجی سروس میں صوبے دار کے عہدے پر

خدمات سر انجام دیتے رہے جب کہ ان کے دادا صدر دیوانی کلکتہ میں طبقۂ خواص کے مقدمات کی پیروی کیا کرتے تھے۔ (۸۸) والد کا نام سید تفضل حسین تھا اور انھیں علوم شرقیہ پر کامل دست گاہ حاصل تھی۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم بھی انھی کی زیر نگرانی ہوئی۔ (۸۹) وہ بھلے خود انگریزی زبان سے زیادہ لگاؤ نہ رکھتے تھے تاہم بعض متعصب افراد کی طرح انھیں اس کے حصول میں کچھ عار محسوس نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے خود اکبر کو الہ آباد کے ایک مشن سکول میں تعلیم کے لیے داخل کروایا مگر اتفاقات زمانہ کے بہ موجب ۱۸۵۷ء کا معرکہ بپا ہوا اور یہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اکبر نے اس تعلیمی ذوق و شوق میں کمی نہ آنے دی اور اپنے طور پر عصری علوم کا حصول جاری رکھا۔ اس ضمن موصوف کے فرزند عشرت حسین لکھتے ہیں:

> "حضرت قبلہ نے مسلسل مطالعے سے کتنی قابلیت بڑھائی، اس کا اندازہ عربی، فارسی اور انگریزی کی ان کتابوں سے ہو سکتا ہے جو حضرت قبلہ کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ حضرتِ قبلہ تلاش روزگار میں بھی مطالعہ کرتے رہے اور روزگار کے زمانے میں بھی مطالعہ کرتے رہے۔ اسکول سے الگ ہو کر حضرت قبلہ نے کلکتہ یونیورسٹی کی انٹرنس تک کی انگریزی کتابیں پڑھیں۔ سائنس، جغرافیہ اور تاریخ کی طرف بھی توجہ کی۔ بنیادیوں پڑی پھر ضرورت اور رغبت کے مطابق روز بہ روز علم میں ترقی ہوتی گئی۔" (۹۰)

اسی تعلیمی قابلیت پر اکبر پہلے ریلوے میں بہ حیثیت کلرک ملازم ہوئے اور پھر عدلیہ میں درجہ سوم کا امتحان پاس کر کے کچھ عرصہ وکالت کی۔ انگریزی اور قانون میں مزید علمی لیاقت پیدا کر کے موصوف درجہ بہ درجہ نائب تحصیل دار، ہائی کورٹ کا مثل خواں، ہائی کورٹ کا وکیل، منصف، سب جج اور پھر جج کے عہدے پر براجمان رہے۔ انھیں بہترین عدالتی خدمات کے اعتراف میں "خان بہادر" کا خطاب بھی ملا تھا۔ (۹۱) اکبر کی شخصیت کا یہ تعلیمی پس منظر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے قومی بل کہ بین الاقوامی احوال و مسائل سے ضروری شد بُد ضرور رکھتے تھے۔ آپ کے کلام میں پائی جانے والی اسی وسعت نظر اور آفاقی شعور کی بہ دولت انھیں "لسان العصر"

کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۹۲) جہاں تک موصوف کے ظریفانہ طرز اظہار کا تعلق ہے، اس کے بہت کچھ اسباب ان کے سوانحی محرکات اور عصری رجحانات میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی زندگی کئی محرومیوں اور تلخ حادثات سے عبارت تھی؛ طبعیت کی حساسیت، خانگی ناچاکیاں، چھوٹی عمر میں شادی کا بندھن اور اولاد بالخصوص بڑے بیٹے عشرت کی آزادہ روی جیسے امور نے انھیں بہت سی تلخیاں عطا کی تھیں۔ اکبر نے ایسے حوادث کا شکار ہوکر مایوسی اور بے چارگی کا اظہار کرنے کے بجاے ان تلخ امور کو ارتفاع سے ہم کنار کرتے ہوئے غالب کی طرح ظریفانہ اسلوبِ سخن اختیار کرلیا۔ عصری تناظر میں دیکھا جائے تو اس دور میں ادبی تخلیقات کا ظریفانہ رجحان ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مختلف شہروں سے شائع ہونے والے پنچ اخبار حکومت کی استعماری اور سماج دشمن پالیسیوں پر تنقید، تہذیب و معاشرت کے بدلتے رجحانات پر حرف گیری اور اصلاح احوال کے لیے مختلف کاوشوں کا اظہار فکاہی انداز میں کررہے تھے۔ ان خبارات میں مدراس پنچ، روہیل کھنڈ پنچ، پنجاب پنچ، بہار پنچ، مذاق اور فرحت الاحباب وغیرہ نمایاں تھے۔ اودھ پنچ بھی اسی سلسلے کا ایک مقبول اخبار تھا۔ اکبر اپنی ابتدائی شاعری میں اسی اخبار سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اس اخبار کی ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات کے دل و جان سے معترف تھے۔ (۹۳) ان امور سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اکبر کا مزاح سطحی یا بے مقصد نہ تھا بل کہ وہ اسے اپنے مخصوص نظام فکر کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آصف اعوان رقم طراز ہیں:

> ''یہ ایک باعث افسوس امر ہے کہ اردو ادب میں اکبر کو عموماً محض ایک ہنسوڑ اور ظریف شاعر کے طور پر ہی متعارف کرایا جاتا ہے مگر ظرافت کے پردے میں ملفوف سنجیدہ شاعری کی طرف توجہ نہیں دی جاتی جو دراصل اکبر کے فکر و نظر کی ترجمان ہے۔'' (۹۴)

اکبر سے قبل بھی انشاء، جراَت اور دیگر کئی قدما کے ہاں مزاحیہ شاعری کی صورت میں تفریحی ادب ملتا ہے مگر اکبر کی فکاہات میں ایک سنجیدہ اور منظم شعوری رو کا ملنا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان کا فکاہی تخیل تفریحی نہیں بل کہ مقصدی ہے۔ (۹۵) ان کے کلام میں سماجی شعور کی ترجمانی

کا اعتراف تو کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر ناقد نے بھی کیا ہے:

''اگر اکبر کی شاعرانہ خوبیاں نہ ہوتیں تو بھی ان کی شاعری ان کے عہد کی سماجی تاریخ کی حیثیت سے کافی اہمیت رکھتی۔'' (۹۶)

اکبر کا عہد نوآبادیاتی صورت احوال کے گھمبیر ترین دنوں سے شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف سلطنت مغلیہ کے انہدام پر پوری ہندوستانی قوم پر سکتہ طاری تھا اور دوسری طرف ان ریاستوں میں جنھیں فرنگی آقاؤں نے بربنائے مصلحت آزاد چھوڑ رکھا تھا، عیش ونشاط کی محفلیں بپا ہو رہی تھیں۔ اس دور غلامی میں آزاد اور مقبوضہ علاقوں کی تقسیم محض برائے نام تھی ورنہ ہر دو جگہ پر مقتدر کلامیہ اپنے اثر ونفوذ میں برابر سرگرم عمل تھا۔ بدیسی حکمرانوں نے مغربی نظامِ حکومت، فلسفۂ تعلیم اور افکار واقدار کے زیر اثر مقامی رعایا کے فکر ونظر اور طرز بود وباش میں بنیادی تبدیلیوں کا ڈول ڈالا۔ ادھر نوآبادکار اپنی نسل، رنگ، زبان، لباس تاریخ، انداز واطوار غرض تہذیب وثقافت کے ہر پہلو میں مقامی رعایا سے مختلف تھے؛ لہٰذا استعمار کار اور مقامی لوگوں کے باہمی سماجی تعاملات سے مقامی معاشرت میں واضح طور پر سہ گونہ رویوں کا ظہور عمل میں آیا:

(i) مطابقت پذیر طرز عمل

(ii) مزاحمتی طرز عمل

(iii) مصلحت کوش طرز عمل

ان میں سے اکبر دوسرے طبقے کے نمائندہ شاعر ہیں مگر ان کے ہاں تنگ نظری اور تعصب کی جگہ نہیں۔ وہ نہ تو مغرب سے اس قدر مغلوب ومرعوب ہیں کہ اس کی اندھی تقلید کرنے لگیں اور نہ ہی جدید طرز فکر سے اس قدر متنفر کہ اس میں موجود مثبت سرگرمیوں کو بھی اپنانے سے دامن کشاں رہیں۔ ان کی غزل میں فکر ونظر کا ایک جامع اور منظم نظام موجود ہے جس کے تجزیاتی مطالعے کے لیے ہم اسے درج ذیل عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(i) سیاست

(ii) نظام تعلیم

(iii) تہذیب وتمدن

(iv) مذہب

(v) معیشت

اکبر کا یہ فکری نظام معاصر حالات کے خالی خولی مشاہدے، سنے سنائے واقعات اور سطحی اندازِ نظر کی پیداوار نہیں تھا بل کہ انھیں سرکاری ملازمت کے دوران میں مغربی طرزِ حیات کو قریب سے دیکھنے پرکھنے کا موقع بھی میسر آیا۔ فرنگی اندازِ سیاست، مقامی افکار کی ترویج واشاعت پر پابندی اور جدید کلامیے کی تشکیل وترقی وغیرہ کے امور اکبر جیسے نکتہ رس ناقد کی نظروں میں پوری طرح عیاں تھے؛ اس ضمن میں ان کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

وضع ان کی دیکھ کر لازم ہوئی قطع امید
کل ستم کی چل رہی تھی منہ کو سینا پڑا(۹۷)

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
سانس لیتا ہوں، بات کرتا ہوں(۹۸)

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا
ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں(۹۹)

ولولے لے کے نکلنے لگے کالج کے جواں
شرمِ مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید(۱۰۰)

حکومت انگلشیہ کی استحصالی سیاست، منافقانہ پالیسیوں اور بلا جواز ظلم وتشدد پر اکبر لکھتے ہیں:

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیّاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی(۱۰۱)

یہ سست ہے تو پھر کیا وہ تیز ہے تو پھر کیا
نیٹو جو ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا (۱۰۲)

آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو
ناک رکھتے ہو تو تیغِ تیز سے ڈرتے رہو (۱۰۳)

حسین ہونا ہی کافی ہے ظلم کرنے کو
تلاشِ عذر یہ کیوں ہے تمھیں جفا کے لیے (۱۰۴)

مسکرا کر وہ لگے کہنے کہ ذلّت ذلّت
جب یہ پوچھا کہ سوا رنج کے سہنا کیا ہے (۱۰۵)

مذکورہ بالا آخری دونوں اشعار اردو غزل کی روایتی لفظیات و رسمیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ ان کی غزل میں جہاں کہیں ایسی لفظیات استعمال ہوئی ہیں جن کا براہِ راست تعلق خارجی دنیا سے ہے، وہاں بھی انھوں نے کمال فنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حسنِ تغزل برقرار رکھنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد صادق بجا طور پر رقم طراز ہیں کہ:

''فنی اعتبار سے ان (اکبر) کا کلام اتنا بلند ہے کہ معاصر شعرا میں سے کسی کا بھی ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔'' (۱۰۶)

مثال کے طور پر ان کی یہ پوری غزل ایسی ہی بدعتِ حسنہ کی کام یات کاوش ہے:

تخت کے قابض وہی، دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں
برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آگیا تارِ امید و بیم ان کے ہاتھ میں
ہم کو سایے پر جنوں وہ دھوپ میں مصروف کار

مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں
مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں، تعلیم ان کے ہاتھ میں
خوب تر ہم سے ہیں ان کے دل میں اخلاقی اصول
گو نہیں ہے دینِ ابراہیم ان کے ہاتھ میں
جج بنا کر اچھے اچھوں کے لبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوش نما دو جیم ان کے ہاتھ میں (۱۰۷)

اُردو غزل کا یہ وہی اسلوب ہے جسے بیسویں صدی میں اردو کے عظیم شاعر اقبال نے اپنایا اور اپنے عالم گیر پیغام کی ترجمانی کی۔ اکبر کے ہاں امراضِ ملت کی تشخیص کا بیانیہ تو اسی تشخیص کو بنیاد بنا کر حکیم الامت نے بیمار و ناتواں مسلم قوم کو ایک نسخۂ کیمیا عطا کیا ہے۔ مذکورہ بالا غزل کے دوسرے آخری شعر میں اکبر نے بڑی کشادہ دلی سے اہل مغرب کے اخلاقی ارتفاع و تفوق کو تسلیم کیا ہے مگر وہ اس ستم ظریفی سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں کہ فرنگی حکمران ہندوستانی رعایا کو اپنی اعلا سطحی اخلاقیات سے ہرگز بہرہ مند نہیں کریں گے۔ وہ بہ خوبی جانتے تھے کہ فرنگی آقاؤں نے اپنی مفتوح رعایا کی فلاح و بہبود اور تہذیبی ترقی کے لیے جو اقدام بھی کیے ہیں ان کا حقیقی مقصد مزاحمتی قوتوں کا زور توڑ کر اپنے اقتدار کو محفوظ و مامون بنانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اہل مغرب کی اس سیاسی حیلہ سازی کی تفہیم میں اکبر کے زیرِ مطالعہ رڈیارڈ کپلنگ کی مشہور نظم "White Man's Burden" بھی رہی ہو گی جو ۱۸۹۹ء میں اس وقت لکھی گئی جب امریکہ نے فلپائن پر قبضہ کیا تھا۔ (۱۰۸)☆ اکبر نے برطانوی قوم کی ایسی نام نہاد فلاحی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا:

بارِ احساں جسے کہتے ہیں وہ ہے کوہِ گراں
کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے (۱۰۹)

انھوں نے اپنے ایک نثری مضمون ''نکات موزوں'' میں من جملہ اور سوالات کے ایک نکتہ یہ بھی اٹھایا ہے کہ برطانیہ کے ارکانِ پارلیمنٹ اور دیگر اربابِ کونسل تو بڑے روشن خیال،

انصاف دوست اور خوش خصال ہوتے ہیں مگر ہندوستان میں ان کے مقرر کردہ حکام اضلاع، جن سے عوام کو سروکار رہتا ہے، ایسی صفات سے عموماً کچھ علاقہ نہیں رکھتے: آخر کیوں؟ اسی ضمن میں شکوہ کناں ہیں:

عرش پر نورِ الٰہی جلوہ گر ہے ہم کو کیا
اہل دنیا کو تو فیض مہر انور چاہیے (۱۱۰)

اشجار میوہ دار ہیں اس باغ میں تو ہوں
مجھ کو نصیب کچھ بھی نہیں سیر کے سوا (۱۱۱)

کسی قوم کا نظام تعلیم اس کے مخصوص تشخص کے احیا و بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ اسی نظام فکر میں اس قوم کا ساختہ و پرداختہ صدیوں پرانا آدرش کارفرما رہتا ہے اور اسی کی وساطت سے نئی نسل میں اپنی قومی اقدار اور روایات، رسم و رواج، ایمان و ایقان اور دیگر سماجی رویوں کی بہ حفاظت منتقلی کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ کسی بھی مفتوح قوم کا تعلیمی نظام اسی بنیادی اہمیت کے پیش نظر فاتحین کی توجہ کا محور قرار پاتا ہے۔ فرنگی نوآبادکار اس حساس مسئلے سے بہ خوبی واقف تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے لیے درس و تدریس کا ایک ایسا نظام وضع کیا جو مقتدر کلامیے کو مقامی رعایا کے لیے قابل قبول بنانے کے ساتھ ساتھ یہاں کی قدیم تہذیب و تمدن کو غیر افادی اور دقیانوسی ثابت کر کے اس کی اہمیت مشکوک بنا دے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد آصف اعوان لکھتے ہیں:

"جب انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے تو وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ کسی قوم پر محض سیاسی تغلب، اس پر مکمل تصرف اور فتح و کامرانی کی علامت نہیں، اصل کارنامہ محکوم کے فکر و خیال اور سوچ میں تبدیلی لانے کے لیے ایک ایسا نظامِ تعلیم متعارف کروانا ہے جو نہایت سفاکی سے محکوم قوم کو نہ صرف اس کی تاریخ، سماجی روایات اور فکری و نظری سرمایہ سے برگشتہ کر دے بلکہ حکمران طبقے کے رنگ ڈھنگ اور طرزِ معاشرت کو اس کی نظروں میں اس قدر دل پذیر بنا دے کہ وہ اس کی تقلید اور نقل کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھنا شروع کر دے۔" (۱۱۲)

یہاں کے نظامِ تعلیم کو حکومت انگلشیہ کے استحصالی منشور سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سب سے اہم اقدام لارڈ میکالے کی وہ تعلیمی رپورٹ ہے جسے Macaulay's Educational Minutes کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس رپورٹ کا ماحصل یہ تھا کہ ہندوستانی باشندوں کو مقامی تہذیب سے متنفر اور بیزار کر کے انھیں یورپی اسلوبِ زیست کا گرویدہ بنایا جائے۔ بلاشبہ فرنگیوں کی یہ چال مقامی سماج کی فکری تسخیر کے لیے تیر بہ ہدف تھی لہٰذا اس تعلیمی پالیسی کے اثرات تیزی سے عوام میں سرایت کرنے لگے۔ بہت سے لوگوں بالخصوص طبقۂ امرا کی ایک بڑی تعداد نے نام نہاد روشن خیالی اور ترقی پسندی کے زعم میں فکر و عمل کے مغربی معیار اپنانا شروع کر دیے۔ جدت پسندی کا یہ رجحان جلد ہی منظم شکل اختیار کر گیا اور اسے علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ سر سید احمد خاں اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ اس نظامِ فکر میں ڈھلنے والے اذہان عموماً اپنی تاریخ، رسم و رواج، ایمان وایقان اور تہذیب و تمدن کی دیگر جہات پر ایک معذرت خواہانہ طرزِ فکر کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ مغربی تہذیب انھیں خیر و برکت کا ایک حیات افروز سرچشمہ معلوم ہوتی تھی۔ اکبر نے اس تحریک کے قابلِ اعتراض پہلوؤں کا سختی سے محاسبہ کیا اور بالعموم اسی نقد و نظر کی بنا پر انھیں قدامت پسندی اور تنگ نظری کا بے جا طعن بھی سہنا پڑا۔ یورپی نظامِ تعلیم اور اس کے نو آبادیاتی اہداف، محبِ وطن لوگوں کے اس ضمن میں تحفظات نیز مقامی آبادی پر اس تعلیم کے مضرت رساں اثرات کے بارے میں اکبر کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں (۱۱۳)

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (۱۱۴)

تیغ قاتل چل رہی ہے ان دنوں مثل نسیم
ہے بہارِ زخم دلکش فکر مرہم کیا کریں (۱۱۵)

قتل سے پہلے ہے کلوروفارم
شکر ہے ان کی مہربانی کا[116]

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی[117]

شیخ در گور و قوم در کالج
رنگ ہے دور آسمانی کا[118]

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جنابِ ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب[119]

مغربی نظام تعلیم اور اس کے مشرقی پرستاروں پر اکبر کی یہ تنقید اقتضائے وقت کے عین مطابق تھی لہٰذا اس سلسلے میں انھیں موردِ الزام ٹھہرانا کسی طور درست نہیں۔ موصوف کی ایسی ہی تنقید کو پزیرائی بخشتے ہوئے محمد اکرام لکھتے ہیں:

''یہ رجعت پسندانہ طرز فکر نہیں ہے، بلکہ بغور دیکھا جائے تو بیرونی تسلط کے شکنجے سے نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے۔''[120]

ان کی عملی زندگی پر نظر ڈالیں تو وہ خود انگریزی لباس پہنتے اور سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ بیٹے کو انگریزی تعلیم کے لیے لندن بھیجا اور خود بھی انگریزی کی اچھی خاصی شُد بُد حاصل کی۔ بنا بریں بعض ستم ظریف یہ فقرہ چست کرتے ہیں کہ موصوف دوہری شخصیت کے حامل تھے؛ بے پردہ بیبیوں کو دیکھ کر غیرتِ قومی سے زمین میں گڑ جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ہونہار بیٹے 'عشرتی' کو مغربی تعلیم کے تیزاب میں ڈالنے کے لیے اسے لندن کے عشرت کدوں میں بھی بھیجتے ہیں۔۔۔ ایں چہ بلُ عجبی ایست!! ڈاکٹر وحید قریشی ایسے استنباط کو کلامِ اکبر کے بعض حصوں کی سیاق و سباق سے ہٹ کر کی گئی تعبیرات کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(اکبر) فی الحقیقت اس ذہنیت کے خلاف تھے جو جدیدیت کی اس رو کی تہہ میں کارفرما تھی۔ نئے حالات سے مطابقت کی تردید اور اسے قبول کرنے کی مخالفت اکبر کے ہاں نہیں۔''(۱۲۱)☆

اکبر جدید دور کے سائنسی اور تکنیکی تقاضوں سے پوری طرح آگاہ تھے لہٰذا وہ اس طرح کے افادی علوم کے لیے ہمیشہ چشم براہ رہے:

انجن آیا نکل گیا زن سے
سن لیا نام آگ پانی کا
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا(۱۲۲)

اکبر نے اپنے نثری مضمون ''نکات موزوں'' میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا ہے کہ آیا مشرقی علوم کے ہوتے ہوئے ہمیں مغرب کے علمی سرمائے سے اخذ و استفادہ کی بھی کوئی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور پھر اس کے جواب میں یہ شعر نقل کرتے ہیں:

ہیں جو روشن دل علومِ مغربی سیکھیں ضرور
مہر کو جانا سوئے مغرب مقرر چاہیے(۱۲۳)

ایسے واضح اشاروں کے ہوتے ہوئے اکبر کی شاعری سے یہ استنباط کرنا کہ موصوف ایک تنگ نظر، متعصب اور مغرب بیزار ناقد ہیں، کسی طور درست نہیں۔ فرنگی تہذیب اپنی سیاسی بالا دستی کی بنا پر بہت تیزی سے ہندوستانی سماج میں سرایت کر رہی تھی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان اپنے مقامی رسم و رواج کو تج کر کھانے پینے، سونے جاگنے، بولنے چالنے اور جینے مرنے تک میں یورپی انداز اپنانا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ اکبر کے سگے بیٹے عشرت حسین بھی تہذیب مغرب کی چکا چوند سے متاثر ہو کر چھ سال کے قریب لندن ہی میں جمے رہے۔ اس قیام کے دوران میں ایک انگریز خاتون سے ان کا معاشقہ اس پر مستزاد ہے۔(۱۲۴) مغربی تہذیب کے اس بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ پر اکبر نے بڑے تیکھے انداز میں تنقید کی ہے:

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گلگوں سے خلوت میں
بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا (۱۲۵)

عزیزانِ وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل
یگانوں میں رہو بے گانہ ہو کر اس سے کیا حاصل (۱۲۶)

محبت اپنی ہی پریوں سے رکھیں حضرت اِندر
مسِ مغرور لندن ان کی چیری ہو نہیں سکتی (۱۲۷)

چمکے ہیں بزم جم میں اب گیسوئے طلائی
سکہ نیا بٹھایا گردوں کی پالسی نے (۱۲۸)

اس تہذیبی تغیر سے اپنی بے زاری کی توجیہہ کرتے ہوئے وہ بجا طور پر لکھتے ہیں:

اس انقلاب پر جو میں روؤں تو ہے بجا
مجھ کو وطن میں اب کوئی پہچانتا نہیں (۱۲۹)

مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے اکبر بسا اوقات اپنے اسلوب میں ایسی لفظیات کی بھرمار کر لیتے ہیں جو غزل کی عمومی رسمیات سے میل نہیں کھاتیں لہٰذا اس کا نتیجہ سقمِ تغزل کی صورت میں نکلنے کا بھی امکان بنا رہتا ہے۔ یہاں ایک قابلِ ستائش عمل یہ ہے کہ انھوں نے صنفِ غزل میں نئی لفظیات متعارف کروا کر اسے روحِ عصر کی جامع ترجمانی کے قابل بنایا ہے۔ چوں کہ غزل کی تنگ نائے وسعت آشنا کرنے میں پہلا باقاعدہ کام اکبر ہی نے کیا ہے لہٰذا اس ضمن میں کسی ذیلی سقم کا در آنا زیادہ معیوب نہیں لگتا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"غالب و ذوق کو تو چھوڑیے کہ ان کے ذہن ان تبدیلیوں کو قبول ہی نہ کر سکے اور کچھ یہ کہ اتنی ہمہ گیر تبدیلیاں ابھی آئی بھی نہ تھیں مگر حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی، شبلی اور اقبال کو کیا کہا جائے جو ان تبدیلیوں کو اپنی امیجری میں ظاہر کرنا نامناسب سمجھتے ہیں۔" (۱۳۰)

اکبر کی غزل میں خارجیت اور غیر روایتی لفظیات کے ضمن میں یہاں ڈاکٹر انور سدید کی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ:

''ادیب جب تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اس کی تخلیق میں لازماً وہ لرزشیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جو اس عہد کی معاشرتی، تہذیبی اور فکری سطح پر رونما ہو رہی ہوتی ہیں۔''(۱۳۱)

یورپ کی مادی تہذیب کا سب سے بڑا نشانہ مذہب تھا۔ برطانوی عہد میں ایک طرف عیسائی پادری اپنی مذہبی اقدار و روایات کی ترویج کر رہے تو دوسری طرف سائنس اور فلسفہ کے حاصلات کی تعبیر و تشریح کچھ اس انداز سے کی جا رہی تھی کہ اس سے عوام کے بہت سے مذہبی ایقانات پر حرف آتا تھا۔ اس نازک مسئلے پر اکبر کے ردِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں کہ:

''اکبر کی نظر میں سائنس اور فلسفہ کی ترقی اور اس کا ہماری اخلاقی اقدار اور وجدانیات سے تصادم اور ان پر غلبہ، ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔''(۱۳۲)

یہاں قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اکبر مغرب کے جدید فکر و فلسفہ اور سائنسی انداز نظر کے مخالف ہرگز نہیں، انھیں محض ان تفکرات کی مذہب مخالف تعبیر سے چڑ تھی لہٰذا اس سلسلے میں وہ کسی طور موردِ الزام نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ اکبر کے مجموعی سرمایۂ تخلیق میں کہیں بھی جدید علوم کی ترویج و ترقی پر مخالفانہ تاثر نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس وہ نئے علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے تھے؛ مثال کے طور پر ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دنیا بدل گئی ہے وہ ہیں ہمیں کہ اب تک
اپنے مقام پر ہیں، اپنے مکان پر ہیں(۱۳۳)

یورپ کے جاگنے پر صدیوں نظر نہیں کی
قسمت کو ایشیا کی سونا ہی چاہیے تھا(۱۳۴)

انھیں اگر اختلاف تھا تو فقط اس بات پر کہ فلسفہ و سائنس کی ناسوتی اور طبعی حاصلات کو بنیاد بنا کر ایمان و ایقان کے لاہوتی معاملات میں تشکک و الحاد کو فروغ دیا جا رہا تھا جس کی مذمت

کاری بہ ہر حال وہ خود پر لازم سمجھتے تھے؛ اس سلسلے کے یہ اشعار دیکھیے:

نہیں سائنس واقف کارِ دیں سے
خدا باہر ہے حدِّ دور بیں سے (۱۳۵)

وہ دو ذرے بلا اذنِ خدا مل ہی نہیں سکتے
کہ جن کے میل سے سائنس کی قوت ابھرتی ہے (۱۳۶)

کفر نے سائنس کے پردے میں پھیلائے ہیں پاؤں
بے زباں ہے بزمِ دل میں شمع ایماں ان دنوں (۱۳۷)

اکبر نے شاعری کے ذریعے اپنی قوم کو مذہب کی اہمیت اور فی زمانہ اس کے خلاف اٹھنے والے طوفان سے آگاہ کیا ہے؛ اس سلسلے کے چند مزید اشعار دیکھیے:

اگرچہ تسکینِ طبعِ ملت ہے حبِّ قومی میں آہ کرنا
مفید تر ہے مگر دلوں کا رجوع سوئے الٰہ کرنا (۱۳۸)

نئی تہذیب میں دقّت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے (۱۳۹)

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
ہو گئے شیخ بھی حاضر نئی تفسیر کے ساتھ (۱۴۰)

شارحِ دیوان ہستی ہے قیاسِ مغربی
ہے ازل بھی تجربوں کے زیر فرماں ان دنوں (۱۴۱)

اکبر کے دل میں ہندوستانی قوم کے صدیوں پرانے تہذیب و تمدن، انداز و اطوار، فکر و فلسفہ اور علوم و فنون کی تاریخ ساز عظمتوں کا گہرا نقش کندہ تھا۔ اس سرزمین میں دنیا کے کچھ قدیم ترین مذاہب نے باہم صلح جوئی پر مبنی ایک گٹھ بندن بنا کر مقامی سماج کے لیے امن و آشتی اور خوش

حال زندگی کی ضمانت فراہم کر رکھی تھی۔ اس جنت نظیر خطے میں باہمی انتشار و مناقشت اس وقت شروع ہوئی جب یورپی اقوام نے بہ ظاہر تاجروں کے روپ میں یہاں اپنی استحصالی سیاست کی بساط بچھائی اور مفسدانہ پالیسیوں کے ذریعے مقامی رعایا کو مذہب، تاریخ اور تہذیب کے الگ الگ خانوں میں بانٹ کر باہم دست و گریباں کر دیا۔ اکبر کا دل اس صورت حال پر کڑھتا ہے اور وہ بار بار ہندوستانی معاشرت کی عظمت رفتہ کو یاد دلا کر تہذیب نو کی مصنوعی چکا چوند میں گھرے ہوئے لوگوں کو اپنے شاندار ماضی سے دوبارہ رجوع پر مائل کرتے ہیں:

گھر کا چراغ دیکھو یعنی کہ دل سنبھالو
کوئی انار دم بھر گلریز ہے تو پھر کیا (۱۴۲)

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں میرا نشیمن تھا کہاں
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں (۱۴۳)

نزاکت سے جو فرش گل پہ سوتے تھے گلستاں میں
اب ان کی خاک اڑتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں (۱۴۴)

اس بات میں شبہ نہیں کہ لسان العصر کی بیش تر شاعری عصری مبحث کی پیداوار تھی مگر کمال یہ ہے کہ انھوں نے نظام حیات کے ان بنیادی اصولوں کو بھی تخلیق شعر میں شامل رکھا ہے جن کی اہمیت زمان و مکاں سے ماورا ہے۔ آج بھی جب ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پار کر آئے ہیں اور حالات کی ستم ظریفی نے ہمیں یک قطبی بندوبست کے تحت بالواسطہ نوعیت کے جدید نوآبادیاتی نظام سے دوچار کر دیا ہے ایسے میں اکبر ہمارے لیے آج بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ پہلے کبھی تھے۔

برطانوی راج کا استعماری دور اور اُردو غزل۔۔۔ایک اجمالی جائزہ

اردو غزل کا یہ دور جو برطانوی دور حکومت کے تقریباً نصف اول پر محیط ہے، اس صنفِ سخن کو ایک نیا طرز بیان عطا کرنے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں مقتدر کلامیے کے ظلم و جبر سے بچنے اور اس سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرنے کے لیے غزل کے روایتی علائم و رموز، ضمائر و کردار اور بنیادی شعریات کو نو آبادیاتی منظر نامے سے مطابقت دے کر اس اظہاری نظام کی حتمی تنظیم و ترویج کی گئی جس کی شروعات استعماری صورت حال کے تشکیلی دور میں ہوئی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں غزل گو شعرا اور قارئینِ غزل کے مابین ایسا خفیہ سمجھوتہ طے پا گیا تھا جس کے مطابق معاصر غزل سے روایتی معاملاتِ حسن و عشق کے بیانیے پر اصرار کے بجائے متغیر معاشرتی حسیات کی ترجمانی کے لیے بسا اوقات اس کے متضاد، متناقض اور متبائن مفاہیم کو بھی قبول کیا جانے لگا۔ یہ بنیادی تبدیلی وقت کا اہم تقاضا اور اردو غزل کی تاریخ کا اہم واقعہ تھی۔ اس دور کے اجتماعی طرز احساس کا اشارہ دیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اب یہ معاشرہ ایک ایسے پنجرے میں بند تھا جس میں احساس تحفظ تو تھا لیکن آزادی نہیں تھی۔''(۱۴۵)

حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اکثر شعرا نے اپنا مزاحمتی بیانیہ اسی نو متعینہ علامتی نظام میں ظاہر کیا ہے۔ نواب مرزا خان داغ کی غزل اس ہنگامی پینترے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غزل کی نشاتِ ثانیہ ہوئی اور جدید غزل کی بنیاد پڑی۔ انجمن پنجاب کے ذریعے جہاں اس صنفِ سخن کو اقلیم ادب سے نکال باہر کرنے کے عملی اقدامات کیے گئے اور ایک لحاظ سے مقدمہ حالی اس صنفی اتھل پتھل کا سب سے بڑا آلۂ کار تھا وہاں اسی انجمن کے پلیٹ فارم پر ''نظم موزوں'' کے باب میں پیش کردہ خیالات اور مقدمے کے جزئیات اس صنف کے لیے تازہ قوتِ نمو کا باعث بنے اور اس کی شاخِ فکر پر تخلیقی خارجیت کا ایسا اکھوا پھوٹا

جس کے برگ و بار کی بہ دولت یہ صنف نو آبادیاتی سماجیات کی جامع ادبی تاریخ بن گئی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بجا فرمایا ہے کہ:

''اردو شاعری میں قومی شعور و احساس کی ترجمانی کا باقاعدہ سلسلہ دورِ جدید میں (۱۸۵۷ء کے بعد) شروع ہوتا ہے۔''(۱۴۶)

اس عہد میں غزل کی قلبِ ماہیت ہوئی اور ''طرزِ حالی'' کی صورت میں ایک نیا غزلیہ اسلوب سامنے آیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس طرزِ سخن کی کام یاب مثال ذرا آگے چل کر علامہ اقبال وغیرہ نے ہی قائم کی ہے۔ اس دور میں بعض شعرا ایسے بھی ہیں جنھیں بہ ذاتِ خود سامراجی ظلم و ستم کا سامنا رہا۔ امام دین صہبائی اور میر احمد حسین مے کش جیسے بڑے بڑے ادبا قتل ہوئے اور بعض کو مزاحمت کاری کے ''گھناؤنے جرم'' کی بنا پر قید و بند کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا جن میں منیر شکوہ آبادی اور شیفتہ زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور کا مجموعی رجحان غزل کے لیے زیادہ سازگار نہ تھا اور نظم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ داغ دہلوی نے ایسے بحرانی دور میں غزل کا دیپ جلائے رکھا اور روایت سے انحراف کیے بغیر اس صنف میں معاصر حسیات کی کام یاب ترجمانی کی۔ داغ کے ہم عصر معروف شاعر امیر مینائی تھے مگر ان کے ہاں نو آبادیاتی بیانیہ زیادہ بار نہیں پاسکا۔ اس ضمن میں دوسرا بڑا نام اکبر الہ آبادی کا ہے جنھوں نے باوجود سرکاری ملازم ہونے کے، صنفِ غزل کو اپنے استعمار مخالف جذبات کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے اپنی ضاحکانہ منظومات میں جدید تہذیب کی ہر بدتہذیبی پر نشتر زنی کی۔ ان کی غزل میں بھی دفاعی مزاحمت کا ایک بھرپور اظہار ملتا ہے۔ مولانا حالی اس دور کا سب سے نمایاں حوالہ ہیں۔ انھوں نے روایتی غزل گوئی ترک کر کے مغربی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے عملی طور پر نہ صرف جدید غزل گوئی کی باقاعدہ بنیاد رکھی بل کہ اس اسلوبِ بیان کو نظری بنیادیں فراہم کرنے کے لیے مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر ایک رجحان ساز کردار ادا کیا۔ اس دور کے شعری فکر و فلسفہ پر ڈاکٹر فخر الحق نوری نے بڑی جامع رائے دی ہے کہ:

'جن شاعروں کا ادبی مقام جنگِ آزادی کے کچھ عرصہ بعد اور انیسویں صدی کے

دوسرے نصف میں متعین ہوا، ان کے ہاں شکست و ریخت کی کیفیت سے زیادہ تعمیر نو کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔"(۱۴۷)

حالی کی غزل جس کا تفصیلی تذکرہ مقدمہ حالی کے تناظر میں کیا گیا ہے اسی جذبہ تعمیر کی ایک نمائندہ مثال ہے۔

حواشی

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج:۳،ص ۴۷

۲۔ میر درد: کلیاتِ درد، مرتبہ: عبدالباری آسی، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، س۔ن،ص ۶۲

۳۔ دیوان غالب کامل، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء،ص ۳۲۶

۴۔ کلیات میر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء،ص ۶۶۵

۵۔ دیوانِ غالب،ص ۳۹۸

۶۔ داغ دہلوی: مہتاب داغ، مرتبہ: سید سبط حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء،ص ۲۴۶

۷۔ داغ دہلوی: آفتابِ داغ، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۱ء،ص ۵۱

۸۔ ذوقؔ، کلیات ذوق، مرتبہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء،ص ۲۳۹

۹۔ سخا دہلوی، نظیر حسن: کلیات مولانا سخا دہلوی، مرتبہ: ضیاء الحسن نقوی، راول پنڈی: راول پنڈی میسرز امریکن بک کمپنی، س۔ن،ص ۳۹

۱۰۔ ایضاً،ص ۲۵

۱۱۔ ولاؔ، مظہر علی خان: دیوان ولاؔ، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۳ء،ص ۱۷۹

۱۲۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر: سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء،ص ۲۷

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج:۳،ص ۲۵۰

۱۴۔ سرور، آل احمد: غالب کا ذہنی ارتقا، مشمولہ: احوال و نقد غالب،ص ۳۱۱

۱۵۔ نظیر، اصغر حسین خاں: اکبرالہ آبادی، لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن،ص ۳۱

۱۶۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: حسرت موہانی کی شاعری، مشمولہ: جدید شعری روایت، مرتبہ: الیاس میراں پوری، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۲ء،ص ۳۷

۱۷۔ میر: کلیاتِ میرؔ،ص ۲۶۸

۱۸۔ سوداؔ، رفیع الدین، مرزا: کلیاتِ سودا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۱۲۱

۱۹۔ داغ دہلوی، مہتابِ داغ،ص ۱۰۴

۲۰۔ داغ دہلوی: یادگارِ داغ، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء،ص ۲۰۱

۲۱۔ محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر (مرتب): نثرِ اکبرالہٰ آبادی، ص ۷۱

۲۲۔ محمد اقبال، علامہ: کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی، طبع ہشتم، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۶

۲۳۔ رالف رسل: اردو ادب کی جستجو، مترجم: محمد سرور رجا، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۸

۲۴۔ ☆نواب مرزا خاں داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمس الدین خاں فیروز پور جھرکا کے رئیس تھے۔ داغ کے دادا احمد بخش سرکار انگلشیہ کے خیر خواہوں میں سے تھے۔ اسی خیر خواہی میں انھیں فیروز پور جھرکا اور لوہارو کی ریاستیں عطا ہوئیں تھیں۔ دادا کے فوت ہونے پر فیروز پور جھرکا کی ریاست ان کے والد کے حصے میں آئی۔ ایک دفعہ ولیم فریزر نے نواب شمس الدین کی بہن سے معاشقہ لڑانے کی کوشش کی تو نواب نے اسے اپنے ملازم سے قتل کروا دیا جس پر انھیں پھانسی کی سزا ملی۔ داغؔ کی نواب کے ساتھ پدری نسبت محلِ نظر رہی ہے۔ مرزا خود بھی اپنے آپ کو وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم کا بیٹا کہلوانا پسند کرتے تھے۔

(کامل قریشی (مرتب): داغ دہلوی، حیات اور کارنامے، لاہور، پروگریسو بکس، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۔۱۸)

۲۵۔ داغ کی والدہ اس سے قبل مارٹن بلیک، نوب شمس الدین خاں، آغا مولوی تراب علی، ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں سے بھی متعلق رہیں اور آخر الذکر کے علاوہ ہر ایک کے ہاں صاحب اولاد بھی ہوئیں۔ مرزا فخرو کے حرم میں ان کے ہاں شہزادہ خورشید احمد خورشید پیدا ہوئے تھے۔

(مالک رام: تلامذۂ غالب، لاہور: گلوب پبلشرز، س۔ن، ص ۱۳۱)

۲۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: تعصبات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵

۲۷۔ سبط حسن: افکار تازہ، مرتبہ: سید جعفر احمد، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۸ء، ص ۶۱

۲۸۔ مہتاب داغ، ص ۳۴۸

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۱۲

۳۰۔ یادگارِ داغ، ص ۵۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۸

۳۳۔ گلزارِ داغ، ص ۱۰۸

۳۴۔ ایضاً، ص ۶۸

۳۵۔ ایضاً، ص ۸۳

۳۶۔ ماہتابِ داغ، ص ۱۴۳

۳۷۔ گلزارِ داغ، ص ۱۷۲

۳۸۔ یادگارِ داغ، ص ۴۹۴

۳۹۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۰۔ ایضاً، ص ۵۲

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۳۱

۴۲۔ فراق گورکھ پوری: اندازے، لاہور: ادارہ فروغ ادب، طبع: دوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۶۰

۴۳۔ مہتابِ داغ، ص ۱۸۳

۴۴۔ آفتابِ داغ، ص ۱۲

۴۵۔ مہتابِ داغ، ص ۱۷۵

۴۶۔ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر: اردو غزل، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۴ء، ص ۷۷

۴۷۔ خلیق انجم: متنی تنقید، دہلی، دہلی یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۳

۴۸۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: تعصبات، ص ۱۳۵

۴۹۔ یادگارِ داغ، ص ۴۹۳

۵۰۔ آفتابِ داغ، ص ۲۹۰

۵۱۔ یادگارِ داغ، ص ۲۰۶

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۵۴۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۹۸

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۵۷۔ احسن مارہروی، مقدمہ: یادگارِ داغ، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۲۷۔۲۸

۵۸۔ یادگارِ داغ، ص ۲۰۱

۵۹۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۰۔ ایضاً، ص ۴۲

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۶۲۔ ایضاً، ص ۵۸

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۶۴۔ فراق گورکھ پوری: اندازے، ص ۲۵۹

۶۵۔ یادگارِ داغ، ص ۸۸

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۲۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۶۸۔ ایضاً، ص ۹۶

۶۹۔ مہتاب داغ، ۲۴۶

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۷۱۔ یادگارِ داغ، ص ۹۸

۷۲۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۷۵۔☆ نواب کے والد شمس الدین خاں کو پھانسی ہوئی تو کمپنی حکام نے ان کی ریاست اور جائیداد بھی ضبط کر لی۔ داغ کی والدہ مکان چھوڑنے اور روپوشی اختیار کرنے پر مجبور ہوئیں۔ ان دنوں داغ اپنی خالہ عمدہ بیگم کے ہاں آ گئے تھے جو انھیں اپنے ساتھ لے کر نواب یوسف علی خاں کے ہاں رام پور چلی گئیں جہاں نواب نے انھیں ہر طرح کی سہولیات دے رکھی تھیں۔ داغ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسی امیرانہ ماحول میں ہوئی۔ بعد ازاں جب ان کی والدہ ۱۸۴۴ء میں مرزا فخرو کے نکاح میں آئیں تو داغ بھی قلعہ معلا منتقل ہو گئے۔
(سبط حسن: افکار تازہ، ص ۵۱۔۵۲)

۷۶۔ سبط حسن: افکار تازہ، ص ۵۵

۷۷۔ داؤد رہبر، ڈاکٹر: مشاعرے کا فاتح نواب مرزا خان داغ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۱

۷۸۔ مہتاب داغ، ص ۱۰۴

۷۹۔ یادگارِداغ،ص ۱۰۵

۸۰۔ محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر (مرتب): نثر اکبر الہ آبادی، ص ۴۷

۸۱۔ یادگارِداغ، ص ۴۷

۸۲۔ ایضاً، ص ۵۱

۸۳۔ ایضاً، ص ۸۲

۸۴۔ ایضاً، ص ۵۵

۸۵۔ محمد صادق، ڈاکٹر: سید اکبر حسین اکبر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۹، ص ۱۵۲

۸۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ادب اور کلچر، لاہور: مکتبہ عالیہ، س۔ن، ص ۱۲۱

87. Muhammad Sadiq: A History of Urdu Litrature, Oxford Uni. London, P.309

۸۸۔ محمد زکریا، خواجہ: اکبر الہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۹

۸۹۔ محمد صادق، ڈاکٹر: سید اکبر حسین اکبر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۹، ص ۱۳۸

۹۰۔ عشرت حسین: حیات اکبر، دہلی: بزم اکبر، س۔ن۔ص ۵۱

۹۱۔ محمد صادق، ڈاکٹر: سید اکبر حسین اکبر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۹، ص ۱۳۸

۹۲۔ محمد زکریا، خواجہ: اکبر الہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ص ۵۲

۹۳۔ محمد صادق، ڈاکٹر: سید اکبر حسین اکبر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۹، ص ۱۳۹

۹۴۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر: مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد، لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۲ء، ص ۹۴

۹۵۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، ص ۴۷۸۔۴۷۹

۹۶۔ احمد، کلیم الدین: اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷

۹۷۔ کلیات اکبر الہ آبادی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۷

۹۸۔ ایضاً، ص ۳۲

۹۹۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۲۹۴

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۰۳۔ ایضاً،ص ۴۰

۱۰۴۔ ایضاً،ص ۳۶

۱۰۵۔ ایضاً،ص ۵۶

۱۰۶۔ محمد صادق، ڈاکٹر: سید اکبر حسین اکبر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۹، ص ۱۲۹

۱۰۷۔ کلیات اکبر، ص ۳۷۔۳۸

۱۰۸۔ محمد زکریا، خواجہ: اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۶۶

☆ یہاں منقول کپلنگ کی پوری نظم کا متن ملاحظہ فرمائیں:

"Take up the white man's burden,
in patience to abide
To veil the threat of terror
And check the show of pride;
By open speech and simple,
An hundred times made plain,
To seek anotehr's gain
Take up the white man's burden,
The sanage wars of peace
Fill fill the mouth of famine
And bid the sickness cease;
And when your goal is nearest
(The end for others sought)
Watch sloth and healthen folly
Bring all your hope to mought
Take up the white man's burden,
No iron rule of kings,
But Toil of serf and sweeper
The tale of common things,
The ports Ye shall not entry,
The roads Ye shall not tread,

Go, make them with your living
And mark them with your dead,
Take up the white man's burden,
And reap his old reward,
The blame of those ye better
The hate of yhose ye guard
The cry of hosts ye humour
(Ah, shlowly!) toward the light:
"Why brought ye us from boundage,
ur loved Egyptian night."

۱۰۹۔ کلیات اکبر،ص ۸۶
۱۱۰۔ محمد زکریا، خواجہ (مرتب): نثر اکبر الہ آبادی، ص ۱۲
۱۱۱۔ کلیات اکبر، ص ۵۴
۱۱۲۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر: مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد، ص ۱۱۴۔۱۱۵
۱۱۳۔ کلیات اکبر، ص ۳۷
۱۱۴۔ ایضاً، ص ۸۷
۱۱۵۔ ایضاً، ص ۲۷۰
۱۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸
۱۱۷۔ ایضاً، ص ۸۰
۱۱۸۔ ایضاً، ص ۱۸
۱۱۹۔ ایضاً، ص ۱۹
۱۲۰۔ محمد اکرام چغتائی، دیباچہ: کلیات اکبر الہ آبادی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۴
۱۲۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر: جدیدیت کی تلاش میں، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۲

☆ اکبر الہ آبادی کا اپنے بیٹے عشرت حسین کے نام ایک ایسا منظوم خط بھی ملتا ہے جس میں اسے بیرونِ ملک دل لگانے اور مغربی تہذیب سے کسبِ فیض کی نصیحت کی گئی۔ اس اٹھائیس اشعار کے طویل خط سے تین منتخب اشعار دیکھیے:

بہتر ہے یہیں رہو میرے پاس
تہذیب کی آئے تم میں بو باس
انگریز سوسائٹی کو دیکھو
میزوں کی ورائٹی کو دیکھو
کھیلو جنگل میں گوئے چوگاں
طاقت صحت کی ہو نگہباں

(نامۂ اکبرالہ آبادی بنام سید عشرت حسین، مشمولہ: منظوم خطوط، مرتبہ: محمد باقر لکھنوی، کراچی: ۱۵۔ڈی، رضویہ سوسائٹی، س۔ن، ص۳۳۔۳۵)

۱۲۲۔ کلیات اکبر، ص۱۸
۱۲۳۔ محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر (مرتب): نثر اکبرالہ آبادی، ص۱۲
۱۲۴۔ محمد صادق، ڈاکٹر: سید اکبر حسین اکبر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج:۹، ص۱۴۰
۱۲۵۔ کلیات اکبر، ص۱۷
۱۲۶۔ ایضاً، ص۳۰
۱۲۷۔ ایضاً، ص۵۴
۱۲۸۔ ایضاً، ص۴۷
۱۲۹۔ ایضاً، ص۷۷
۱۳۰۔ محمد زکریا، خواجہ: اکبرالہ آبادی تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص۲۷۱
۱۳۱۔ انور سدید، ڈاکٹر: موضوعات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص۳۷
۱۳۲۔ محمد صادق، ڈاکٹر: سید اکبر حسین اکبر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج:۹، ص۱۴۲
۱۳۳۔ کلیات اکبر، ص۲۶۵
۱۳۴۔ ایضاً، ص۵۴۰
۱۳۵۔ کلیات اکبر (حصہ دوم)، ص۴۶
۱۳۶۔ ایضاً، ص۲۹۵
۱۳۷۔ ایضاً، ص۲۶۳
۱۳۸۔ ایضاً، ص۱۷

۱۳۹۔ ایضاً،ص۲۹۳

۱۴۰۔ ایضاً،ص۲۷۳

۱۴۱۔ ایضاً،ص۲۶۳

۱۴۲۔ ایضاً،ص۱۱

۱۴۳۔ ایضاً،ص۳۸

۱۴۴۔ ایضاً،ص۱۲۳

۱۴۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج:۳،ص۳۴

۱۴۶۔ ذوالفقار، غلام حسین، خواجہ: مولانا ظفر علی خاں حیات، خدمات و آثار، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء،ص۵۵۶

۱۴۷۔ فخر الحق نوری، ڈاکٹر: آزادی کی گونج، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء،ص۲۵۔۲۶

برطانوی راج میں اہلِ ہند کی جارحانہ مزاحمت اور اردو غزل

(نوآبادیاتی نظام کا نصف آخر ۱۹۰۰ـ۱۹۴۷ء)

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرک بہار کر
(اقبالؔ)

اقبال کی غزل ۔۔۔ نو آبادیاتی دور کا ثمرِ نورس

صنفِ غزل اقبال کے قصرِ شاعری کی سنگِ بنیاد بھی ہے [1] اور بامِ عروج کا ایک اہم کنگرہ بھی۔ اگرچہ ان کا عہد بنیادی طور پر نظم نگاری کے فروغ سے علاقہ رکھتا ہے تاہم داغ دہلوی، امیر مینائی اور اکبرالہ آبادی جیسے شعرا کے دم قدم سے صنفِ غزل بھی ادبی منظرنامے سے محو نہیں ہوئی تھی۔ اقبال کو ان شعرا سے دلی لگاؤ تھا۔ انھوں نے نہ صرف ان اساتذہ کی عظمت کو تسلیم کیا ہے بل کہ ان کے رنگ میں غزلیں بھی لکھیں ہیں۔ بعدازاں غزل گوئی کا یہی رجحان اقبال کے فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ ہو کر ایک جداگانہ رنگ اختیار کر گیا۔ یہ درست ہے کہ اقبال کے مربوط فکر و فلسفہ کی ترجمانی کے لیے نظمیہ پیرایۂ بیان ہی زیادہ موزوں تھا اور یہی انھوں نے اختیار بھی کیا مگر ان کے فکری ارتقا کو جاننے اور مختلف نظریات کے نوع بہ نوع پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ان کی غزل سے رجوع بھی لازم آتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اقبال کی غزل ان کی نظم کے مقابل کوئی ثانوی چیز نہیں جہاں محض بازگوئی کی مشق کی جا رہی تھی؛ ان کے بہت سے بنیادی افکار جنھیں نظم میں متناسب بیانیہ میسر نہ آسکا تھا یہاں بڑی جامعیت سے بیان کئے گئے ہیں۔ مزید برآں یہ غزلیں اس لیے بھی توجہ طلب ہیں کہ ان میں اقبال نے ایک مجتہدانہ قدم اٹھاتے ہوئے ایسے

اظہاری قرینے متعارف کروائے ہیں جو عصری تقاضوں کی خاطر خواہ انجام دہی کے ساتھ ساتھ اس لطیف صنفِ سخن سے مکمل مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ ایک مدت تک ناقدین ان غزلوں کی صنفی حیثیت تسلیم کرنے میں متذبذب رہے۔ اقبال خود بھی اس سلسلے میں کچھ ذہنی تحفظات کا شکار تھے اور ان کے لیے ''افکارِ پریشاں''، ''نوائے پریشاں'' یا اس سے ملتے جلتے دیگر الفاظ وتراکیب استعمال کرتے رہے۔ (۲) تاہم آج یہ بے یقینی کی کیفیت بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ اقبال دراصل وہ مجدد غزل ہیں جنھوں نے اس مقبول ترین صنفِ سخن کو روایتی اسلوب اظہار سے آزاد کر کے اس کی جملہ ممکنات کو روبہ عمل کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صدیق جاوید لکھتے ہیں کہ اقبال نے ''اردو غزل کے لیے نیا آئین اور نیا دستور مرتب کیا بلکہ اسے قابلِ قبول بھی بنایا۔'' (۳)

اقبال کی غزل کا سیاق ان سیاسی وسماجی حالات سے مرتب ہوا تھا جن میں تحریک علی گڑھ اور اس کے ردِعمل کی مختلف تحاریک نمایاں ہوئی تھیں۔ اس دور میں ہندوستانی رعایا کی ایک معتدبہ تعداد جدید علوم وفنون میں دل چسپی لینے لگی تھی۔ مقامی معاشرت میں مغربی تہذیب کے نفوذ و انجذاب کے ساتھ ساتھ لوگوں میں روشن خیال اور ترقی پسندانہ خیالات کا فہم بھی پیدا ہو رہا تھا۔ مختلف اخبارات ورسائل مزاحیہ اسلوب اپنا کر مغرب مائل رجحانات پر کڑی تنقید کر رہے تھے اور اکبرالہ آبادی جیسا نکتہ طراز شاعر بھی اس کج روی اور مغرب پرستی کے احتساب میں پیش پیش تھا۔

سنجیدہ شعروادب کی دنیا میں دو رجحانات حالؔی اور داغؔ کی صورت میں باہم متقابل چل رہے تھے۔ داغؔ دہلوی نے غزل کے روایتی اسلوب کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے اس کے رموز وعلائم کو معاصر صورتِ حال سے ہم آہنگ رکھنے کوشش کی تو حالؔی نے مقدمہ شعروشاعری لکھ کر بدیہی طرزِ اظہار کا ڈول ڈالا۔ انھوں نے ادب کے قدیم تصور کو بدل کر اس کا زندگی سے براہِ راست ربط استوار کیا۔ شعری تخلیقات میں سادگی، اصلیت اور جوش پر زور دیا گیا اور ایسے اسلوب کی ترویج کی گئی جس میں مفاہیم الفاظ وتراکیب کی لغوی معنویت کے قریب تر رہیں۔ کلام اقبال کا شعریاتی تناظر ایسے ہی ملے جلے تخلیقی رجحانات سے تشکیل پایا تھا۔ ناقدین ادب نے اکتسابِ فکروفن کے حوالے سے اقبال کا تعلق مختلف ادبی رجحانات سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ عابد علی عابدؔ رقم طراز ہیں کہ:

''اقبال نے بھی دراصل حالی ہی کی پیروی کی اور شعر کو ان افکار و تصورات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنایا جن سے قومی عظمت کا شعور اجاگر ہوتا تھا۔''(۴)

اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال کو حالی کی قومی شاعری کا نقطۂ عروج قرار دیا ہے۔(۵) شیخ محمد اکرام نے ان کا اکتسابی انسلاک علی گڑھ مکتبِ فکر کے بہ جائے اس کے مخالف گروہ یعنی اکبر اور ان کے ہم خیال شعرا سے جوڑا ہے:

''اقبال کی نشو و نما دور ردعمل میں ہوئی اور وہ ان رجحانات سے متاثر ہوا۔''(۶)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ان دونوں سے الگ رہ کر ایک تیسرے سرچشمۂ فیض کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ''شاعری میں اقبال کے پہلے اور آخری استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی تھے۔''(۷)

حقیقت یہ ہے کہ ایسے تمام بیانات میں کچھ نہ کچھ جزوی صداقت ضرور پائی جاتی ہے۔ اقبال کا اسلوب سخن مختلف رجحانات کا عکاس ہے تاہم ان کی افتادِ طبع، فکری رویّوں اور اظہاری قرینوں سے مترشح ہے کہ ان کا اہم ترین گوشۂ اکتساب نصِ قرانی ہے۔(۸) ان کے ذہن میں شعریاتِ رسول ﷺ کا بھی گہرا نقش کندہ تھا۔ حضور ﷺ وقتاً فوقتاً اپنے دور کی عربی شاعری پر ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا کرتے تھے جنھیں یقیناً اقبال نے حرز جاں بنایا اور ان کی روشنی میں تخلیقی ارتفاع کی منزلیں طے کیں۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی شعریات پر ایک مضمون ''رسول اللہ صلعم فن شعر کے مبصر کی حیثیت میں''☆ بھی لکھا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حقائق حیات سے غافل کر کے بے خودی اور گم رہی پیدا کرنے والے کلام سے ان کی نفرت اور نشو و ارتقا کی حامل شاعری سے دل بستگی فی الاصل شعریاتِ رسول ﷺ ہی سے اکتسابِ فیض کا نتیجہ تھی۔ اقبال کا جملہ کلام اپنی فکر انگیزی میں اس قدر موثر ہے کہ اس بنا پر انھیں مصلح، مبلغ، تحریک احیائے اسلام اور پان اسلام ازم کا داعی وغیرہ ایسے کئی ایک القابات سے نوازا گیا جو اپنی جگہ درست اور ان کی کثیر الجہات شاعری سے منصفانہ طور پر مستنبط ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز تک جب اقبال کا تخلیقی شعور متحرک ہوا، برصغیر کے سیاسی افق

پرنفال مزاحمت کے آثار ہویدا ہونے لگے تھے۔ کانگرس، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ جیسی جماعتیں عوام کی سیاسی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ فرنگی استعمار سے ہندوستان کے لیے زیادہ سے زیادہ سیاسی اصلاحات کا مطالبہ بھی کر رہی تھیں۔ ملک کی پر آشوب فضاؤں میں تقسیمِ بنگال اور بعد ازاں اس کی تنسیخ، تحریک خلافت و ترکِ موالات، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں، مختلف آئینی اصلاحات اور آئین سازی کے لیے کی جانے والی کاوشوں جیسے عوامل سیاسی کینوس پر شدید ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ بین الاقوامی دنیا کے حالات و واقعات مثلاً روس کے مقابلے میں جاپان کی فتح (۱۹۰۵ء) طرابلس اور بلقان کی جنگیں (۱۹۱۱۔۱۹۱۳ء)، جنگ عظیم اوّل (۱۹۱۴۔۱۹۱۸ء)، یورپی ایما پر شریف مکہ کی ترک خلافت سے غداری (۱۹۱۶ء) وغیرہ جیسے عوامل نے بھی ہندوستان کے سیاسی درجہ حرارت پر براہِ راست اثرات مرتب کیے۔ بیرونی دنیا کے سیاسی مدّ و جذر کا مجموعی تاثر امید و بیم کا بھرپور سامان لیے ہوئے تھا۔ مسلم اقتدار جو فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) کے موقع پر اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا، ایسا روبہ زوال ہوا کہ بیسویں صدی تک آتے آتے تقریباً پوری اسلامی دنیا غلامی کے پاتال میں اتر گئی۔ مسلمانوں کے صرف چار ممالک یعنی ترکی، سعودی عرب، ایران اور افغانستان ہی ۱۹۲۰ء تک اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھ پائے۔ بلاشبہ یہ صورت حال مایوس کن تھی۔ عہد غلامی کے اسی تناظر میں حریت و آزادی کے آفاق روشن ہوئے اور قریب قریب سبھی غلام ممالک میں آزادی کی تحریکیں اٹھیں جن کی بدولت محض نصف پون صدی کے اندر اندر بیشتر ممالک نے اپنی آزادیاں بحال کرالیں۔

سیاسی بیانیے کے اس جملۂ معترضہ کا ماحصل یہ ہے کہ اقبال نے اپنے دیدۂ بینا سے غلامی کی شبِ تار بھی دیکھی اور آزادی کا آفتابِ تازہ بھی۔ لیل و نہار کا یہی وہ منظر نامہ تھا جو شاعر مشرق کے لیے شرح صدر کا باعث بنا۔ اقبال کی فکر رسا تھی اور ذہن نہایت ذود حس۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا سب سے بڑا محرک وقت ہے۔ موصوف کا زمانہ ایسا تھا جب تشکیک اور بے یقینی کی ڈالیوں پر ایمان و ایقان کے غنچے چٹخ رہے تھے۔ بلاشبہ اس سے قبل بھی اردو شاعری اپنے معاصر ماحول سے لاتعلق نہ رہی تھی۔ میر کا آشوب آگہی اور غالب کا دقیق فکر و فلسفہ معاصر تناظر سے بہت

مربوط ہے مگران عظیم شعرا کے ادوار اپنے تمام تر کرب وضرب کے باوجود بہ حیثیت مجموعی زوال آمادہ اور یک سطحی تھے لہٰذا ان کے کلام میں امید وبیم کے متقابل فکری نظام کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ سعادت اقبال کے حصہ میں لکھی تھی۔ انھیں قدرت نے شاعری کی قبائے صفات کے لیے بیم ورجا کا حریر دورنگ عطا کیا اور وہ فی نفسہ اس ضمن میں کم عیار ثابت نہیں ہوئے۔ اس حوالے سے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اُردو شاعری کی روایت میں شعور کی بیداری میرؔ سے شروع ہوتی ہے۔۔۔غالب کے یہاں شعور زیادہ بالیدہ ہو گیا لیکن معاملہ تشکیک سے آگے نہیں بڑھا۔ اقبال تک پہنچ کر اردو شاعری مکمل طور پر بالغ ہو گئی۔''(۹)

ڈاکٹر سلیم اختر نے فکر اقبال کی ماہیت بیان کرنے کے لیے جدلیات کا لفظ استعمال کیا ہے۔(۱۰) نو آبادیاتی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو مزاحمتی کلامیہ دو صدیوں سے بیشتر زمانی حصار میں پھیلا ہوا تھا، اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ بڑے منظم انداز سے شعر اقبال میں سمٹ آیا ہے۔ یہ کلام ایک اعلا درجے کے مربوط نظامِ فکر کا ترجمان ہے۔ اقبال اپنی شاعری کے غیر روایتی انداز سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے متعدد مقامات پر معاصر حالات کی مقتضیات سے اپنے منفرد محاربانی اسلوب کی توجیہہ نکالی ہے۔ اپنے فلسفۂ شعر کے تشکیلی عناصر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دلنواز نہیں(۱۱)

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر(۱۲)

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجاز حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر(۱۳)

اقبال اپنی شعری واردات کو آمد کا ایک لطیف نورانی سلسلہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات کے متمنی دکھائی نہیں دیتے کہ ان کا شمار اپنے دور کے شاعروں میں کیا جائے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے احوال و آثار میں کئی مقامات پر ادب برائے ادب سے برأت کا عندیہ دیتے ہوئے اپنے مخصوص تخلیقی اہداف کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری قوائے انسانی کو مضمحل کرنے کے بجائے ان میں حرکت حیات بڑھاتی ہے۔ وہ ایسے عشق کے پیام بر ہیں جو اعلا نصب العین کی راہ بھاتا ہے۔ ان کا جنون دیوانگی سکھانے والا نہیں بل کہ دانش و حکمت کے خزانے لٹانے والا ہے جس سے قلب و روح کے امراض کی تلافی ہوتی ہے اور انسان کے لیے ایک آسودہ زندگی کی ثمرات ہونے لگتی ہیں:

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز (۱۴)

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں (۱۵)

جب یہ حکمت آموز جنوں اپنی حشر سامانیوں سے روبہ عمل ہوتا ہے تو حق و باطل کے معرکے میں تیزی آجاتی ہے؛ انسان کے بنائے ہوئے طاغوتی نظام اور باطل نظریات دم توڑنے لگتے ہیں؛ تقلید کی جگہ تحقیق و تدقیق کے رجحانات پروان چڑھتے ہیں اور اقوام عالم پر ایک حقیقی صبح آزادی طلوع ہونے لگتی ہے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں (۱۶)

اور ایسے میں عالم لاہوت کا یہ مکالمہ کس قدر بلیغ معلوم ہوتا ہے:

حضور حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا(۱۷)

کلامِ اقبال کی مختلف اور متنوع جہات میں فکر ونظر کا ایک متوازن اور معتدل قرینہ موجود ہے۔ مغربی تہذیب وتمدن کے لحاظ سے اس میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عہدِ اقبال کا سب سے بڑا فتنہ اسی نو وارد تہذیب کا پروردہ تھا۔ وہ اس کی نوعیت اور شدت سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ یورپی فکر و فلسفہ، عہدِ حاضر کے مغربی مفکرین اور وہاں کے اعلا تعلیمی اداروں سے انھیں گہرا ربط ضبط رہا تھا۔ یورپ میں ان کا قیام مغرب شناسی کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دوران میں انھیں فرنگی معاشرت کے ہر پہلو کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اہلِ مغرب کے میکانکی رویوں، مادی افکار اور دوسری اقوام کے افراد سے متعصبانہ برتاؤ سے بجا طور پر یہ تاثر لیا کہ مغربی تہذیب اندر سے کھوکھلی اور روشن خیالی کے حقیقی تصور کے سراسر منافی ہے۔ وہ اپنے کلام میں جابہ جا مغربی تہذیب وتمدن پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں:☆

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرورِ اوّل، دیتے ہیں شرابِ آخر!(۱۸)

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا(۱۹)

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش(۲۰)

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی برّاقی(۲۱)

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری(۲۲)

جیسا کہ مذکورہ صدر تین ابتدائی اشعار سے ظاہر ہے کہ اقبال نے مغربی تہذیب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے خمریات کی روایتی تکنیک بھی استعمال کی ہے۔اس حوالے سے انھوں نے بادہ و جام کی مختلف استعاراتی جہات وضع کی ہیں۔ان علائم و رموز کی عمرانی گتھیاں سلجھائی جائیں تو اس سے مغرب شناسی کا ایک پورا نظام مرتب کیا جا سکتا ہے۔اقبال نے نو آباد کار کی تمدنی دہشت گردی کا اس شدّت سے رڈ کیا ہے کہ بعض نام ور اقبال شناس حضرات اسے علامہ کی مغرب بیزاری پر محمول کرنے لگتے ہیں۔خلیفہ عبدالحکیم اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''(اقبال کو) مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلی ہے۔''(۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ یہاں فاضل نقاد سے کچھ تسامح ضرور ہوا ہے۔کسی قوم کی تہذیب اس کا تشخص برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ نشو و ارتقا کی بھی ضامن ہوتی ہے۔یقیناً ہر تہذیب کی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں جنھیں نظر انداز کرنا کسی طور مستحسن نہیں۔اقبال نے بھی انگریزی تہذیب و تمدن کا جائزہ لیتے ہوئے کلیتاً بے تعصب رہ کر اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے بہت متوازن اور صائب رائے دی ہے:

''اقبال نے مغرب کی جانب دو رویے اختیار کیے۔جہاں تک مغرب کی مادیت پرستی اور ظاہری چمک دمک کا تعلق ہے اسے اقبال نے ہدفِ تنقید بنایا، لیکن مغربی علوم و فنون کو اقبال نے ہمیشہ سراہا ہے۔''(۲۴)

ڈاکٹر یوسف حسین نے بھی اسی بات پر صاد کیا ہے:

''اقبال مغرب کی مادیت، اس کی محدود قوم پرستی، اس کی سرمایہ دارانہ ذہنیت، غرض اس کی تمدنی فتوحات سے بیزار ہیں مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یورپ کی بدولت انسانی قوت ارادی کی کارفرمائیاں اور اس کی تسخیر خودی کی صلاحتیں قدیم تہذیبوں کی نسبت ہزار گنا زیادہ ہیں۔''(۲۵)

اہل یورپ کی علوم و فنون میں بے مثال ترقی، تسخیر فطرت میں پیش قدمی، تہذیب و

تمدن میں صفائی ستھرائی اور سلیقہ شعاری اقبال کی نظروں میں نہایت قابلِ قدر خصوصیات تھیں۔ وہ ان ممالک کو فردوس ارضی سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ انھیں اس بات کی شدید خواہش ہے کہ ترقی پسندی کی یہ اقدار مسلم معاشرے کا بھی حصہ بننی چاہئیں۔ وہ درست طور پر سمجھتے تھے کہ تمام اسلامی دنیا یورپ کی علمی سیادت تسلیم کرتے ہوئے اس سے استفادہ کرنے پر مائل ہو رہی ہے جو ایک مستحسن امر ہے کیوں کہ ان کی اپنی دانش گاہیں گذشتہ کئی صدیوں سے فکری انجماد کا شکار ہیں۔ ان خواہشات کا ذکر انھوں نے اپنے پہلے خطبے ''علم اور مذہبی تجربہ'' میں یوں کیا ہے:

> "During the last five hundred years religious thought in Islam has been practically stationary. There was a time when European thought received ispiration from the world of Islam. The most remarkable phenominon of modern history, however, is the enormous rapidity with which the world of Islam is spirtually moving towards the west. There is nothing wrong in this movement, for European culture, on its intellectual side, is only a further develoment of some of the most important phases of the culture of Islam."(26)

مغربی تہذیب کے قابلِ قدر پہلوؤں کی تحسین کرنے میں انھیں کسی قسم کا باک نہ تھا۔ وہ کامل خلوص سے یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں اہل مغرب کی ظاہری چکا چوند اور عیش دوست سماجی رویوں سے بے نیاز رہ کر اس کی باطنی حرکی قوت سے مستفید ہونا چاہیے تا کہ ہمارے معاشرتی جمود کا خاتمہ ہو سکے۔ یورپ کی فکری دانش گاہوں کے ذاتی مشاہدے سے قبل بھی انھیں مغربی اقوام کی علمی برتری کا پورا احساس تھا لہٰذا ۱۹۰۵ء سے قبل لکھی اپنی ایک غزل میں وہ خفی انداز میں مشرق و مغرب کے علمی تفاوت کا تذکرہ بڑے کسک آمیز لہجے میں کرتے ہیں اور بعد ازاں بھی مغربی مے کدوں کے باطنی پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کی دل کشی کے ترانے گاتے ہیں۔

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی! خزف چینِ لبِ ساحل ہوں میں (۲۷)☆

سرور و سوز میں نا پائیدار ہے ورنہ
مئے فرنگ کا جرعہ بھی نہیں نا صاف (۲۸)

اقبال کو اہل فرنگ کی انسان دوستی، بنیادی حقوق کی پاس داری اور معاشرتی مساوات جیسی اقدار بے حد پسند تھیں۔ وہ ان کی محنت، ایفاے عہد، پابندیِ وقت، کاروباری خلوص اور دیانت دارانہ معاشی معاملات کے تہہ دل سے معترف تھے تاہم انھیں اس تلخ حقیقت کا بھی احساس تھا کہ انگریزوں کا یہ حسن عمل محض اپنی قوم تک محدود ہے؛ مفتوح اقوام اس کے ثمرات سے مستفید کم ہی ہو پاتی ہیں۔ انھوں نے جا بہ جا مشرق و مغرب کی اس باہمی کشاکش کا تذکرہ کیا ہے اور عموماً اپنے ہم وطنوں کو مقامی تہذیب کی عظمت یاد دلاتے ہوئے انھیں اپنی تہذیب سے ہم آہنگ رہنے کا درس دیتے نظر آتے ہیں:

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
میری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا (۲۹)

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گزر (۳۰)

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا (۳۱)

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں (۳۲)

مغربی ممالک میں اقبال کا قیام ان کے فکری تغیر و ارتقا کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یورپ یاترا سے قبل اقبال کے ہاں حبّ وطن کا تصور سراسر جغرافیائی تھا۔ مغربی معاشرے سے اپنے تال میل کے دوران میں انھیں احساس ہوا کہ نیشنل ازم دراصل استعماری طاقت کا ایک تشکیلی مرحلہ ہے لہٰذا انھوں نے اس سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تصورِ وطن

کو جغرافیائی حصار سے نکال کر ایک نظریاتی وحدت سے منسلک کرلیا۔ اپنے وطن کی جدید سرحداتی تعینات کی دریافت انھیں ملتِ بیضا کی وسعتوں سے ہم کنار کرتی، صدیوں پر محیط شان دار ماضی سے جوڑتی اور بے پناہ ارتقائی امکانات کا ایقان بخشتی ہوئی نئے تخلیقی منطقے عطا کرتی ہے اور وہ ان وجد آفرین حسیات کو تخلیقی پیرہن عطا کر کے بڑے فخریہ انداز میں اپنی نگارشات کا حصہ بناتے ہیں۔ یہی وہ ابتدائی خیال تھا جو مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر تصور پاکستان کی صورت میں متشکل ہوا۔

قیامِ یورپ کے دوران میں اقبال کا دوسرا انکشافی احساس مغربی تہذیب کے زوال سے متعلق ہے۔ یہ وہ دور تھا جب فرانس اور عظیم برطانیہ دنیا کے بیشتر ممالک کو اپنی کالونیاں بنا چکے تھے۔ بالخصوص برطانیہ کی وسیع مملکت پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا تاہم اقبال نے مغرب کے سیاسی اور معاشی نظام کی کمزوریوں، معاشرتی خرابیوں اور عوام کے مذہب بیزار رویوں سے جلد ہی اس تہذیب کی زوال آمادگی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا ایقان حاصل کرلیا۔ یورپ میں انھیں کئی مغربی مفکرین سے براہِ راست ملاقات اور عالمی سیاست گری کے قریبی مشاہدے کا موقع ملا تو سامراجی استحصال کے تہہ در تہہ مضمرات ان پر منکشف ہو گئے۔ اس پر انھوں نے مارچ ۱۹۰۷ء کی تاریخ کا بالخصوص اندراج کر کے وہ معروف غزل لکھی جسے غلام ہندوستا نمنظوم سیاسی منظرنامے کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ یہ غزل اہل ہند کا جدید سیاسی اعلامیہ بھی ہے اور زوال مغرب کا کتبہ بھی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہو گا[۳۳]

اس دور میں یورپ کی مختلف کالونیوں میں سیاسی بلوغت آزادی کی تحریکوں میں ڈھل رہی تھی۔ روس کے خلاف جاپان کی فتح نے یورپی اقتدار کی پس پائی کے امکانات روشن کر دیے تھے۔ ایسے میں ایک یورپی شہری اگر اپنے معاشرے سے متعلق تجزیہ اور اس کے ممکنہ نتائج کی پیش

بنی کرے تو یہ ایک بات ہوگی "مگر غلام مملکت میں بیٹھ کر اقبال کا مغربی تہذیب کے زوال کا عندیہ دینا ان کی گہری تاریخی بصیرت کی دلیل بن جاتا ہے۔"(۳۴) اقبال کے خیال میں مغرب کی "فکر گستاخ" نے تسخیر کائنات کے جو غیر فطری طریقے اپنائے تھے اس کے ردعمل میں قدرت کی مزاحمتی قوتیں اس سے انتقام لینے پر اتر آئی تھیں لہٰذا انھیں مغربی تہذیب تیزی کے ساتھ رو بہ زوال نظر آتی ہے؛ اس حوالے سے ان کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گذرِ سیل بے پناہ میں ہے (۳۷)

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ
سست بنیاد بھی ہے، آئینۂ دیوار بھی ہے (۳۸)

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام (۳۹)

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا (۳۸)

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب (۳۹)

اقبال کو ۱۹۲۳ء میں فرنگی سرکار کی طرف سے "سر" کا خطاب ملا تو لوگوں میں یہ چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں کہ اب وہ شاید مغربی استعمار سے متعلق اپنی آزاد ناقدانہ حیثیت برقرار نہ رکھ سکیں گے اور انھیں سر سید کی طرح کسی نئے علم الکلام کا سہارا لے کر مغرب سے فکری مطابقت کی راہ نکالنا پڑے گی۔ اقبال کے لیے یہ بدگمانی اس قدر روح فرسا تھی کہ انھوں نے اپنی منظومات و منثورات میں متعدد مقامات پر اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ بلاشبہ موصوف کا فکر و فلسفہ ہر طرح

کے تعصب اور مصلحت اندیشی سے پاک ہے۔انھیں یورپ سے اکتسابِ فکر و فن میں یہ تحفظات ضرور تھے کہ یہاں کی مادی تہذیب اپنی ظاہری جمالیات، نوع بہ نوع آسائشات اور دل کش آرایش و زیبایش سے افرادِ ملت کو اپنا گرویدہ بنا کر ان کے اسلامی تشخص کو داغ دار کر سکتی ہے۔وہ اپنے پہلے خطبے میں اس خدشے کا اظہار بڑی وضاحت سے کرتے ہیں:

"The only fear is that the dazzling exterior of European culture may arrest our movement and we may fail to reach the true inwardness of that culture."(40)

وہ اس فتنہ جاں فزا کی سحر کاری سے ہر خاص و عام کو معذور (Vulnerable) جانتے تھے۔لہٰذا جب انھیں انگلستان اور جرمن کی دانش گاہوں میں حسنِ فرنگ کی بہاریں بہ نفس نفیس دیکھنے کا موقعہ ملا تو ان پر جلوۂ حسن کی تمام رموز آشکار ہو گئیں۔وہ فلسفۂ حسن اور جلوۂ فرنگ کے اسیروں کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی (۴۱)

یہ مدرسہ ، یہ جواں ، یہ سرور و رعنائی
انھیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد (۴۲)

اقبال نے فرنگی حسن کی سحر کاریوں سے بچنے کے لیے اسوۂ رسول میں پناہ لی ہے۔وہ یورپ کے توبہ شکن ماحول میں رہتے ہوئے بھی اسلامی اقدار و روایات کی پاس داری کا اہتمام کرتے ہیں، حسن نسوانی کی بجلیوں سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں کو مدینہ منورہ اور نجفِ اشرف کی خاک سے بصیرت افروز بناتے ہیں نیز بارگاہِ رسولؐ میں اپنی چارہ سازی کا استغاثہ پیش کر کے اس فتنۂ دوراں سے محفوظ و مامون رہنے کا سامان کرتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش افرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف (۴۳)

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی، میرا ایمان زنّاری (۴۴)

اقبال نے اپنی خداداد بصیرت سے جلد ہی شرق و غرب کی سیاسی بساط کا درک حاصل کر لیا تھا۔ انھیں اسلامی نظام کی روشن خیال اور ترقی پسندانہ اقدار و روایات کے مقابل یورپ کی مقتدر تہذیب میں بے شمار خامیاں نظر آتی تھیں۔ انھوں نے اپنی قوم کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے ایک منظّم اصلاحی نظام کی تشکیل کا پروگرام بنایا۔ وہ تین بڑی قوتوں کو مسلمانوں کے زوال و ادبار کا موجب قرار دیتے ہیں: شہنشاہیت، ملائیت اور خانقاہیت۔ ان یرغمالی طاقتوں نے مسلم معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا کر رکھی تھیں جن میں وطن پرستی، پابندیِ تقدیر، ماضی کی اندھی تقلید اور شخصی و ملی انا کی پامالی وغیرہ جیسی تباہ کن رسمیات شامل ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم، نثر اور خطبات وغیرہ میں ان معاشرتی ناسوروں پر نشتر زنی کی اور اصلاحِ احوال کے لیے اپنا خالص اسلامی فلسفہ متعارف کرایا جس کا مقصد انفرادی اور اجتماعی سطح پر حیات انسانی کی نشو و نما تھا۔ اس ضمن میں وہ توحید و رسالت پر کامل ایمان اور قرآنی تعلیمات کی مکمل پیروی پر زور دیتے ہیں۔ اس نظامِ حیات کی ترجمانی میں انھوں نے رجائیت کے پرچار اور مایوسی و بیزاری کی تردید کو اپنا خصوصی شعار بنائے رکھا۔ اپنی ان تمام فکری ابعاد کو نظریۂ خودی کی صورت میں پیش کر کے موصوف نے قوم کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ یہ نظریہ اس قدر ترقی پسند، حریت دوست اور انقلاب آفریں تھا کہ اس سے ہندوستانی رعایا میں ولولۂ آزادی اور یورپی ایوانوں میں غلغلۂ تشویش کا بلند ہونا لازمی امر تھا:

میری نوائے شوق سے شورِ حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں (۴۵)

اقبال کا فلسفۂ خودی جب کیمبرج یونی ورسٹی کے پروفیسر آر۔ اے نکلسن کی وساطت سے ۱۹۱۹ء میں مغربی دنیا میں متعارف ہوا تو پروفیسر ڈکنسن، ای۔ ایم۔ فاسٹر اور ہربرٹ ریڈ وغیرہ نے اس پر ریویو لکھے۔ ان میں ڈکنسن اور فاسٹر جیسے ناقدین نے اگر فکرِ اقبال میں اسلام ازم کے

خطرات محسوس کیے اور اسے مغرب کے لیے ''شگونِ نحس'' قرار دیتے ہوئے اقبال کو ''خونیں ستارہ'' کہا ہے[۴۶] تو مؤخرالذکر نے ان الفاظ میں ستائش بھی کی ہے:

''آج جب ہمارے مقامی متشاعر اپنے بے تکلف احباب کے حلقے میں بیٹھے کیٹس کے تتبع میں کتنے بلبلوں اور ایسے ہی گھریلو موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں لاہور میں ایک ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے۔''[۴۷]

اقبال نے خودی کی تکمیل کے لیے اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کی تین منازل مقرر کی ہیں۔ نفیِ خودی اور استحکام خودی کے سلسلے میں عامل موثرات کا بھی انھوں نے ایک مربوط فریم ورک پیش کیا ہے۔ وہ مقام خودی کے سالکین کو عشق، فقر اور نظر جیسی صفات سے متصف ہونے کا درس دیتے ہیں۔ اقبال کا یہ شہرہ آفاق فکر و فلسفہ ان کے کلام کا بنیادی خمیر ہے۔ ان کی غزلیات اسی فکری نظام کی تفسیر ہیں۔ اس نظام کے چند اہم پہلوؤں پر ایک ایک شعری مثال لیتے ہیں؛ شہنشاہیت، خانقاہی نظام اور ملا ازم کے بارے میں لکھتے ہیں:

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز
اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز[۴۸]

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ[۴۹]

توحید و رسالت، قرآنی تعلیمات کی پیروی اور رجائیت پسندی کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے[۵۰]

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں (۵۱)

ایک ایک شعر فلسفۂ خودی اور اس کے ضمنی عناصر عشق، جنوں، فقر اور نظر کے بارے میں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (۵۲)

جب عشق سکھاتا ہے اندازِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی (۵۳)

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک (۵۴)

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ (۵۵)

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی (۵۶)

غلام ہندوستان کے تقلید آموز ماحول میں اقبال نے حریت و آزادی کا ضامن یہ مجتہدانہ نظامِ فکر متعارف کروایا تو پوری قوم میں ایک نیا عزم اور ولولہ پیدا ہوا۔ ان کے سیاسی شعور میں بلوغت آئی تو سینوں میں آزاد مملکت کے ارمان مچلنے لگے۔ ۱۹۰۵ء سے قبل لکھی گئی ان کی ایک غزل سے مترشح ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک کشورِ ہند کی رعایا عظیم استعماری طاقت سے آزادی حاصل کرنے کو خارج از امکان ہی سمجھتی تھی:

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے (۵۷)

مگر اقبال نے ژرف نگاہی سے یورپ کی رو بہ زوال تہذیب کا جائزہ لیا تو انھیں اس امر کا ایقان حاصل ہو گیا کہ سرمایہ داری نظام کا پروردہ شہنشاہی سلسلہ اپنے آخری دن پورے کر رہا ہے، عن قریب ایک جہانِ نو اس عالمِ پیر کی جگہ براجمان ہو گا۔ انھوں نے ابتدائی دور کی ایک معروف غزل میں اس خوش آئند مستقبل کی نوید بھی سنائی تھی:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہو گا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ قافلے کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، عکس مرا شعلہ بار ہو گا(۵۸)

اس غزل کی سیاسی اہمیت واضح کرتے ہوئے پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''یہ (غزل) گویا ہندی مسلمانوں کا نیا سیاسی منشور تھا جس کا سنگ بنیاد اقبال نے ۱۹۰۷ء کی اس غزل میں رکھ دیا تھا۔''(۵۹)

اقبال محض شاعر ہی نہیں ایک بلند پایہ مفکر بھی تھے۔ بین الاقوامی حالات و واقعات پر ان کی گہری نظر تھی۔ مستقبل قریب میں وقوع پذیر ہونے والے ایسے واقعات جو جمہور کی سرحدِ ادراک سے دور ایک دھندلا سا نقش بنا رہے تھے، اقبال کے سامنے نوشتۂ دیوار ہیں:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے(۶۰)

تیس کی دہائی میں انھوں نے آزادی کے نغموں کی لے بہت تیز کر دی تھی۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں وہ برطانوی استعمار سے آزادی پانے اور مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک الگ مملکت بنانے کا مطالبہ پوری صراحت سے پیش کر دیتے ہیں۔ جب ہندوستان کے مختلف سیاسی گروہوں کو کسی ایک آئینی ڈھانچے پر متفق کرنے کے لیے لندن میں

گول میز کانفرنسیں ہوئیں تو اقبال بھی تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے۔ اگرچہ یہ کانفرنس بھی اتفاقِ رائے نہ ہونے کی بنا پر ناکام رہی تاہم انھوں نے اپنی اسلامی ہند اسکیم (خطبہ الٰہ آباد) کی وہاں خوب تشہیر کی۔ کیمبرج کے مسلم سکالر چودھری رحمت علی نے یہیں سے متاثر ہو کر اقبال کی اس مجوزہ ریاست کے لیے پاکستان کا نام تجویز کیا تھا۔ (۶۱) اس دور کی غزل میں اقبال نے حریت و آزادی کے نغمے بہت صراحت سے رقم کیے ہیں:

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ (۶۲)

خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر (۶۳)

اور پھر یہ شعر تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے حوالے سے گویا ان کی مجوزہ اسلامی ریاست کی جغرافیائی ترجمانی بھی کر رہا ہے:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد (۶۴)

یہ اشعار محض شاعرانہ بیانیے نہیں بل کہ ان میں ایک طرف خطبہ الٰہ آباد کی مختلف تفسیریں ہیں تو دوسری طرف قراردادِ پاکستان کی پیش منظری تعبیریں بھی۔ واضح رہے کہ قراردادِ پاکستان دراصل خطبہ الٰہ آباد ہی کی ایک ارتقائی صورت تھی۔ (۶۵) واقعہ یہ ہے کہ تیس کی دھائی کے لگ بھگ اقبال کو ہندوستان کی سرزمین پر مسلم مملکت کے قیام کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ مندرجہ بالا اشعار کے معنوی تسلسل میں ان کا یہ شعر دیکھیے جس پر مجوزہ مملکت کا قومی ترانہ تخلیق کرنے کی آرزو کا گماں ہوتا ہے:

نغمہ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر! (۶۶)

اس دور میں آزادی کی تحریکیں اپنے پورے عروج پر تھیں۔ جلسے جلوس، ریلیاں، کانفرنسیں اور دیگر نوع بہ نوع سماجی سرگرمیاں عوام کے سیاسی فہم اور حریت پسندانہ جذبات کو بہت متحرک کر چکی تھیں۔ شعر و شاعری کی دنیا میں حسرتؔ، فراقؔ، چکبستؔ، فانیؔ اور اصغر گونڈوی وغیرہ جیسے شعرا کرام اپنے اپنے رنگ میں دادِ سخن دے رہے تھے مگر ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی مخصوص و محدود اظہاری قرینے کا اسیر تھا۔ معاصر سماج کے ہنگامہ خیز سیاسی معاملات اور عوام کا بے پناہ جوش و جذبہ کماحقہٗ ان کی تخلیق فکر کا حصہ نہیں بن پایا۔ پروفیسر فتح محمد ملک بجا طور پر شکوہ کناں ہیں کہ:

''ہمارے لکھنے والوں کی غالب اکثریت قیام پاکستان کی جدوجہد میں مصروف عوام کے سوز و سازِ آرزو سے بے تعلقی اور ناآشنائی پر ناز کرنے کی خوگر تھی۔''(۶۷)

اقبال اگرچہ تحریک آزادی کے نتیجہ خیز اور فعال ترین دورانیے (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء) کے عینی شاہد نہ بن سکے مگر ان کے ہاں جذب و مستی سے سرشار اس عہد کی ترجمانی کسی بھی شاعر سے معیار و مقدار ہر دو لحاظ سے بڑھ کر ہے۔ وہ اس تحریک کے ترجمان ہی نہیں، ایک سرگرم رہنما بھی تھے۔ ان کے کلام میں عوام کی سیاسی تربیت کا سامان بھی ہے اور خواص یعنی تحریک حریت کے رہنماؤں کے لیے فلسفہ سیادت بھی۔ میرِ کارواں کو سیاسی تدبر سکھانے کے لیے اقبال کا کلام ایک سرچشمۂ فیض ہے:

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز (۶۸)

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے (۶۹)

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر (۷۰)

اقبال دیس بدیس کے سیاسی شاطروں کی ہر چال سمجھتے تھے لہٰذا انھوں نے مسلم قیادت

کی سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے تحفظات سے بھی آگاہ کیا ہے:

مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت
نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی (۷۱)

صاحبِ ساز پہ لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش (۷۲)

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف (۷۳)

اقبال کو قائداعظم محمد علی جناح کی قائدانہ صلاحیتوں پر بڑا اعتماد تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب قائداعظم مسلم سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ایسے میں اقبال ہی نے انھیں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے پھر سے قائل کیا تھا؛(۷۴) اس تناظر میں اقبال کے یہ اشعار کس قدر بلیغ تخلیقی اظہار یے ہیں:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی (۷۵)

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی (۷۶)

بلاشبہ بیسویں صدی کے تمام شاعروں میں سے ''جذبے اور فکر کی تال میل کا سب سے بڑا مظہر اقبال ہے۔''(۷۷) انھوں نے شعری روایت میں اپنے آزادانہ تخیل کے ادغام سے ایک نیا تخلیقی تجربہ پیش کیا ہے۔ ان کی غزلیات معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ایک نئے رنگِ تغزل کی امین ہیں۔ اقبال نظریۂ فن برائے فن کو اپنے حالات سے ناموافق جان کر اس سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دہر میں خونِ جگر نہ تلف کر(۷۸)

بعض ناقدین جوان کی مخصوص مجتہدانہ تغزلی کیفیت کو روایتی تغزل سے مختلف جان کر بدکتے ہیں، دراصل ''تغزل'' کی اصلاح کو محض عاشق، معشوق کی معاملہ بندیوں تک محدود جانتے ہیں حال آں کہ:

''تغزل وہ جوہرِ لطیف ہے جو غزل میں لطف و کیف گھولتا اور اثر آفرینی پیدا کرتا ہے۔ یہ جوہر بہت سے عناصر کا ماحصل لیکن ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس میں جذباتی تجربے کے علاوہ ایک خاص زبان، ایک خاص لب و لہجہ اور ایک خاص پیرایۂ بیان ہوتا ہے۔ رمز و ایماء اس کا بنیادی وصف ہے۔''(۷۹)

تغزل کے اس جامع مفہوم کو مدنظر رکھیں تو اقبال کی غزلیں اس صنف کی پوری تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ یوں گویا نہ صرف اقبال کی غزل ہمارے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان کرتی ہے بل کہ اس کا معنوی نظام نو آبادیاتی عہد میں اہلِ ہند کی فکری تاریخ کا ایک اہم اشاریہ ہونے کے باوصف تحریکِ پاکستان کی صحیح ترتفہیم کے لیے ایک اہم ماخذ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ تاہم المیہ یہ ہے کہ ان کا کلام بالخصوص غزلیات اپنے معاصر سیاسی مد و جذر کے حوالے سے کسی منظم تحقیقی کاوش کا بہت کم حصہ بنی ہیں۔ اس کم التفاتی سے گلہ مند ہو کر پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''تحریکِ پاکستان کے بیشتر مورخین اقبال کی شاعری سے ناآشنا ہیں۔ یہ لوگ تحریکِ پاکستان میں اقبال کی فکری قیادت کے احوال و مقامات جاننے کے لیے اقبال کی شاعری سے اعتنا کرنا ضروری بھی نہیں سمجھتے۔''(۸۰)

حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان میں سیاسی فعالیت اور اس کی ادبی ترجمانی کے یک جا اظہار میں اقبال کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔ یہ دور اردو غزل میں برق رفتار تبدیلیاں متعارف کروا رہا تھا۔ اقبال کی غزل کا فکری نظام، روایت کا ارتقائی شعور، لفظ و معنی کے جدید بندھن اور روایتی رمز و ایما کی عصرِ حاضر سے ہم آہنگ استعاراتی جہات اس امر کی بیّن دلیل ہیں کہ ان کے

ہاں شعور و آگہی کا ایک جہان معنی آباد ہے۔ وہ اپنے کلام کی نایاب معنویت کی طرف بجا طور پر اشارہ کناں ہیں:

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے[۸۱]

سیّد الاحرار حسرت موہانی کی غزل

مولانا حسرت موہانی نوآبادیاتی دور کے اہم ترین مزاحمت کاروں میں سے تھے۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تھی جس کا ہر ورق جہد مسلسل، الم نصیبی اور تحریک حریت کی راہ میں پیش آنے والے روح فرسا تجربات سے مزین ہے۔ تحریک آزادی کی تاریخ میں مولانا کی سیاسی شخصیت فی نفسہ شعریت سے مملو نظر آتی ہے۔ ایک طرف اگر پیوند لگی کھدر کی اچکن، بوسیدہ سی ترکی ٹوپی، ایک ٹانگ سے محروم دھاگے کے سہارے ناک پہ اٹکی عینک، پرانی سی بیاض، نحیف جثہ اور مہین سی آواز ہے (۸۲) تو دوسری طرف اہل فرنگ کے ایوانوں میں ان کی ولولہ انگیز تقاریر، حریت کامل کا غیر مشروط مطالبہ، انگریزی اصلاحات کا بے لاگ تجزیہ اور استعماری گماشتوں سے مذاکرات کرنے والے مقامی لیڈران یعنی گاندھی، قائداعظم، راج گوپال اچاریہ اور حکیم اجمل وغیرہ پر کڑی تنقید جیسے عوامل انھیں تحریک آزادی کا دل چسپ کردار بنا دیتے ہیں۔ اقبال فیروز نے انھیں ایسی ہی یکتا خصوصیات اور قلندرانہ روش کی بنا پر ''ابوذرِ عصر'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ (۸۳)

حسرت نے بیسویں صدی کے نصف اوّل کی تحریک مزاحمت میں ایک کلیدی کردار نبھایا۔ ان کا مشن کامل آزادی، آدرش روشن خیال و ترقی پسند معاشرے کی تشکیل اور فلسفۂ عمل کھلی بغاوت یا راست اقدام کا روبہ عمل لانا تھا۔ انھوں نے ایسا مشکل راستہ اس وقت اختیار کیا جب برصغیر میں مصلحت کوشی اور مطابقت پزیری کی روش عام تھی۔ اکتسابِ علم و دانش کے لیے وہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ جیسے ادارے سے وابستہ رہے جو ہندوستان کے مفاہمتی طبقے کا ایک اہم مرکز خیال کیا جاتا ہے۔ اس ادارے کے سربراہ سر سید احمد خاں نہ صرف مغربی تہذیب سے حیران کن حد تک متاثر تھے بل کہ موصوف نے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی ''کامل درجے کی سولائیزیشن یعنی تہذیب سکھانے کا عزم کر رکھا تھا۔ سر سیّد کے مکتبۂ فکر میں سیاست کو بہ تدریج اپنانے کی پالیسی مناسب خیال کی جا رہی تھی جب کہ اپنی انقلابی افتادِ طبع کے باعث حسرت پر اس مصلحت آموز فضا کا بالکل

اثنا اثر ہوا اور ۱۹۰۳ء میں یہاں سے گریجویشن کر کے نکلنے والا حسرت انگریزی راج کے لیے مزاحمت و بغاوت کا ایک استعارہ بن گیا۔ وہ نوآبادیاتی دور کے دوسرے نصف میں ابھرنے والے اوّلین فعال مزاحمت کاروں کے مثالی نمائندہ تھے۔ جنگ آزادی سے قبل ہندوستانیوں کی مزاحمتی تحریک شمشیر و سناں اور حرب و ضرب سے عبارت تھی۔ اس مزاحمت کا عمومی انداز وہی تھا جو سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، سید احمد بریلوی وغیرہ جیسے لوگوں نے اختیار کیا مگر 57ء کے معرکے کی ناکامی سے حالات یک سر تبدیل ہو گئے۔ اب مزاحمتی تحریک دار و رسن، قید و بند، صحافتی یلغاروں، قلمی مجادلوں اور خطابتی محاذ آرائیوں تک محدود ہو گئی تھی۔ اس مزاحمتی تکنیک کے پہلے باقاعدہ عامل حسرت ہی تھے۔ (۸۴) انھیں خود بھی اپنے نامقبول اندازِ مزاحمت کا بھرپور احساس تھا اور کبھی کبھی تو وہ خود کو اس طرزِ عمل کا اکلوتا کردار پا کر جھلاہٹ کا شکار بھی ہوتے تھے:

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم (۸۵)

برطانوی استعمار کی یہ فعال مزاحمت حسرت کے کسی لاشعوری تعصب کا نتیجہ نہ تھی۔ علی گڑھ کالج میں زمانہ طالب علمی کی دوران میں انھیں اپنے فرنگی اساتذہ سے ایسی ہی عقیدت و محبت تھی جیسی کسی مسلمان استاد سے۔ اس کالج کے ایک انگریز پرنسپل تھیوڈر بیک کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ مورلین نئے پرنسپل مقرر ہوئے تو حسرت نے ایک نظم میں آں جہانی کے لیے رنج و غم اور مورلین کے خیر مقدم میں اپنے ستایشی جذبات کا بھرپور اظہار کیا۔ (۸۶) تاہم عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی ان کا سیاسی شعور اس قدر بالغ ہو گیا کہ وہ مغربی آقاؤں کی استحصالی پالیسیوں کو سمجھنے اور ان کے حسب حال اپنا مزاحمتی ردعمل دینے لگے۔ اسی پرنسپل کے دورِ انتظام میں حسرت نے کالج میں ایک مشاعرہ منعقد کروایا جس میں مہمان شاعر گستاخ رام پوری کے اس شعر پر:

یہ مرض گستاخ کیسا تجھ میں پیدا ہو گیا
جس کی صورت اچھی دیکھی اس پہ شیدا ہو گیا

پرنسپل اور مشاعرے کے منتظم یعنی حسرت میں بد معاملگی پیدا ہو گئی۔ موصوف کو''

اخلاق سے گرا ہوا'' مشاعرہ کروانے پر دھر لیا گیا۔ جب انھوں نے ایسے اشعار کی اخلاق باختہ معنویت تسلیم کرنے سے مطلقاً انکار کیا تو انھیں کالج سے نکال دیا گیا۔ اسی طرح وہ تین مرتبہ حریت پسندانہ اور انقلابی اقدامات کی بنا پر کالج بدر کیے گئے اور بعد ازاں بڑی مشکل سے نواب محسن الملک کی سفارش پر امتحان دینے کی اجازت ملی۔ (۸۷)

حسرت کی سیاسی زندگی کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ کالج سے نکلتے ہی انھوں نے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ (۸۸) ان کے سیاسی کیریئر کا قابلِ ذکر حوالہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ انتہا پسندانہ گروہ سے اپنا ناتا جوڑے رکھا۔ اس ضمن میں بال گنگا دھر تلک ان کے مثالی کردار تھے۔ حسرت کی منزلِ مراد کامل آزادی کا حصول تھا۔ انھیں جس تحریک یا سیاسی جماعت میں بھی اس مقصد کے حصول کی کوئی جھلک ملتی وہ اسی کے ہو رہتے۔ چناں چہ آل انڈیا نیشنل کانگرس، مسلم لیگ، سودیشی تحریک، کمیونسٹ پارٹی تحریک خلافت جیسی مختلف، متنوع اور بسا اوقات باہم متضاد منشورات کی حامل جماعتوں سے بھی ان کا انسلاک رہا۔

مولانا کا دوسرا اہم میدان عمل صحافت تھا۔ اس ضمن میں ان کا مجلہ اردوے معلیٰ تاریخی شہرت کا حامل ہے جس میں ادبی اور سیاسی موضوعات پر موقر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اپنے حریت پسندانہ اور انقلابی مواد کی وجہ سے اس کی اشاعت اس دور کے دیگر اہم رسالوں کامریڈ، البلاغ اور زمیندار وغیرہ سے بہت پہلے معطل کر دی گئی تھی۔ (۸۹) اس مجلے کے مزاحمتی مشمولات کی وجہ سے انھیں جرمانہ اور قید و بند جیسی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں مگر ان کے پاے استقلال اور مجلے کے انقلابی اسلوبِ تحریر بھی کبھی فرق نہ آنے پایا۔

سیاست اور صحافت کے ساتھ ساتھ حسرت کا تیسرا اہم حوالہ شعر و شاعری ہے۔ اس دور میں صنفِ غزل ایک بحرانی حالت سے گزر رہی تھی۔ انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے نظم کی ترویج و اشاعت کا سرکاری منصوبہ اپنے اندر یہ ضمنی پہلو بھی رکھتا تھا کہ ہندوستان کی مقبول ترین صنف شعری یعنی غزل کو غیر مقبول بنا کر سادہ اور یک سطحی اظہار بیان کا سامان کیا جائے لہٰذا غزل کا روایتی اسلوب بالخصوص ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ معاصر حالات کا اقتضا بھی شعر و ادب کے مروجہ

سانچوں میں تبدیلی کا عندیہ دے رہا تھا۔ ڈاکٹر احمد لاری کے مطابق اس وقت غزل گوئی کا فن تین واضح رجحانات میں تقسیم ہو چکا تھا: (۹۰)

۱۔ داغ اور امیر کا قدیم طرزِ اظہار

۲۔ حالی اور اکبر کا جدید اسلوب

۳۔ شاد اور حسرت کا جدت آمیز روایتی اسلوب

حسرت نے اردو غزل کی معتوب صنفِ سخن کو اپنی تخلیقی شخصیت کا ذریعۂ اظہار بنایا۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کی باہمی آمیزش سے ایک نیا اسلوب پیدا ہوا جو اپنی روایتی چاشنی اور صدیوں پرانی تہذیبی حلاوت کے ساتھ ساتھ عہدِ رواں کے تازہ تر سیاسی و سماجی شعور سے بھی مملو ہے۔ موصوف کا یہ طرزِ اظہار اس قدر مقبول ہوا کہ انھیں ''غزل کا امام''(۹۱) اور ''رئیس المتغزلین''(۹۲) قرار دیا جانے لگا۔ حسرت نے یہ شہرت ایسے دور میں حاصل کی تھی جب ہر طرف صنفِ غزل معیوب و نامسعود گردانی جا رہی تھی۔ ایسے کڑے وقت میں ایک دم توڑتی ادبی روایت کی مسیحائی کرنا کسی پیکرِ انقلاب ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''حسرت کا کمال یہ ہے کہ غزل جس کا ''دیس نکالا'' ہو چکا تھا، اسے پھر سے سماج میں آباد کیا۔''(۹۳)

اردو غزل میں حسرت کا یہ مقام و مرتبہ بلاشبہ روایتی تغزل کی باز آفرینی کا نتیجہ ہے مگر ان کی شاعری کے سیاسی تناظرات بھی کچھ کم قابلِ ستائش نہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے ایک وقیع مضمون ''مولانا حسرت موہانی کی عاشقانہ شاعری'' میں موصوف کے حیاتی محرکات واضح کیے ہیں۔ اس میں حسرت کے تخلیقی وجدان کے محرکِ اوّل ابوالہاشم رسوا نامی کسی ہم مکتب سے لے کر قبرص، یونان اور اٹلی کی حسیناؤں تک کی خبر لا کر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ موصوف کی شاعری انھی دل رباؤں سے حسن معاملہ کا نتیجہ ہے۔(۹۴) یہ تنقیدی گرہ کشائی بہت صائب لگتی ہے تاہم ایک نکتے کی گنجائش یہاں ضرور ہے کہ حسرت کی یہ تمام تر عشق بازی اپنے معاصر تناظرات سے لاتعلق نہیں۔ یوں تو انھوں نے سیاسی مسائل پر خارجی اسلوب کی حامل غزلیں بھی

لکھی ہیں مگر ان کی بہت سی روایتی غزلیں بھی ایک سیاسی زاویۂ اظہار رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے انھیں ایسی ہی فکری رنگارنگی کی بنا پر ''چومکھ شاعر'' کہا ہے۔ (۹۵) یہ ذومعنویت حسرت کا اختصاص نہیں بل کہ اردو غزل کا ایک قدیمی چلن ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں آکر عاشق، معشوق، رقیب، پیام بر، حسن، تاثیر حسن، غزل کے مختلف کرداروں کا مزاج، عادات و خصائل وغیرہ عصری تناظر سے مربوط ہو کر بدلے بدلے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں حسرت کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الرحمٰن لکھتے ہیں:

''انھوں نے معاملاتِ حسن و عشق کے پہلو بہ پہلو معاشرتی حالات کو ان کے روابط اور اجتماعی زندگی کو اس کے اصل تعلقات میں سمجھنے کی کوشش کی تھی۔'' (۹۶)

حسرت نے خود بھی اپنی غزلیات کی طرفہ معنویت کا کئی جگہ شعری اظہار کیا ہے:

جدّت میں ہے لاثانی حسرت کی غزل خوانی
کیا طرفہ مطالب ہیں، کیا تازہ قوافی ہے (۹۷)

مجازی عشق بھی اک شے ہے لیکن
ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی (۹۸)

موصوف کی عشقیہ شاعری کے سیاسی مضمرات ذیل کے اشعار سے بہ آسانی سمجھے جا سکتے ہیں:

منشائے ناز یار یہی ہے کہ عمر بھر!
رکھے نیاز مند مجھے، مبتلا مجھے! (۹۹)

سر اٹھائے بزم جاناں میں بھلا کس کی مجال
رعب غالب ہے یہ اس کے جلوۂ مغرور کا (۱۰۰)

بازار ہے گو غرب میں خوبانِ جہاں کا
پر گل کی طرح حسن بھی کم بو ہے یہاں کا (۱۰۱)

متذکرہ بالا آخری شعر جس غزل کا مطلع ہے، یہ پوری غزل مغربی تہذیب پر ایک ہجو بلیغ کی مثال ہے۔ اپنے معنی کے نوآبادیاتی سروکار کی وجہ سے حسرت کی غزل میں روایتی عاشق نئے رنگ ڈھنگ اور بدلی بدلی خوبو کا مظاہرہ کرتے ملتا ہے:

گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ
لیکن ہجوم شوق نے مجبور کر دیا (۱۰۲)

نالۂ دل میں تھا غضب کا اثر
ہل گئی جس سے عرش کی زنجیر (۱۰۳)

اس شعر سے ملا کر داغ دہلوی کا وہ معروف شعر پڑھیے جسے سن کر بہادر شاہ ظفر پھڑک اٹھے اور انھوں نے مبینہ طور پر داغ کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا: (۱۰۴)

ہوئے مغرور وہ، جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے (۱۰۵)

دونوں اشعار نہ صرف اپنے اپنے خالق شعرا کا مزاحمتی رویّہ ظاہر کر رہے ہیں بل کہ ان سے تحریک مزاحمت کی دو مختلف منازل کا بھی پتا چلتا ہے۔ داغ کے دور میں اگر جذبۂ آزادی نالہ و شیون کی نارسائیوں کا شکار ہو چلا تھا تو عہد حسرت تک آتے آتے یہی جذبہ فلک شگاف نعروں میں بدل جاتا ہے۔ اس ارتفاع یافتہ نالۂ شوق کی ترجمانی اقبال اور حسرت نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں کی ہے۔ حسرت نے اپنی غزل میں جو عاشق متعارف کروایا ہے وہ غزل کے روایتی حرماں نصیب، بے کس، لاچار اور مقہور و مردود عاشق سے بہت مختلف ہے۔ ان کی غزل کے اشعار "طرفہ مطالب" ہیں جو بسا اوقات موصوف کی ریڈیکل شخصیت کی سوانح کہنے لگتے ہیں۔ اس ذوجہتی اظہار کے بارے میں ڈاکٹر فخر الحق نوری لکھتے ہیں:

"حسرت کا کلام مجاہد عاشق کا کلام معلوم ہوتا ہے جو عشق اور آزادی دونوں میں حوصلہ و امید کے ہتھیاروں سے آراستہ اور ولولۂ عمل سے مسلح ہے۔" (۱۰۶)

جب ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ کا احتجاجی جلسہ خوں ریز حادثے سے دوچار ہوا اور علاقے میں مارشل لا لگا دیا گیا تو اس سڑک پر جہاں مسز سانڈرس نامی ایک انگریز عورت کو اینٹ مار کر ہلاک کیا گیا تھا، ایک پولیس چوکی بنادی گئی۔ حکمِ حاکم تھا کہ یہ سڑک صرف پیٹ کے بل رینگ کر ہی پار کی جاسکتی ہے۔ مسٹر گاندھی اس کارروائی سے چشم پوشی برت رہے تھے مگر حسرت نے کانگرس کے اجلاس سے اس سلسلے میں واک آؤٹ کیا اور سیدھے امرتسر آکر اس توہین آمیز کارستانی کی کھلے عام حکم عدولی کی۔ موقع پر موجود چیک پوسٹ انچارج کو ان پر گولی چلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ بعدازاں جب کوتاہیِ فرض پر اس ڈیوٹی آفیسر کی جواب طلبی ہوئی تو اس کے پیش کردہ اعتذار کی ترجمانی کرتے ہوئے شکیل احمد ضیا لکھتے ہیں:

''میں نے اس شخص پر جس کا نام حسرت موہانی ہے، گولی نہ چلا کر ہندوستان میں برطانوی راج کی عمر بڑھادی ہے۔''(۱۰۷)

اس واقعاتی تناظر میں ان کی ''عشقیہ شاعری'' کی یہ ابیات ملاحظہ فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ آیا یہ حسن وعشق کی محض فرضی گھاتیں ہیں جسے حسرت جیسے ''گناہ گار صالح'' نے محض روایتی شعر گوئی کے طور پر اکہری اور یک سطحی معنویت دی ہے،(۱۰۸) یا ان میں کچھ سیاسی اور معاشرتی وقوعیات بھی بین السطور کارفرما محسوس ہوتے ہیں:

مجمعِ اہلِ شوق کا عذر بھی تم نے کچھ سنا
یا یوں ہی از رہِ جفا حکمِ قتال کر دیا(۱۰۹)

وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری(۱۱۰)

ہم سر جھکا چکے تھے، علم ہو چکی تھی تیغ
پھر کیا کیا خیال کہ قاتل ٹھہر گیا(۱۱۱)

عشق میں خوفِ جاں سے درگزرے
ہم نے ٹھانی جو دل میں کر گزرے (۱۱۲)

خدالگتی کہیے، کیا یہ ایک روایتی عاشق کی عرض معروض، خود کلامیاں اور جاں سپاریاں ہیں یا ان میں ایک انقلاب پسند مجاہد اپنے ہاتھوں میں درفشِ کاویانی تھامے شاہراہِ آزادی پر سرگرم عمل دکھائی دیتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا حسرت نے اپنی غزلوں میں نوآبادیاتی فرہنگِ عشق کو استعمال میں لاکر مزاحمتی تحریک کی معاصر تاریخ رقم کی ہے۔ ان کی شاعری میں عشق کو عشق محض خیال کرنے اور اس کی محدود معنویت پر مصر رہنے کو ابوالکلام قاسمی ایک الزام تراشی خیال کرتے ہیں۔ (۱۱۳) حسرت نے دراصل ''جمال یار میں کسبِ حال'' کو اپنی شاعری کا نقطہ ماسکہ بنایا ہے۔ ان کی طبیعت اگر ''طرفہ تماشا'' ہے تو غزل خوانی بھی ''طرفہ مطالب'' کی حامل ہے۔ موصوف کے کثیر الجہات اسلوبِ فن پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ:

''حسرت نے تصوف، سیاست اور عاشقی کی آمیزش سے ایک معتزلانہ وحدت تیار کی ہے۔'' (۱۱۴)

مولانا حسرت نے بڑی مقبول و مرغوب شاعری کی مگر حیرت ہے کہ ان کے قول و فعل میں بھی غضب کی مطابقت تھی۔ سن بلوغت کو پہنچتے ہی ان کی کارگاہِ فکر میں فرنگی استعماریت کے خلاف نہایت بے لچک فکر و فلسفہ کے نشتر ڈھلنے لگے۔ وہ اپنی تنقیدی آرا کے اظہار میں مصلحت کوشی یا لگی لپٹی رکھنے کے ہرگز روادار نہ تھے:

لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو
کہ ہے بیزار اس شے سے میرا دل (۱۱۵)

خوشنودیٔ فجار کے پیرو ہیں یزیدی
تقلید شہ کرب و بلا میرے لیے ہے (۱۱۶)

اعلون کی تصدیق پسِ پشت ہے حسرت
مسلم ہیں تو دب کر نہ رہیں گے بخدا ہم (۱۱۷)

حسرت کے فکری آثار سے اس بات کی بین تصدیق ہوتی ہے کہ ان کی استعمار مخالف سرگرمیوں کا جذبۂ محرکہ مطلقاً مذہبی تعلیمات سے ماخوذ تھا۔ ان کی غزل میں داعی حریت رسول اکرم ﷺ، حضرت امام حسینؓ اور غوث اعظمؒ جیسی مقدس ہستیوں سے فرنگی استبداد سے نجات کے سلسلہ میں استغاثہ کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان باتوں سے کہنا یہ مطلوب ہے کہ انھوں نے تنقید مغرب کے ضمن میں کسی زمانہ سازی اور مصلحت کوشی کا شکار ہوئے بغیر نہایت بے باک اور دوٹوک رویہ اختیار کیا ہے:

رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبِّ وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے (۱۱۸)

کس درجہ فریب سے ہیں مملو
تجویز ریفارم مانٹیگو! (۱۱۹)

واقف ہیں خوب آپ کے طرزِ جفا سے ہم
اظہارِ التفات کی زحمت نہ کیجیے (۱۲۰)

برطانوی جبر و اکراہ کا سلسلہ صرف ہندوستانی سرزمین تک محدود نہ تھا بل کہ اس کی نو آبادیات کرۂ ارض کے ایک وسیع حصے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ مشہور تھا کہ فرنگی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ مغربی امپیریل ازم ہر طرف اپنے پاؤں پسارے ہوئے تھی۔ حسرت نے ایسے بین الاقوامی امور اور باہر کی مسلم دنیا میں برطانوی گھس بیٹھ پر کھل کر تنقید کی ہے:

سمجھے ہیں اہل شرق کو شاید قریب مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام (۱۲۱)

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دست پیغمبرؐ میں ہے

قلتِ افواج ٹرکی پر نہ ہو اٹلی دلیر
ایک ہے سو کے لیے کافی جو اس لشکر میں ہے (۱۳۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ اس غزل میں آفاقیت تو در آئی مگر واقعہ یہ ہے کہ غزل غزل نہیں رہی، محض ایک منظوم بیانیہ بن گئی ہے۔ حسرت کے کلام میں درجن بھر غزلیں ایسی ضرور ہیں جن میں خارجی عوامل کا خمیر داخلیت سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث تغزل پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ دراصل اس عہد میں اردو غزل ایک تجرباتی مرحلے سے گزر رہی تھی۔ وقت کی قاہر قوتوں کا اقتضا یہ تھا کہ شاعر اپنے ذوق کی تسکین کے لیے تخلیقی اظہار کرنے کے بہ جائے سماجی فرائض نبھاتے ہوئے اپنے محسوسات وخیالات کی ترجمانی پر اکتفا کرے۔ مقدمہ حالی اسی سماجی ضرورت کی ایک منضبط صورت ہے۔ مسئلہ یہ درپیش ہے کہ تخلیقی قرینے میں تغیر وتبدل ریل کا کانٹا بدلنے جیسا عمل نہیں۔ اس میں مصنف، قاری اور زمانہ کے سہ ابعادی عوامل مسلسل کارفرما رہتے ہیں۔ عمومی فکر وخیال کو تخلیقی اظہار کا ارتفاع عطا کرنا کارِ کارگزاراں ہے تاہم بہ حیثیتِ مجموعی اس صنفِ شعری کو نشاتِ ثانیہ اور جدید اظہاری قرینہ عطا کرنے میں حسرت ایک سنگِ میل کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

مولانا حسرت کو اپنے شدید تنقیدی رویے کی بنا پر تاحین حیات حکومتی مخالفت کا سامنا رہا جس کا آغاز ان کے زمانہ طالب علمی ہی سے ہو چلا تھا۔ بیسویں صدی کا عشرۂ اول ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں شدید اتھل پتھل کی وجہ سے حسرت کی زندگی میں ایک انقلاب کا باعث بنا۔ سرسید احمد خاں اور راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی کاوشیں سیاسی فعالیت میں ڈھل گئی تھیں۔ بنگال ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کا مرکز تھا اور لارڈ کرزن نے اس صوبے کی سیاسی مرکزیت ختم کرنے کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پروفیسر سحر انصاری نے فرنگی کی اسی چال کو جدوجہد آزادی کا نقطۂ آغاز کہا ہے۔ (۱۳۳) اگرچہ مقامی مسلمانوں کے لیے یہ اقدام نہایت مفید تھا اور انھوں نے اس کی ستایش بھی کی تاہم بہ حیثیت مجموعی اس سے آزادئ کامل کا حصول شدید خطرے میں پڑ گیا۔ لہٰذا اس تقسیم کے خلاف پرزور احتجاج اٹھا۔ کانگرس نے سودیشی مال کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

حسرت اس سودیشی تحریک میں شامل اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔ انھوں نے اس تحریک کی حمایت میں اُردوے معلا میں متعدد مضامین لکھے اور اپنی ذاتی نگرانی میں ایک دیسی سٹور قائم کر کے عملاً اسے موثر بنانے کی کوشش کی۔ جب ۱۹۰۷ء میں کانگریس کے ایک جلسے میں انھیں احساس ہوا کہ اس جماعت کا ایک حصہ کامل آزادی کے حصول کے بہ جاے برطانوی حکومت کے ساتھ مفاہمت کر کے آزادی کا خواہاں ہے تو وہ اپنے پسندیدہ رہنما تلک کی پیروی میں کانگریس سے علاحدہ ہو گئے۔ (۱۳۴) اگلے ہی سال یعنی ۱۹۰۸ء میں حسرت کے جاری کردہ مجلّے اردوے معلا میں ایک سیاسی مضمون ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' چھپا جسے علی گڑھ کے ایک مسلم طالب علم اقبال سہیل نے لکھا تھا۔ اس مضمون میں اہلِ فرنگ کی نوآبادیات سے متعلق شاطرانہ پالیسی کا بڑی بے باکی سے بھانڈا پھوڑا گیا تھا۔ سرکاری باز پرس پر حسرت نے مضمون نگار کا نام بتانے سے انکار کر دیا اور دو سال قید بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا قبول کر لی۔ ان کا انتہائی وقیع اور نادر کتب خانہ نیلام کر کے جرمانے کی رقم وصول کی گئی۔ جیل میں حسرت پر جو قیامتیں توڑی گئیں ان کا احوال موصوف کے منظوم و منثور ہر دو قسم کے تخلیقی آثار میں ملتا ہے۔ ان کا یہ شعر اسی پہلی گرفتاری کا ترجمان ہے:

حادثے سن آٹھ میں گزرے بہت اب دیکھیے
کیا دکھائے گردش لیل و نہار اب کے برس (۱۳۵)

حسرت اپنی مزاحمتی سرگرمیوں کی بنا پر تین دفعہ قیدِ فرنگ کا شکار بنے مگر یہ قید و بندان کی حریت پسندانہ جوش و جذبے میں کمی کے بہ جاے مزید اضافہ کا باعث بنی۔ انھوں نے ان ایام اسیری کی روداد اپنے کتابچے ''قیدِ فرنگ'' (۱۳۶) میں بیان کی ہے۔ یہ اسیری نامہ ۱۸۵۷ء کے بعد منظرِ عام پر آنے والی اہم حبسیہ نگارشات مثلاً کالا پانی (مولانا جعفر تھانیسری) اسیرِ مالٹا (مولانا حسین احمد مدنی) اور پسِ دیوارِ زنداں (شورش کاشمیری) وغیرہ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ حسرت کی زندگی کا یہ جذباتی پہلو ان کی غزل میں بھی پوری آب و تاب سے در آیا ہے۔ ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''حسرت کی بہترین غزلیں ان کے قید خانے کی مرہونِ منت

ہیں۔۔(۱۲۷)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد اسیری کے تمام تجربات مثلاً کوڑے کھانا، چکی پیسنا، جرمانہ کی ادائیگی، جیل حکام کی ترش کلامی و بدسلوکی وغیرہ کو بڑے سلیقے سے اپنے شعری سرمائے میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان کی غزلیات میں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے موصوف کا نظریۂ حبسیات بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے:

چمنِ جاں میں پھر بہ قید فرنگ
عاشقی کی بہار آتی ہے(۱۲۸)

مایۂ عشرتِ بے حد ہے غم قید وفا
میں شناسا بھی نہیں رنج گرفتاری کا(۱۲۹)

درس حق جاری ہے یاں بھی حسرت آزاد کا
قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا(۱۳۰)

ہوتی ہے روز بارش عرفاں میرے لیے
گویا بہشت عشق ہے زنداں مرے لیے(۱۳۱)

یوں تو طوق وسلاسل اور قفس و زنداں کے حوالے ہماری روایتی غزل میں عام ملتے ہیں مگر ۱۸۵۷ء سے ماقبل حبسیات کی یہ شعری علامتیں عموماً روایتی عشق و جنوں کی سرمستیاں دکھانے کے لیے شعرا نے اپنی غزلیات میں استعمال کی ہیں۔ غالب نے اگر ایک دفعہ (مئی ۱۸۴۷ء تا اگست ۱۸۴۷ء) حوالات دیکھی بھی تو کسی قومی جدوجہد میں نہیں بل کہ محض قمار بازی کے جرم میں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تاثراتِ اسیری یک گونہ کرب واذیت سے مملو ہیں:

قید میں بھی تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ زنجیر بھی تھا(۱۳۲)

غالب اپنی جدّت پسند طبع سے اس سانحہ اسیری کا کوئی خوش کن پہلو تراشتے بھی ہیں تو وہ حسرت کی طرح عرفانی و وجدانی نوعیت کا حامل نہیں بل کہ روٹی، پانی اور کپڑے لتّے کے جنجال سے چھوٹنے کی معاشی جہت میں الجھا ہوا ہے:

شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند (۱۳۳)

اس کے برعکس حسرت جو سراپا حرّیت تھے، قید و بند کی چنداں پروانہیں کرتے۔ ان کی جیل کی زندگی اس قدر کڑی تھی کہ دوسرے سیاسی قیدیوں (بہ شمول گاندھی، نہرو اور علی برادران) کی سزائیں جو "خلافت"، "عدم تعاون" یا "ہندوستان چھوڑ دو" جیسی تحاریک کے ردِ عمل میں انھیں بھگتنا پڑیں، محض تفریح معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی حبسیاتی زندگی کی مثال تلاش کریں تو نیلسن منڈیلا کا عہد اسیری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ (۱۳۴) افسوس ناک بات یہ ہے کہ قومی سطح پر اس عظیم مردِ حر کو بہ وجوہ نظر انداز کر دیا گیا جس کی بنا پر ہماری نئی نسل حسرت جیسے "مجنونِ آزادی" (۱۳۵) کی صحیح شناسائی سے قاصر رہی۔ یہ درست ہے کہ قیام پاکستان کے وقت حسرت ہندوستان میں رہے مگر انھوں نے اپنے بہت سے تحفظات کے باوجود اس مملکتِ خداداد پر کبھی تنقید نہ کی اور مزید یہ کہ بھارت میں ان کا ٹھہراو ان مسلمانوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا جو کسی نہ کسی وجہ سے پاکستان نہ آپائے۔ آزادی کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں حسرت کی نظر میں کچھ معنی نہ رکھتی تھیں۔ ان کے جملہ ادبی اور صحافتی آثار میں کہیں بھی "رنجِ گراں باریٔ زنجیر" کا تاثر نہیں ملتا۔ اس ضمن میں حسرت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہو جنھیں شوقِ شہادت انھیں کیا خوف بھلا
قید کا مرحلۂ نرم اگر ہے درپیش (۱۳۶)

خوشی سے ختم کر لے سختیاں قید فرنگ اپنی
کہ ہم آزاد ہیں بیگانۂ رنجِ دل آزاری (۱۳۷)

اسمِ اعظم ہے قیدیوں کے لیے
قید میں بے گماں درود شریف[۱۳۸]

روح کو محو جمالِ رخِ جاناں کر لیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کر لیں[۱۳۹]

حسرت کا یہ شعر تو ان کے ادبی سرمائے کا شناختی نشان بن چکا ہے:

ہے مشقِ سخن جاری ، چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی[۱۴۰]

بلاشبہ یہ حبساتی غزلیں فرنگی استعمار کے پر آشوب عہد غلامی کی اہم دستاویزات ہیں۔ ان میں شاعر نے کمال مہارت سے مزاحمتی کلامیے کو تغزل عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسرت کی ایسی ہی غزلیات کو پزیرائی بخشتے ہوئے ڈاکٹر احمد لاری لکھتے ہیں کہ "دراصل جیل کے ایام کی غزلوں ہی نے حسرت کو حسرت بنایا۔"[۱۴۱]

چند استشنائی مثالوں سے قطع نظر موصوف نے جہاں بھی اپنی غزلوں کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے ان میں نہ صرف جوش اور انقلابی آہنگ پورے طور پر در آیا ہے بل کہ تغزل بھی بہ حیثیت مجموعی اپنے معیار پر برقرار محسوس ہوتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ معاصر وقوعیات کی تعمیم کاری اور اسے ایمائی رنگ میں لا کر غزل کے کلاسیکل طرز اظہار کا حصہ بنانے میں انھیں وہ ملکہ حاصل نہ ہوا جو اقبال یا بعد ازاں فیض کا طرۂ امتیاز بنا۔

حسرتؔ آزادیِ کامل کے سرگرم حامی تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۹ء کے کانگریسی جلسے سے واک آؤٹ کر کے اس سلسلے میں پہلا باقاعدہ عملی مظاہرہ کیا۔ وہ فرنگی استعماریت سے غیر مشروط آزادی سے کم کسی حیثیت پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔[۱۴۲] ڈاکٹر محمد علی صدیقی انھیں کامل آزادی کا مطالبہ کرنے والا برصغیر کا پہلا سیاسی رہنما قرار دیتے ہیں۔[۱۴۳] ان کے خیال میں حصول آزادی کے تین ممکنہ راستوں: درخواست گزاری، تصادم اور دفاعی مزاحمت، میں سے مؤالذکر ہی موزوں ترین تھا اور اس کے لیے انھوں نے سودیشی تحریک جیسی ہر مزاحمتی سرگرمی میں

بھرپور حصہ لیا۔[۱۴۴] تاہم آگے چل کر ایسے حالات پیش آئے کہ انھیں اپنا طریقِ مزاحمت تبدیل کر کے انتہا پسندانہ سرگرمیاں اپنانا پڑیں۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری نے بالکل بہ جا طور پر لکھا ہے کہ "وہ تحریک آزادی کو کسی جنگ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔"[۱۴۵] جب ۱۹۱۳ء میں کان پور کے مچھلی بازار کی ایک مسجد کا تنازعہ☆ بنا تو حسرت نے مسلمانوں کے اکابر مذہبی رہنماؤں سے مل کر شدید ردعمل ظاہر کیا۔ انھوں نے انقلابی رجحان رکھنے والے مسلم نوجوانوں پر مشتمل ایک جماعت "مجلس احرار" تشکیل دینے پر بھی ان اکابرین کو آمادہ کیا۔ اسی بنا پر حسرت کو "سیدُ الاحرار" اور "رئیس الاحرار" کہہ کر مخاطب کیا جانے لگا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی ریشمی رومال تحریک☆ میں بھی انھیں ایک اہم رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔ الغرض ہندوستانی سماج کا ہر وہ رجحان یا تحریک جو فرنگی حکومت سے مزاحم ہو کر آزادی کے لیے سرگرم عمل ہو، حسرت اس کا جزوِ لاینفک تھے۔ ان کی غزل میں حریت و آزادی کے یہ تمام مناظر موجود ہیں:

حریّت کامل کی قسم کھا کے اٹھے ہیں
اب سایۂ برٹش کی طرف جائیں گے کیا ہم[۱۴۶]

تحریک حریت کو جو پایا قرین حق
ہر عہد میں معاونِ تحریک ہم رہے[۱۴۷]

انھوں نے اپنی غزل میں حبِ وطن، اتحادِ باہمی، جوشِ حریّت، غلامی کی مذمت، آزادی کی برکات اور اس کے حصول کے روشن امکانات کا بار بار تذکرہ کیا ہے؛ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی[۱۴۸]

کچھ شک نہیں اس میں کہ وطن کی ہے ترقی
ہم رشتگیٔ سبحہ و زنار پہ موقوف[۱۴۹]

غلبۂ حق کا زمانے پہ ہے اک شور بپا
اس پر افسوس جو بیدار نہ ہونے پایا(۱۵۰)

ابھی دیکھی نہیں گستاخیاں جوشِ تمنا کی
تمھاری کم نگاہی التماسِ بے زباں تک ہے(۱۵۱)

ساقی سے فصلِ گل میں کریں کیوں سوال مے
کیا التماس کی بھی ضرورت ہے آج کل(۱۵۲)

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزل مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم(۱۵۳)

حسرتؔ کی بعض پوری پوری غزلیں اسی مزاحمتی کلامیے کی ترجمان ہیں۔ مثلاً ذیل کے مطلع جات جن غزلیات کے نمائندہ ہیں ان میں انھوں نے بہت مربوط انداز میں سامراج دشمنی اور مستقبل سے متعلق اپنے فکر ونظر کو بیان کیا ہے:

اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبّ وطن تمام(۱۵۴)

رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبّ وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے(۱۵۵)

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر(۱۵۶)

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبرؐ میں ہے(۱۵۷)

ان غزلیات میں موڈ کی یکسانیت اور معنوی یک رنگی کا وہ وصف بہ درجۂ اتم موجود ہے جس کے عدم وجود پر غزل مخالف رجحان کو تقویت ملی تھی۔ شاید حسرت کے ہاں غزلِ مسلسل کا یہ رجحان ہی انھیں کلیم الدین احمد ایسے غزل مخالف نقاد کے لیے بھی قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔ (۱۵۸)
مولانا حسرت بال گنگا دھر تلک کو منزل حریت کا سچا سالک خیال کرتے تھے لہٰذا انھوں نے عمر بھر اسے اپنا پیرِ طریقت بنائے رکھا۔ ایک غزل میں تو موصوف نے تلک کو بہ طور خاص موضوع بنا کر غزل کی سرحدات نظم سے جاملائی ہیں:

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن (۱۵۹)

جذبۂ آزادی کے فروغ وارتقا، مصلحت کیش قیادت کی مذمت اور حریت پسند رہنماؤں کی مدح سرائی جیسے امور ان کے ہاں بہ کثرت ملتے ہیں:

جسے کہتے ہیں اہمسا اک اصول خودکشی تھا
عمل اس پہ کوئی کہتا، نہ کبھی عوام کرتے (۱۶۰)

حق سے بہ عذر مصلحت، وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر (۱۶۱)

اُردو غزل کی روایت میں حسرت نے اپنے انقلابی اسلوب سے اظہار مطالب کے نئے آفاق متعارف کروائے ہیں۔ شاعری میں سادگی، اصلیت اور جوش کے جو اصول حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری کے ذریعے پیش کیے تھے، اس کے اولین کام یاب نمونے ہمیں حسرت ہی کی غزل میں ملتے ہیں۔ انھوں نے اس صنف سخن کو تخیلاتی بھول بھلیوں سے نکال کر زندگی کی حقیقی تلخ و شیریں حسیات کا ترجمان بنایا۔ اگر اس دور کے غزل مخالف شعری منظرنامے کے تناظر میں حسرت کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیں تو اس صنفِ سخن کی بقا و فلاح میں ان کا مقام اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تحریک آزادی کے ایک ناقابل فراموش کردار تھے اور ان کی غزلیات میں ایک اہم خصوصیت اسی تحریک کی ہم نوائی سے عبارت ہے۔

ترقی پسند شعرا کی غزل گوئی

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں بین الاقوامی سیاست زبردست انقلاب وانتشار کا شکار رہی۔ پہلی جنگ عظیم کی ہول ناک تباہی، روس میں اشتراکی انقلاب اور فاشزم کی صورت میں دوسری عالم گیر جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرات نے بڑی گھمبیر صورت حال پیدا کر رکھی تھی۔ اس نازک مرحلے سے نکلنے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے دانش وروں نے ۱۹۳۵ء میں ایک ادبی جماعت ''انجمن ترقی پسند مصنّفین'' تشکیل دی تا کہ ان سلگتے عصری مسائل کا جائزہ لے کر تخلیقی سطح پر انسانیت کی ذہن سازی کی جا سکے۔ اس جماعت کی طرز پر ہندوستان میں بھی اسی نام کی ایک انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں ملک کی نامور ادبی شخصیات نے شمولیت اختیار کر کے اسے چالیس کی دہائی کے توانا ترین ادبی رجحان میں تبدیل کر دیا۔ شعروشاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس تحریک میں حسرتؔ، فراقؔ، جوشؔ، مجروحؔ، فیضؔ اور جذبیؔ وغیرہ خاص طور پر نمایاں ہیں۔ یہ تحریک ماضی کے تقریباً تمام تر ادب کو فرسودہ اور جاگیردارانہ سماج کی پیداوار سمجھتے ہوئے مسترد کر کے ٹھیٹ حقیقت نگاری پر اپنی ادبی اساس استوار کرنا چاہتی تھی۔ ترقی پسند مصنّفین کی تخلیقات میں بھوک، طبقاتی تقسیم، سرمائے کا ارتکاز، سماجی اقدار کی پامالی اور غلامی کی مذمت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی، انسان دوستی، معاشی مساوات، یکساں تعلیمی مواقع اور حریّت وآزادی جیسی اقدار کی ترویج پر خاص زور دیا گیا۔ اس تحریک سے منسلک تمام ادبا باقاعدہ ایک منشور کے پابند تھے اور ان کی ادبی نگارشات بھی اس منشور کی معینہ حدود میں رہتی تھیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے ادبی دنیا میں اس نوع کی منظم نظریہ سازی کو ''اردو میں نئی آواز'' قرار دیا ہے۔ (۱۶۲) عمومی طور پر ادبی دنیا اس تحریک کو ''ایک بیرونی اور غیر ہندوستانی شے'' خیال کرتی ہے (۱۶۳) جو کسی طور غلط بھی نہیں۔ بلاشبہ یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا منتہائے مقصود روسی طرز پر اشتراکیت کا نظام قائم کرنا تھا۔ اس تحریک کے باقاعدہ اجرا سے کچھ پہلے جب اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' (۱۶۴) منظرِ عام پر آیا تو ناقدین نے اسے ''سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ'' (۱۶۵) قرار دیا تھا۔ یوں

گویا شروع سے ہی یہ تحریک شدید تنقید کی زد میں آ گئی تھی۔ اس کی فعالیت کا زمانہ بالعموم ۱۹۳۶ تا ۱۹۴۷ء یعنی تقریباً گیارہ سال بنتا ہے۔ اس کے بعد یہ تحریک ۱۹۵۳ء تک آتے آتے بالکل غیر موثر ہو گئی تھی۔

زیر نظر موضوع یعنی اردو غزل کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ گیارہ سال کا مختصر سا عرصہ بھی اپنے ممکنہ سرمایۂ غزل سے کافی حد تک محروم رہتا ہے۔ اس تحریک کے اکثر ادبی مفکرین اردو غزل کو جاگیرداری نظام کی بوسیدہ باقیات خیال کرتے ہوئے قابلِ اعتنا ہی نہ جانتے تھے اور یوں بھی ان کے منشور کو تخلیقی پیرہن عطا کرنے کے لیے نظم زیادہ موزوں تھی لہٰذا انھوں نے اپنی زیادہ تر توجہ اسی پر بنائے رکھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

"ترقی پسند تحریک کے بعض مفتیانِ دین نے غزل کو فرسودہ اور جاگیردارانہ نظام کی پروردہ صنفِ سخن کہہ کر اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی ابتدا کی۔"(۱۶۶)

حفیظ جالندھری نے اپنے ایک تمثیلی مضمون میں ترقی پسند مصنفین کو صنفِ غزل کے قاتل ٹھہرایا ہے۔(۱۶۷) ترقی پسندوں کے ہاں غزل سے یہ گریز پائی اس صنف کے جاگیردارانہ نظام سے انسلاک اور علامتی طرزِ اظہار کی بدولت تھی۔ اصل میں یہ لوگ تحریک کے سیاسی منشور پر اپنے بڑھے ہوئے اعتقاد کی وجہ سے تاریخی مادیت کے اس اصول کو سمجھنے میں تسامح برت رہے تھے کہ ہر نئی چیز کی بنیاد پرانی چیز پر استوار ہوتی ہے۔ ایک نئے ادبی شاہ پارے کی تخلیق میں جس خام مواد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ادبی روایت ہی سے میسر آتا ہے۔ اس تحریک سے قبل اگر ہم غزل کے روایتی سرمایے میں اشتراکی طرزِ فکر سے ہم آہنگ اشعار کا جائزہ لیں تو ہمیں یہاں اس کے بہت سے آثار نظر آئیں گے؛ مثال کے طور پر چند ایک شعر دیکھیے:

منعم موذی کے گھر کو اہل حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور کا(۱۶۸)

بارِ غم سے سایۂ گیسو میں ہے دل کا فراغ
شام کر دیتی ہے چھٹکارا ہر اک مزدور کا(۱۶۹)

نہ کیوں افسوس آئے کوہ کن کی بدنصیبی پر
ہر اک مزدور اجرت کام کی، محنت کی لیتا ہے (۱۷۰)

حسرت موہانی بھی اس تحریک کے پیش رووں میں شامل تھے بل کہ ان کی ذات تو ترقی پسند فلسفے کا ایک استعارہ بن گئی تھی۔ موصوف کے کلام سے کچھ شعری مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخے
لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم (۱۷۱)

سوّیت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرتؔ کی غزل خوانی نہیں جاتی (۱۷۲)

دستور کے اصول مسلم ٹھہر چکے
شاہی بھی رام غلبۂ جمہور ہو چکی
سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہوں
معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی (۱۷۳)

ناقدین نے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ وغیرہ کے ہاں بھی ترقی پسندانہ آثار کی نشان دہی کی ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اردو غزل بہ خوبی اس تحریک کی ترجمانی کر سکتی تھی مگر بہ ایں ہمہ اس صنف سے بیزاری، ترقی پسند تحریک کی سیاسی وابستگی اور اشتراکی فلسفے کی مقلدانہ پاس داری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہاں اس امر سے صرف نظر کرنا مشکل ہے کہ مذکورہ بالا شعروں میں حسرتؔ کے ہاں ترقی پسند سوچ محض ایک سیاسی پروپیگنڈا بن گئی ہے۔ یہی وہ لزام ہے جو عموماً اس تحریک کی ادبی نگارشات پر لگایا جاتا رہا۔ تاہم بعض دوسری تحریکوں کی طرح اس انجمن میں بھی مختلف الخیال مفکرین موجود تھے۔ (۱۷۴) لہٰذا بعض نے صنف غزل کو اپنایا اور اس میں معاصر سیاسی شعور اور اپنے مقرر کردہ اہداف کا بہ خوبی اظہار کیا۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر صرف ان شعرا کے کلام سے کچھ شعری مثالیں پیش کرتے ہیں جن کی تخلیقات ہماری مقررہ زمانی حد بندی یعنی

۱۹۴۷ء سے قبل منظر عام پر آ چکی تھیں:

اس سلسلے کا سب سے پہلا نام ایم۔ڈی تاثیر کا ہے۔انھیں اس تحریک کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔اگرچہ وہ طبعاً نظم گو تھے اور ان کی غزلیں دراصل مشقِ سخن ہی کے ضمن میں آتی ہیں۔(۱۷۵) تاہم ان میں بعض اشعار فکری پختگی اور فنی مہارت کی بنا پر قابلِ حوالہ ہیں:

کس طرح صیاد پھیلاتا رہا دام فریب
سہمے ، سمٹے ہم اسیرِ آشیاں دیکھا کیے(۱۷۶)

منہ سے کچھ بولیں تو گستاخ بتائے جائیں
اور جو چپ رہیے تو اس کا بھی گلا ہوتا ہے(۱۷۷)

کھیلی جائے گی نئے رنگ کی ہولی تاثیر
مے کشو، مژدہ ! کہ جلدی یہ تماشا ہو گا(۱۷۸)

قفس ٹوٹا بہار آئی یہ کیسا مجھ کو خواب آیا
چمن کا پتا پتا نعرہ زن ہے انقلاب آیا(۱۷۹)

اس انقلابی تحریک کا سب سے ممتاز نمائندہ جوشؔ (۱۸۹۸۔۱۹۸۲ء) ہے۔ان کے متعلق یہ مغالطہ خاصا عام ہے کہ وہ صنفِ غزل کے مخالف تھے۔اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں کہ ''جوشؔ دراصل غزل کے مزاج کے نہیں، غزل کی فارم یا ہیئت کے مخالف تھے۔''(۱۸۰)

جوشؔ کا مزاج غزل سے پوری طرح ہم آہنگ تھا، یہی وجہ ہے کہ موصوف کی نظموں میں بھی تغزل کی ایک کیفیت موجود ہے۔ان کے شعری مجموعے ''روح ادب'' اور ''سیف و سبو'' وغیرہ تحریک آزادی کے انقلابی دور میں منظر عام پر آ چکے تھے۔ان میں اگرچہ غزلوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تاہم ترقی پسندانہ فکر کے حوالے سے ان کے کچھ اشعار بہ طور نمونہ ضرور قابلِ ذکر ہیں:

صد شکر درسِ حکمت ناحق شناس کو
ہم نے رہینِ نعرۂ مستانہ کر دیا(۱۸۱)

علم کھول کر جوش بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر (۱۸۲)

وہ سیاہ بخت کن الفاظ میں فریاد کرے
جس کو تو مرحمت و لطف سے برباد کرے (۱۸۳)

بلاشبہ جوش کی غزلیں تند و تیز جذبے، پیہم جستجو اور سامراج پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے پرعزم سوچ کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں خطابت اور نعرہ زنی کا تاثر بسا اوقات ناگوار بھی گزرتا ہے۔ جوش کے اسی رنگ اور خطیبانہ لہجے کی تقلید بعض دوسرے ترقی پسند شعرا مجاز، مخدوم اور علی سردار جعفری وغیرہ نے بھی کی ہے۔ بعض ناقدین جوش کی اس ''درشتگی'' کو ان کی ''خاندانی صلابت اور اکھڑپن'' کا نتیجہ خیال کرتے ہیں (۱۸۴) مگر ان کا ہیجان خیز اور انقلابی ماحول اور ترقی پسند تحریک سے سرگرم تعلق بھی اس کاٹ دار اسلوب کے اہم محرکات تھے۔

اس تحریک میں فراق گورکھپوری (۱۸۹۶_۱۹۸۲ء) کا نام بھی نمائندہ شاعروں میں لیا جاتا ہے۔ وہ ایک پرجوش سیاسی رہنما تھے۔ جواہر لعل نہرو کے قریبی ساتھی ہونے کی بنا پر حکومتی ایوانوں میں ان کی آواز بڑی موثر تھی۔ فراق کی غزلوں میں انسانی بے چارگی، کرب ناک تنہائی اور جابر قوتوں کا استحصالی بندوبست مسلسل تغزل کی پوری شان سے ہم آہنگ ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اگرچہ فراق کی نجی زندگی بھی متنوع مسائل کا شکار رہی مگر انھوں نے غم ذات کو تخلیقی ارتفاع عطا کر کے غم کائنات بنا دیا ہے اسی لیے معاشرے کی ہر بدنظمی اور بے ترتیبی ان کے کلام میں موجود ہے۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی نے فراق اور فیض کو ترقی پسند تحریک کے نمایاں ترین شاعر کہا ہے۔ (۱۸۵) فراق نے اپنی غزل کا علامتی نظام ایسے آفاق گیر عناصر سے ترتیب دیا ہے جس سے انھیں نئی دنیا میں تراشنے اور استحصال سے پاک ایک جدید نظام کی نظریہ سازی میں بڑی مدد ملی ہے۔ فرنگی آقاؤں کے ظلم و استبداد اور غلامی کے روح فرسا احساس کے باوجود فراق کا لہجہ کہیں بھی قنوطی نہیں ہو پاتا۔ تلخ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور رجائیت فکر برقرار رکھنے کے لیے ان کا

کلام ایک سہارے کا کام کرتا ہے: چند مثالیں دیکھیے:

منازلِ ارتقا کے دھوکے زمانہ پہلے بھی کھا چکا ہے
کسی کو جس کی خبر نہیں ہے وہ انقلاب ایک بار ہوگا (۱۸۶)

اہلِ رضا میں شانِ بغاوت بھی ہو ذرا
اتنی بھی زندگی نہ ہو پابندِ رسمیات (۱۸۷)

بے محابا انقلاب آنے کو ہے
ہوشیار اے اہلِ دنیا، ہوشیار! (۱۸۸)

یہ جنگ کیا ہے لہو تھوکتا ہے نظمِ کہن
شگوفے اور کھلائے گا وقتِ شعبدہ باز (۱۸۹)

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز (۱۹۰)

اسیرانِ ستم نے اور ہی کچھ سوچ رکھا ہے
کریں آخر بسر بھی کرنے والے یوں بسر کب تک (۱۹۱)

نہ پوچھ ہے مری مجبوریوں میں کیا کس بل
مشیتوں کی کلائی مروڑ سکتا ہوں (۱۹۲)

فراقؔ کے کلام میں نئی حسیت کا واضح شعور موجود ہے۔ وہ ایک ایسے انقلاب کی خبر دیتے ہیں جو نوآبادیاتی سامراجیت کی سیاسی یا تہذیبی فکر کا ہرگز مرہون احسان نہ ہوگا۔ وہ اس خیال کے حامل تھے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کی جو تبدیلیاں انگریز لائے ہیں وہ دراصل اقتضائے وقت ہیں۔ اگر برطانوی قوت یہاں قابض نہ بھی ہوتی تو بھی یہ تبدیلیاں یہاں آکر رہتیں۔ اس کی

بہترین مثال جاپان ہے جہاں ۱۹۴۴ء تک مغربی سامراجیوں کے قدم نہ جمے تھے مگر صنعت اور ٹیکنالوجی میں جاپانی قوم کی ترقی حیران کن رہی۔ فراقؔ کے ترقی پسندانہ فکر و فلسفہ کی تحسین کرتے ہوئے ریاض صدیقی لکھتے ہیں:

''شاعری اور ادب میں سماجی و نظریاتی شعور کے اظہار کا جو موقف ۱۹۳۶ء میں ترقی پسندوں نے وضع کیا تھا وہ (فراقؔ) تادم آخر اس سے وابستہ رہے۔ ان کا شمار مارکس وادیوں میں کیا جانا چاہیے۔''(۱۹۳)

جس طرح حسرتؔ کے ہاں فکر و عمل کا محوری نقطہ آزادی و حریت ہے، اسی طرح فراقؔ کے ہاں انقلاب کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں حرکت و عمل، تغیر و تبدل اور مسلسل ارتقا پذیری کا فلسفہ بڑی فنی پختگی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان کی شاعری میں انقلابی فکر و نظر کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ زندگی کے ہر انقلاب و انقباض کو غزل کے قالب میں ڈھال دینے کی قدرت رکھتے تھے۔''(۱۹۴)

فیض احمد فیض بھی اسی تحریک کا ایک اہم حوالہ ہیں۔ اگرچہ تقسیم ہند سے قبل ان کا صرف ایک مجموعہ ''نقشِ فریادی'' ہی منظر عام پر آسکا تھا تاہم ان کی آئندہ عظمت کے تمام آثار اس میں موجود تھے۔ فیضؔ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی کے تمام تر احساسات تغزل سے پوری طرح ہم آہنگ کر لیے ہیں۔ ان کے اشعار پڑھتے ہوئے قاری کو ایک رومان آمیز سیاسی شعور میسر آتا ہے جو ہمارے کلاسیکل متغزلین کی ایک دیرینہ روایت رہی ہے۔ ترقی پسندوں کا بنیادی جھگڑا مذہب کے بہ جائے تعصبات اور توہمات کے خلاف تھا۔ مذاہب عالم کو افیون بھی اسی تناظر میں کہا گیا تھا مگر ہوا یہ کہ تحریک کے بعض پیروکاروں نے اس نکتے کی آڑ میں مذہبی قدریں ہی پامال کرنا شروع کر دیں اور یہی رویّہ اس تحریک کے خاتمے کی بنیادی وجہ بنا۔

فیضؔ کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کٹر ترقی پسندانہ خیالات ایسی فنی مہارت سے برتے ہیں کہ اسے ایک متدین قاری بھی بہ خوبی قبول کر لیتا ہے۔ ان کا اشتراکی فلسفہ اسلام کی دینی و تمدنی میراث سے مستنیر ہے۔ اس حوالے سے ترقی پسندوں میں کوئی اور نام اگر ہے تو وہ احمد

ندیم قاسمی کا ہے۔ آج بھی پاکستان جیسے اسلامی ممالک میں فیض کی بڑھتی ہوئی شہرت ان کے اعتدال پسندانہ خیالات کے مرہونِ منت ہے۔ اپنی زمانی حدود میں رہتے ہوئے ہم فیض کے ابتدائی مجموعے ''نقشِ فریادی'' سے کچھ مثالیں دیکھتے ہیں:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے (۱۹۵)

نصیب آزمانے کے دن آرہے ہیں
قریب ان کے آنے کے دن آرہے ہیں (۱۹۶)

سرِ خسرو سے تاج کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی (۱۹۷)

فیض کی تمام شاعری میں فکری نزاکت اور کوملتا کا احساس ملتا ہے۔ اگرچہ آئندہ زندگی میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑی مگر ان کے شعروں میں کھوکھلی جذباتیت یا درشتگی نہیں آئی۔ ان کی غزلوں کا علامتی نظام، واعظ، محتسب، لوح و قلم، تیرگی شب، اجالا، مے کدہ، کوے جنوں، قفس، چمن، بہار، صیّاد، صید اور دار و رسن جیسے الفاظ سے تیار کیا گیا ہے۔ انھوں نے غزل کے دم توڑتے استعاراتی نظام کو ایک نئی آب و تاب کے ساتھ زندہ کیا ہے۔ فیض نے سیاسی مناقشات اور اقتصادی بکھیڑوں کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے کہ ان کی فکر اشتراکیت کا وقتی پروپیگنڈا بننے کے بہ جاے اعلا ادب کی دائمی خاصیت پیدا کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تلخیِ ایام بڑھنے کے ساتھ ساتھ فیض کی ضرورت و اہمیت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ بلا شبہ ان کا کلام ترقی پسندانہ فلسفے کا بہترین تخلیقی اظہاریہ ہے۔

اس تحریک کے دیگر اہم شعرا میں مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، مجاز لکھنوی، صوفی تبسم، عبدالحمید عدم، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، اختر الایمان اور کیفی اعظمی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام شعرا قیام پاکستان سے قبل اپنا تخلیقی سفر شروع کر چکے تھے تاہم اس دور میں ان کی تخلیقی فکر اپنی

تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ ان میں سے مخدوم محی الدین جیسے چند لوگ غزل کے تخلیقی معیار تک کو کماحقہٗ شاید نہ پہنچ پائے تاہم بہ حیثیت مجموعی اس تحریک کے شعرا صنفِ غزل کی نشو و ارتقا میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ڈالتے رہے۔

ترقی پسند تحریک پر عموماً تحریک پاکستان کی نظریاتی اساس کی مخالفت کا الزام لگایا جاتا ہے۔(۱۹۸) ایک عرصے سے اس تحریک کے خاتمے کا اعلان بھی کیا جاتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی جو بہترین ادبی شاہ پارے تخلیق ہوئے ہیں وہ تمام بالعموم ترقی پسند سوچ ہی کے عکاس ہیں۔ کسی تنظیم کے کمزور پڑنے یا ختم ہونے سے اس کا نظریاتی سرمایہ زائل نہیں ہوتا بل کہ یہ کسی نہ کسی نئی صورت میں اپنی نشو و نما جاری رکھتا ہے۔ دل چسپ بات تو یہ ہے کہ آج یہ تحریک پاک و ہند کے ادبی ایوانوں میں پھر سے پوری طرح فعال ہو چکی ہے۔

یورپین شعرا کی اردو غزل

ہندوستان میں یورپی تاجروں کا عمل دخل ہمارے لیے بہت سے تہذیبی مسائل کا باعث بنا، تاہم اس مداخلت میں کئی ایک خوش آئند پہلو بھی موجود تھے۔ مغربی اقوام کی آمد سے یہاں کے قدیم جاگیرداری نظام، صنعت و حرفت کے عدم فروغ اور تہذیبی جمود جیسے منفی عوامل میں تغیر و تبدل اور مثبت پیش رفت کا آغاز ہوا۔ مشرق اور مغرب کے اس ملاپ کا سب سے اہم پہلو علم و ادب کی ترقی ہے۔ بہت سے مستشرقین ہندوستان کے مقامی علوم و فنون کے احیا اور ترویج و ترقی میں گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دل چسپی کے محرکات کی نوعیت نوآبادیاتی نظام کے استحکام سے عبارت تھی۔ زبان و ادب کے حوالے سے بات کریں تو جوشوا کیٹلر، بنجمن شلزے اور ہیڈلے وغیرہ لسانی قواعد و ضوابط؛ ڈنکن فوربس، جان پلیٹس اور ڈاکٹر فیلن لغت نگاری؛ جان بیمز لسانی تاریخ؛ گل کرسٹ، گارسین دتاسی اور سر ولیم جونز جیسے زعما اُردو ادب کی تفہیم اور ترویج و اشاعت میں بہت فعال کردار ادا کرتے رہے۔ عہد حاضر میں یہ سلسلہ این مری شمل، ڈیوڈ میتھیوز اور کرسٹوفر شیکل جیسے نکتہ رس مستشرقین تک پہنچتا ہے۔ نو وارد اقوام کے بعض پورے پورے خاندان ایسی ادب دوست سرگرمیوں میں شریک رہے ہیں۔☆ یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ کو بھی ''اردو کا شوق چرایا'' تو انھوں نے ایک ہندوستانی استاد سے اردو سیکھی اور اپنا روزنامچہ اردو زبان میں لکھا کرتیں۔ [۱۹۹]

مستشرقین کی ہندوستانی علم و ادب میں دل چسپی کے بنیادی محرک سے قطع نظر، یہ امر لائق ستایش ہے کہ اس سے نقد و نظر کے نئے منطقے سامنے آئے۔ نو وارد اقوام نے ہندوستان کی سیاسی بساط پر اپنی جگہ بنتے دیکھی تو شرق شناسی کی روایت مربوط مطالعاتی نظام کی صورت اختیار کر گئی۔ اس سلسلے میں ایشیاٹک سوسائٹی آف کلکتہ، اورینٹل سیمی نری، بنارس کالج، دلی کالج اور اورینٹل کالج جیسے ادارے قائم کر کے مقامی علم و ادب کی بھرپور سرپرستی کی گئی۔ اس نوع کی ایک

اہم مثال فورٹ ولیم کالج ہے جہاں ہندوستانی عتیقیات کے احیا، مقامی زبانوں کی ترویج و ترقی، لسانی قواعد اور لغت نگاری وغیرہ جیسیا مور پر بالخصوص توجہ دی گئی۔ اس علمی مرکز کی ادبی خدمات کا بنیادی حوالہ ترجمہ نگاری ہے اور شاید اسی تناظر میں مستشرقین کو بھی عموماً قواعد ساز، لغت نگار اور مترجم وغیرہ کی حیثیت میں جانا گیا جب کہ پوری حقیقت یہ ہے کہ ان مستشرقین نے نثر ہو کہ نظم ہر دو کی تخلیق میں بھی اپنی اہمیت و اہلیت ثابت کی ہے، تاہم ایسی کاوشوں سے ہمارے ناقدین نے کم ہی اعتنا برتا جس کی وجہ سے آج ہمارے عام قارئین یورپین ادبا کی ادبی خدمات سے نابلد ہیں۔ سہیل احمد صدیقی اس عدم واقفیت کو ''عجیب صورت حال''(۲۰۰) قرار دیتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ صورت حال اب اتنی عجیب ہرگز نہیں رہی۔ اس ضمن میں کئی ایک جامع مطالعات ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد کا مقالہ ''اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''(۲۰۱) اور ڈاکٹر عطش درانی کا ''اردو زبان اور یورپی اہل قلم''(۲۰۲) اس سلسلے کی اہم کاوشیں ہیں۔ اس طرح رام بابو سکسینہ اور عبدالماجد دریابادی نے بھی اس ضمن میں کافی قابل قدر کام کیا ہے۔

یوں تو یورپی ادبا نے تحقیق، تدوین اور تنقید و تراجم جیسی متنوع خدمات سرانجام دیں مگر ان کی تخلیقی سرگرمیاں بھی بہ جا طور پر قابل اعتنا ہیں۔ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے اردو شعر و شاعری میں دل چسپی دکھائی اور اس کی مختلف ہیئتوں کو قریب قریب سبھی مقبول اسلوبیاتی پیرایوں میں استعمال کیا۔ ان شعرا کے احوال و آثار قدیم تذکروں میں جا بہ جا مذکور ہیں۔☆ اس وقت کی مقبول عام صنف شعر چوں کہ غزل تھی اس لیے مستشرقین نے اسی میں اپنی شعری تخلیقات پیش کی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ادبی سرگرمیاں ایک لحاظ سے یورپی کار پردازوں کے لیے معاشی تحفظ کا ضامن بھی قرار پائی تھیں۔ وہ ان کے بہ موجب سماجی تعلقات کو زیادہ سازگار بنا کر اپنے فرائض منصبی بہتر انداز میں سرانجام دے سکتے تھے۔ آج کے قاری کے لیے مستشرقین کی غزل کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اس سوال کا جواب دل چسپ بھی ہے اور پہلو دار بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل کسی معاشرے کی تہذیب و ثقافت کا بہترین اظہاریہ ہوتی ہے۔ لہٰذا بدیہی امر ہے کہ مستشرقین کی غزل کا مطالعہ

کرتے ہوئے ہم عموماً مغربی لینڈ سکیپ، ثقافتی رویے اور اہل یورپ کے مخصوص فکر ونظر جیسے امور سے واقفیت کی توقع رکھتے ہیں۔ اس صنف کا عمومی پیرایہ اظہار عشقیہ ہونے کی بنا پر ہماری توقعات اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ یہاں عشق سے مراد اگر محض افلاطونی تصورات نہیں تو اہل مغرب کی نظر میں عشق بازی کی نوع بہ نوع قسمیں موجود ہیں جو غزل کی روایتی معاملہ بندی کو اجنبیانے میں بہت معاون ثابت ہو سکتی ہیں نیز حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں مغرب سے مستعار جن اصولوں پر زور دیا تھا اس نوع کی سادہ اور اصلیت پر مبنی نیچرل شاعری کی توقع بھی انھیں شعرا سے بہ درجہ اولا رکھی جا سکتی تھی۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ یورپی متغزلین مقتدر کلامیے کے براہِ راست ترجمان ہونے کی بنا پر بھی لائق اعتنا ہیں تاکہ نوآبادیاتی صورتِ حالات کا متوازن تجزیہ پیش کیا جا سکے۔ اس بات کا ایک ضمنی پہلو یہ بھی ہے کہ ان ادبی آثار سے ہمیں فرنگی حاکموں کا اپنی رعایا سے طرز عمل جاننے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ مثلاً مسلم دور حکمرانی میں ہندو رعایا سے متعلق کہے گئے اس نوع کے اشعار یقیناً اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتے ہیں:

کسی ہندو بچے کی یاد میں آنکھوں سے اے انشاء
نکلتا ہے پڑا جوالا مکھی کے لاٹ کا جوڑا (۲۰۳)

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا (۲۰۴)

امیر خسرو کے ہندوی کلام میں ''زنِ ہندوئے'' اور ''ہندو بچہ'' کی تراکیب استعمال ہوئی ہیں نیز ہندو لڑکوں اور عورتوں سے متعلق طرح طرح کے مضامین بھی باندھے گئے ہیں۔ کیا بعید تھا کہ یورپین شعرا بھی کسی ''مسلم بچے'' کی یاد میں آنسو بہاتے یا تسبیح مصلّے کا اہتمام کر کے کسی مسجد میں جابراجمان ہوتے؟

مذکورہ بالا تمام تر تحفظات و توقعات کے پیش نظر ایک مشرقی قاری مستشرقین کی غزل کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہ تو مغربی کلامیے کا کچھ زیادہ سراغ ملتا ہے اور نہ ہی کسی ممکنہ ہند یورپی معاشقے کی روداد بیان ہوئی ہے۔ ایسے شعرا کی غزل ملاحظہ کرنے سے پہلے یہ بات

بھی قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ مغرب کا شعر و شاعری کی طرف ثقافتی رویہ ہماری نسبت بہت مختلف ہے۔ ان کے ہاں شاعری عموماً طبقہ اشرافیہ کی ترجمان خیال کی جاتی ہے۔ [۲۰۵] سنجیدہ فکر و فلسفہ کی ترویج و اشاعت کے لیے زیادہ تر نثری پیرایۂ اظہار استعمال میں لایا جاتا ہے۔

اُردو غزل کے یورپین شعرا میں سب سے نمایاں نام سر جارج پیش شور ☆ کا ہے۔ ان کے کلام میں معاصر حالات کا شعور نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک مقالے [۲۰۶] کے حاشیے میں شوؔر کے دیوان دوم سے ایک غزل نقل کی ہے جس میں فرنگی دور حکومت میں پیدا شدہ قحط سالی کا تذکرہ کر کے صاحبانِ اقتدار پر شدید تنقید کی گئی ہے۔ تذکروں میں مذکور ان کے کچھ اشعار دیکھیے:

حاضر تھا اپنی جان سے ایسا تیرا مریض
دیکھے سے جس کے حالت عیسیٰ تباہ تھی [۲۰۷]

غیر کے ساتھ عیادت کو وہ دلبر آیا
لو مسیحا ملک الموت کو لے کر آیا [۲۰۸]

شرم و حجاب ہی میں شبِ وصل کٹ گئی
ان کی زباں پہ تا سحر انکار ہی رہا [۲۰۹]

ان اشعار کی داغؔ کے عمومی رنگِ سخن سے مماثلت بالکل واضح ہے۔ موصوف کا ایک دیوان ''ستارۂ شور'' تو بالخصوص داغ کے دواوین ''آفتابِ داغ'' اور ''گلزارِ داغ'' کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

مستشرق شاعروں میں ایک اہم نام الیگزینڈر ہیڈرلی آزاؔد کا ہے جو زین العابدین عارفؔ سے بہ راہِ راست اور غالبؔ سے بالواسطہ اصلاحِ کلام لیتے رہے۔ آزاؔد کی والدہ مسلمان تھی اس لیے ان کی تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی۔ معرکۂ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انھوں نے اسلام بھی قبول کر لیا اور اپنا اسلامی نام جان محمد رکھا۔ [۲۱۰] ان کی غزل کے چند اشعار دیکھیے:

آتا ہے نظر خانۂ صیاد گلستاں
جانے کا کہاں قصد کریں ہو کے رہا ہم (۲۱۱)

آج دشمن اگر خراب نہیں
کیا زمانہ میں انقلاب نہیں (۲۱۲)

ڈوب جانے میں کیا رہا باقی
آپ سے جب کہ آشنائی کی (۲۱۳)

تمام عمر رہا میں سبھوں سے بے گانہ
رہا میں اس پہ بھی غربت میں گو وطن میں رہا (۲۱۴)

آخری شعر میں آزاد کی ذونسبی حیثیت سے پیدا ہونے والے المیے کی ترجمانی بھی صاف جھلکتی ہے۔ اسی طرح ڈانیال گارڈنر شکر (م: ۱۹۰۷ء) کا کلام بھی اپنی سلاستِ بیان اور خیال افروزی کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ ان کی قدرت کلام کا ایک اہم سبب موصوف کے لکھنوی استاد مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی ہیں۔ شکر کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تڑپتے تڑپتے شبِ غم کٹی
ہوئی ہے خوشی کی سحر رفتہ رفتہ (۲۱۵)

کیا اعتبار زندگیٔ مستعار کا
ہو کیا قرار ہستی ناپائیدار کا (۲۱۶)

پہلے شعر کے وزن سے صرف نظر کریں تو شکر کا مذکورہ صدر شعر پڑھتے ہی اقبال کا یہ معروف مطلع یاد آجاتا ہے:

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا (۲۱۷)

اسی سلسلۂ متغزلین میں ایک اہم شاعر کوئیس کوٹینس فراسو بھی ہیں جو صاحبِ دیوان

ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی تصانیف کے بھی حامل تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

غنچوں کو اے ستم گر تیرے دہن کے آگے
ہنسنا تو یک طرف ہے دشوار مسکرانا(۲۱۸)

مجھ کو کہتے ہیں بڑا ڈھب ہے تجھے یاری کا
سوچنا طور ذرا آپ کی عیاری کا(۲۱۹)

آباد ایک روز نہ دیکھا کبھو اسے
کیا لے کے میں کروں دلِ خانہ خراب کو(۲۲۰)

مستشرق شاعروں کے ضمن میں کچھ شاعرات کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں ایک خاتون متخلص بہ خفی خاصی معروف ہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے ذاتی کوائف سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ بعض نے ان کی ولدیت بلیک صاحب بہادر بتانے پر اکتفا کیا ہے۔ ☆نمونہ کلام کے طور پر دو شعر دیکھیے:

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ تیرے ایک بھی دانہ کے نہ تھے ہم(۲۲۱)

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں
ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں(۲۲۲)

یورپی شعرا کے اس سلسلے میں بعض اور اہم نام بھی ہیں جن میں ڈاکس سوئبر، پیٹرک گارڈنر شوق، ڈی کاسٹا، اسفان، اسمتھ، ایرن، ایلن کرچیانہ، اسبق، صاحب، طوماس اور ولیم وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا کا کلام روایتی نوعیت کا ہے اور بنا بر ایں اس مضمون کی ابتدا میں بیان کی گئی توقعات کو پورا نہیں کرتا۔ دراصل ان میں اکثر شاعر ایسے ہیں جو محض حادثاتی طور پر یورپی تھے، اب ان کا تمام تر مستقبل ہندوستانی معاشرے سے وابستہ تھا؛ لہٰذا ان کے ہاں اگر خیال کی کوئی معاصر سماجی جہت نکلتی بھی ہے تو وہ مقامی شعرا سے کچھ زیادہ مختلف

نہیں۔ ان شعرا کو مشرقی شعریات سے آگہی کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف صنعتوں کا بھی پورا ادراک تھا اور انھوں نے بڑی مہارت سے اس زبان کی مختلف صنائع شعری کو استعمال میں لا کر اپنے کلام کو فنی پختگی عطا کی ہے۔ ان شعرا کے کلام سے یہ امر بھی متبادر ہوتا ہے کہ غزل میں داد سخن دیتے ہوئے وہ مشرقی شعریات پوری طرح خود پر طاری کر لیتے ہیں جس کی بنا پر ان کے اسلوب پر مغربی طرز فکر کی پرچھائیاں نظر نہیں آتیں۔

یہاں آخر میں ایک سوال کی پھر سے گنجایش نکلتی ہے کہ وہ یورپین شعرا جو بہ ہر طور مغربی دنیا کا حصہ تھے اور ہندوستان میں ان کی حیثیت محض ایک نوآبادکار کی رہی، ان کی غزل میں اپنے مقتدر کلامیے کی جھلک کیوں موجود نہیں؟ اس کی ایک ممکنہ وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان لوگوں کا ادبی ذوق مغربی شعریات کا پروردہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی شعری روایات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں تھا۔ مشرقی شعریات کے نکتہ رس مبصر علامہ اقبال نے اہلِ عجم کا فلسفہ شعروادب بیان کرتے ہوئے اس کی ایک اساسی خصوصیت مبالغہ آرائی قرار دی ہے:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے

بڑھا دیا ہے فقط طولِ داستاں کے لیے (۲۲۳)

جب کہ اہل یورپ عربی شعریات کی مثل اختصار پسندی کے قائل ہیں۔ اس ضمن میں میرین مالٹینو کا یہ جملہ قابلِ حوالہ ہے:

''انگریزی بولنے والے اس ادبی روایت کے عادی ہیں جس میں مبالغہ کی بجائے کم بیانی (understatement) سے کام لیا جاتا ہے۔''(۲۲۴)

مذکورہ بالا دونوں آرا کے باہم الطباق سے یہ حقیقت مترشح ہے کہ ہندوستان میں نو وارد یورپی اہل کار اپنے ذہن کی ادبی ساخت پرداخت کے بہ سبب اردو غزل میں کوئی حقیقی خیال آفرینی کرنے کے کچھ زیادہ قابل نہیں تھے۔ تاہم ان تمام فروعی مباحث سے یورپین شعرا کی ادبی اہمیت زائل نہیں ہوتی۔ ان کا کلام اردو شاعری کا بہ ہر حال ایک تاریخی حوالہ ہے جو نہ صرف مشرقی تہذیب سے ان کی دل چسپی کا غماز ہے بل کہ اس سے اردو زبان کی ثقافتی کشش کا بھی ایک مقرون ثبوت ہاتھ لگتا ہے۔

برطانوی راج کا اصلاحاتی دور اور اردو غزل۔۔۔ایک اجمالی جائزہ

اس دور کے غزل گو شعرا کی ادبی دنیا میں شناخت جذبے کی شدت اور انقلابی اسلوب کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ زیرِ نظر عہد کی غزل کا سب سے بڑا وصف ہیجان اور انقلاب کی فضا ہے۔ اس دور کی سیاسی ہلچل کے محرکات کو سمجھنے کے لیے پی سی گپتا کا یہ جملہ بہت معاون ثابت ہوتا ہے کہ ''۵۷ء کی تحریک کی ناکامی سے جو صورت حال پیدا ہوئی وہ ذمہ دار ہے ۴۷ء کی کامیابی کی۔''(۲۲۵)

بیسویں صدی کے شروع سے ہی دنیا بھر کی نوآبادیوں میں حریت و آزادی کی پر جوش تحاریک چل نکلیں۔ مغرب کی استعماری اقوام اپنے بین الاقوامی منافشات کی بنا پر ان تحریکوں کا صحیح توڑ پیدا کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ ایسے میں جوش و جذبہ، حرکت و عمل، غلامی سے نفرت، آزادی کی تڑپ، حب الوطنی کے نغمے اور استعماری قوتوں سے معرکہ آرائی کے آثار کا شاعری میں در آنا لازمی امر تھا۔ اس عہد کے دہلوی شعرا میں بے خود دہلوی، سائل دہلوی اور نوح ناروی جب کہ دوسری طرف لکھنوی شاعروں میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی آرزو لکھنوی اور یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ بڑی پر مغز غزلیں تخلیق کر رہے تھے۔

دہلی اور لکھنؤ سے باہر کی ادبی محفلوں میں حسرت موہانی، علامہ محمد اقبال، چکبست، جگر مرادآبادی، سیماب اکبر آبادی اور فانی بدایونی وغیرہ نے اردو غزل کے مختلف اسالیب کو اس نئی سیاسی صورت حال سے ہم آہنگ کیا۔ ان تمام شعرا کے ہاں کسی نہ کسی رنگ اور معیار کا نوآبادیاتی صورت حال سے متعلق مزاحمتی یا مفاہمتی رویّہ موجود ہے۔ ان میں حسرتؔ اور اقبالؔ دو ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اس عہد کی پر جوش اور انقلابی ''روح عصر'' کو اپنی تخلیقات کا بالخصوص حصہ بنایا ہے۔ اقبالؔ کی غزل اس صنفِ سخن کی تاریخ میں وہ اچھوتی مثال ہے جس کا خواب مولانا حالی نے دیکھا تھا۔ اس دور کی غزل کا مجموعی اسلوب تحریک آزادی کی متنوع سرگرمیوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اگرچہ ان متغزلین نے روایتی سرمایۂ لفظی سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تاہم

ان لفظیات کی جدید معنویت اور بے شمار نئے الفاظ وتراکیب کے استعمال سے غزل کا ایک نیا اسلوب بھی تیار کیا۔ فتح محمد ملک کی یہ رائے بالکل بجا ہے کہ:

''اس عہد کی غزل میں حسن وعشق کے روایتی معاملات اور غزل کے رسمی سامان مفقود ہیں۔''(۲۳۶)

اس رائے میں مستثنیات کی گنجائش اگر چہ موجود ہے لیکن اس زمانے کی غزل کا مجموعی تاثر بہ ہر طور عشقیہ یا رومان پرور احساسات پر غالب رہا ہے۔ اس دور کے آخری عشرے میں ترقی پسند شعرا کی ایک پر جوش کھیپ بھی سامنے آئی تاہم یہ لوگ اپنے سیاسی منشور سے نظم کو زیادہ ہم آہنگ سمجھتے تھے لہٰذا انھوں نے غزل سے کم التفاتی برتتے ہوئے دیگر اصناف ادب پر اپنا جوشِ تخیل صرف کیا۔ اس تحریک نے چوں کہ صنفِ غزل سے مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کیا تھا اس لیے بہت سے ترقی پسند شعرا مثلاً فراقؔ، مخدومؔ، مجازؔ، عدمؔ اور فیضؔ وغیرہ نے اردو غزل میں اچھے اضافے کیے اور اپنے ترقی پسندانہ خیالات سے جو اس عہد کی عمومی سیاست سے بھی ہم آہنگ تھے، صنفِ غزل کو مزید نشو ونما دی۔

اردو غزل کے مغربی شعرا کا کلام یقیناً ایک مشرقی قاری کے لیے بہت دل چسپی کا حامل ہوسکتا ہے مگر مذکورہ شعرا کے نمونہ کلام سے واضح ہے کہ یورپی شعرا نے زیادہ تر روایتی مضامین سے سروکار رکھا۔ ان میں سے بعض شعرا کے ہاں مشرقی صنائع وبدائع کا فن کارانہ استعمال البتہ ضرور قابلِ تعریف ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ صدیق جاوید، ڈاکٹر: بال جبریل کا تنقیدی جائزہ، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۱

۲۔ صدیق جاوید، ڈاکٹر: بال جبریل کا تنقیدی جائزہ، ص ۹۱۔۱۰۱

۳۔ صدیق جاوید، ڈاکٹر: بال جبریل کا تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۳

۴۔ عابد، عابد علی: شعر اقبال، طبع: دوم، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۷۷ء، ص ۳۹

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اقبال اور ہمارے فکری رویّے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: س۔ن۔ ص ۹۷

۶۔ محمد اکرام، شیخ: موج کوثر طبع: دوم، لاہور: فیروز سنز: ص ۳۳۰

۷۔ آزاد، جگن ناتھ، پروفیسر: اقبال پر داغ کے اثرات، مشمولہ: اقبال ۸۶ء، مرتبہ: ڈاکٹر وحید عشرت، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۹

۸)۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اقبال اور ہمارے فکری رویّے، ص ۶۷

☆ علامہ اقبال نے یہ مضمون ۸، اگست ۱۹۱۷ء کو اخبار ''ستارہ صبح'' (کرم آباد) میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں عرب کے دو شاعروں امراؤ القیس اور عنترہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ نفسِ مضمون کے پیش نظر حضورؐ نے اوّل الذکر کی مذمت اور موٴالذکر کی بے حد تعریف فرمائی تھی۔
(بہ حوالہ، عبدالمجید سالک: ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، س۔ن، ص ۸۷۔۹۸)

۹۔ عبدالمغنی، پروفیسر: موازنہ اقبال و غالب، مشمولہ احوال ونقد غالب، ص ۱۶۳

۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اقبال اور ہمارے فکری رویّے، ص ۶۰

۱۱۔ کلیات اقبال (اردو)؛ طبع: دوم، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۴ء ص ۳۷۲

۱۲۔ ایضاً ص ۳۸۲

۱۳۔ ایضاً ص ۳۱۱

۱۴۔ ایضاً ص ۳۶۳

۱۵۔ ایضاً ص ۳۶۴

۱۶۔ ایضاً ص ۳۴۵

۱۷۔ ایضاً ص ۳۶۱

☆ قیام یورپ کے دوران میں فرنگی معاشرت کا تلخ تجربہ اقبال کی ایک فارسی رباعی میں بڑی فنی مہارت

سے بیان ہوا ہے:

مے از میخانۂ مغرب چشیدم
بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی
ازاں بے سود تر روزے ندیدم

(کلیاتِ اقبال (فارسی)، لاہور: اقبال اکادمی، طبع: دوم، ۱۹۹۴ء، ص ۵۵۲)

۱۸۔ کلیاتِ اقبال، ص ۳۸۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۶۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۰۰

۲۱ ایضاً، ص ۳۸۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۷۵

۲۳۔ عبدالحکیم، خلیفہ: فکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۶

۲۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص ۲۴

۲۵۔ یوسف حسین، ڈاکٹر: روحِ اقبال، طبع چہارم، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۵۷ء، ص ۲۵

26. Muhammad Iqbal: The reconstruction of Religious Thought in Islam, P-7

۲۷۔ کلیاتِ اقبال، ص ۳۶

مغرب کی تفہیم و تحسین کے حوالے سے اپنی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں اقبال لکھتے ہیں:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب!
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست!
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است!
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است!

(محمد اقبال، علامہ: جاوید نامہ، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۹)

۲۸۔ کلیاتِ اقبال، ص۴۰۲

۲۹۔ ایضاً، ص۳۶۲

۳۰۔ ایضاً، ص۳۶۶

۳۱۔ ایضاً، ص۳۶۰

۳۲۔ ایضاً، ص۳۶۴

۳۳۔ ایضاً، ص۱۶۷

۳۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص۳۳

۳۵۔ کلیاتِ اقبال، ص۳۹۵

۳۶۔ ایضاً، ص۳۹۲

۳۷۔ ایضاً، ص۳۹۰

۳۸۔ ایضاً، ص۳۶۱

۳۹۔ ایضاً، ص۳۷۱

40. Muhammad Iqbal: Reconstruction of Religious Thought in Islam, P-7

۴۱۔ کلیات اقبال، ص۴۷۵

۴۲۔ کلیاتِ اقبال، ص۳۹۶

۴۳۔ ایضاً، ص۳۷۳

۴۴۔ ایضاً، ص۳۷۲

۴۵۔ ایضاً، ص۳۴۵

۴۶۔ بہ حوالہ، سید عبداللہ: اقبال کے غیر مسلم مداح اور نقاد، مشمولہ: اقبال ممدوح عالم، مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر،
لاہور: بزم اقبال، ۱۹۷۸، ص۷، ۱۱

۴۷۔ ہربرٹ ریڈ: عظمتِ اقبال، مترجم: ڈاکٹر سلیم اختر، مشمولہ: اقبال ممدوحِ عالم، ص۱۱۶۔۱۷

۴۸۔ کلیاتِ اقبال، ص۳۶۳

۴۹۔ ایضاً، ص۳۶۰

۵۰۔ ایضاً، ص۳۵۵

۵۱۔ ایضاً، ص۳۷۰

۵۲۔ ایضاً، ص۳۸۴

۵۳۔ ایضاً،ص۳۸۵

۵۴۔ ایضاً،ص۳۷۴

۵۵۔ ایضاً،ص۴۰۱

۵۶۔ ایضاً،ص۳۵۳

۵۷۔ ایضاً،ص۱۲۶

۵۸۔ ایضاً،ص۱۶۷

۵۹۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: اقبال فراموشی،ص۱۳۲

۶۰۔ کلیاتِ اقبال،ص۳۹۲

۶۱۔ سالک،عبدالمجید: فکرِ اقبال،ص۱۷۹

۶۲۔ کلیاتِ اقبال،ص۳۸۳

۶۳۔ ایضاً،ص۳۸۲

۶۴۔ ایضاً،ص۳۹۶

۶۵۔ خورشید،عبدالسلام، ڈاکٹر؛ روشن آرا راؤ (مرتبین): تاریخ تحریک پاکستان (حصہ اول)،طبع دوم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۲ء،ص۲۱۵

۶۶۔ کلیاتِ اقبال،ص۴۰۵

۶۷۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: اندازِ نظر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء،ص۵۴

۶۸۔ کلیاتِ اقبال،ص۳۵۴

۶۹۔ ایضاً،ص۳۸۰

۷۰۔ ایضاً،ص۳۱۱

۷۱۔ ایضاً،ص۳۹۸

۷۲۔ ایضاً،ص۴۰۰

۷۳۔ ایضاً،ص۳۷۳

۷۴۔ خورشید،عبدالسلام، ڈاکٹر (مرتب): تاریخ تحریک پاکستان،ص۲۱۴

۷۵۔ ایضاً،ص۲۱۵

۷۶۔ ایضاً،ص۳۸۵

۷۷۔ عابد،عابد علی: انتقادِ ادبیات،ص۲۷۸

۷۸۔ کلیاتِ اقبال،ص۳۷۸

۷۹۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر: ظفر علی خان ادیب و شاعر، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۶۷ء، ص ۲۴۲
۸۰۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: اقبال فراموشی، ص ۱۵۰
۸۱۔ کلیاتِ اقبال، ص ۳۹۵
۸۲۔ سلیمان ندوی، سید: حسرت کی سیاسی زندگی، مشمولہ: قیدِ فرنگ، از: حسرت موہانی، فیصل آباد، طارق اکیڈمی، ۱۹۷۸، ص ۱۲
۸۳۔ اقبال فیروز، دیباچہ: قیدِ فرنگ، ص ۸
۸۴۔ ایضاً، ص ۷۔۸
۸۵۔ حسرت موہانی: کلیاتِ حسرت، مرتبہ: بیگم حسرت موہانی، لاہور: علی ہجویری پبلشرز، س۔ن۔ ص ۱۹۹
۸۶۔ نفیس احمد صدیقی، ڈاکٹر: حسرت موہانی اور انقلابِ آزادی، پٹنہ (انڈیا): خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۸ء، ص ۶۹
۸۷۔ علی احمد فاطمی، پروفیسر: حسرت موہانی: رومانی ذہن کی سیاسی شخصیت، مشمولہ: جہاتِ حسرت، مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد، کراچی: حسرت موہانی میموریل ٹرسٹ، ۲۰۰۸ء، ص ۳۸
۸۸۔ شریف المجاہد: مولانا حسرت موہانی: سخت کوشی اور المناک تجربوں کی ایک داستان، مشمولہ: جہاتِ حسرت، ص ۱۳
۸۹۔ ایضاً
۹۰۔ احمد لاری، ڈاکٹر: حسرت موہانی، جہات اور کارنامے، لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۸۔۲۳۰
۹۱۔ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر: اردو غزل، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۱
۹۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: مولانا حسرت موہانی کی عاشقانہ شاعری، مشمولہ: جہاتِ حسرت، ص ۷۸
۹۳۔ نفیس احمد صدیقی، ڈاکٹر: حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، ص ۸۶
۹۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: مولانا حسرت موہانی کی عاشقانہ شاعری، مشمولہ: جہاتِ حسرت، ص ۷۷۔۹۱
۹۵۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر: مولانا حسرت موہانی، اپنی مثال آپ، مشمولہ: جہاتِ حسرت، ص ۱۱۱
۹۶۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: جنگ آزادی اور اردو شعرا، ص ۱۹۱
۹۷۔ کلیاتِ حسرت، ص ۳۱۷
۹۸۔ ایضاً، ص ۲۴۱
۹۹۔ ایضاً، ص ۲۰۸
۱۰۰۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۰۱۔ ایضاً،ص۳۲۲

۱۰۲۔ ایضاً،ص۸۸

۱۰۳۔ ایضاً،ص۲۹۶

۱۰۴۔ تمکین کاظمی،تعارف: آفتابِ داغ،از: داغ دہلوی، لاہور: نیا ادارہ،۱۹۶۱ء،ص۱۳

۱۰۵۔ داغ: آفتابِ داغ،ص۱۲

۱۰۶۔ فخرالحق نوری،ڈاکٹر: آزادی کی گونج،ص۴۸

۱۰۷۔ ضیا،شکیل احمد: مولانا حسرت موہانی کی سیاست،مشمولہ: مولانا حسرت موہانی، ایک ہمہ جہت شخصیت،مرتبہ: سید محمد اصغر کاظمی، کراچی: مولانا حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ، ۲۰۰۴ء،ص۲۱۲۔۲۱۳

۱۰۸۔ سلیم اختر،ڈاکٹر:تخلیق اور لاشعوری محرکات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۳ء،ص۶۲

۱۰۹۔ کلیاتِ حسرت،ص۲۹۴

۱۱۰۔ ایضاً،ص۱۱۴

۱۱۱۔ ایضاً،ص۲۲۸

۱۱۲۔ ایضاً،ص۱۸۸

۱۱۳۔ ابوالکلام قاسمی:تخلیقی تجربہ،علی گڑھ:عبدالقادر مارکیٹ،۱۹۸۶ء،ص۶۲

۱۱۴۔ عابد،عابد علی:انتقادِ ادبیات،ص۳۰۲

۱۱۵۔ کلیاتِ حسرت،ص۱۵۱

۱۱۶۔ ایضاً،ص۱۸۷

۱۱۷۔ ایضاً،ص۳۲۵

۱۱۸۔ ایضاً،ص۱۲۰

۱۱۹۔ ایضاً،ص۲۲۰

۱۲۰۔ ایضاً،ص۱۲۲

۱۲۱۔ ایضاً،ص۱۰۶

۱۲۲۔ ایضاً،ص۱۲۴

۱۲۳۔ سحر انصاری، پروفیسر: حسرت ایک اشتراکی مسلم،مشمولہ: جہاتِ حسرت،ص۲۴

۱۲۴۔ ایضاً،ص۲۵

۱۲۵۔ کلیاتِ حسرت،ص۱۰۰

١٢٦۔ حسرت موہانی: قید فرنگ، فیصل آباد: طارق اکیڈمی، ۱۹۷۸ء
١٢٧۔ نفیس احمد صدیقی، ڈاکٹر: حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، ص ۵۳۷
١٢٨۔ کلیاتِ حسرت، ص ۲۴۱
١٢٩۔ ایضاً، ص ۸۷
١٣٠۔ ایضاً، ص ۱۷۰
١٣١۔ ایضاً، ص ۲۴۲
١٣٢۔ دیوانِ غالب کامل، ص ۲۹۱
١٣٣۔ منقول از، کالی داس گپتا رضا، مقدمہ: کلیاتِ غالب کامل، ص ۱۳
١٣٤۔ شریف المجاہد، پروفیسر، مولانا حسرت موہانی: سخت کوشی اور المناک تجربوں کی ایک داستان، مشمولہ: جہات حسرت، ص ۱۵
١٣٥۔ سلیمان ندوی، سید: واحسرتا، مشمولہ: حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، مرتبہ: ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی، ص ۳۷۲
١٣٦۔ کلیاتِ حسرت، ص ۱۷۷
١٣٧۔ ایضاً، ص ۱۴۴
١٣٨۔ ایضاً، ص ۲۳۵
١٣٩۔ ایضاً، ص ۲۲۰
١٤٠۔ ایضاً، ص ۱۱۴
١٤١۔ احمد لاری، ڈاکٹر: حسرت موہانی، حیات اور کارنامے، ص ۲۳۴
١٤٢۔ نفیس احمد صدیقی، ڈاکٹر: حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، ص ۱۴۰
١٤٣۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر: مولانا حسرت موہانی، اپنی مثال آپ، مشمولہ: جہات حسرت، ص ۱۰۸
١٤٤۔ جعفر احمد، سید، ڈاکٹر: حسرت کا آدرش، مشمولہ: جہات حسرت، ص ۵۸۔۵۹
١٤٥۔ فخر الحق نوری، ڈاکٹر: آزادی کی گونج، ص ۴۵

☆ کان پور کے مچھلی بازار کو کھلا کرنے کے لیے ۱۹۱۳ء میں ایک مسجد کا کچھ حصہ منہدم کر دیا گیا جس کے خلاف مذہبی حلقوں نے شدید احتجاج کیا۔ علاقے کے انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مظاہرین پر گولی چلوا دی جس سے کئی افراد شہید ہو گئے۔
(ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی: حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، ص ۱۴۴۔۱۴۵)

☆ تحریک خلافت ہی کی طرز پر اس تحریک کا منشور بھی ترکی خلافت کو محفوظ بنانا تھا۔ یہ ایک جہادی تنظیم

کے ذریعے برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کا ایک راست اقدام تھا۔ یہ لوگ افغانستان سے فرنگی حکومت پر شب خون مارنا چاہتے تھے۔ ترکی کی اعلا قیادت کی بھی انھیں اشیر باد حاصل تھی۔ تحریک کے اکابرین نے دسمبر ۱۹۱۵ء میں کابل میں انقلابیوں پر مشتمل ''حکومت موقتہ ہند'' (Indian Government in exile) تشکیل دی جس میں مہندر پرتاب سنگھ، صدر؛ برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم اور حسرت موہانی ڈپٹی کمانڈر قرار پائے۔ حسرت اور برکت اللہ بھوپالی باہم گہرے روابط رکھتے تھے۔ مرکزی قیادت نے ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو بغاوت کا پروگرام تشکیل دیا۔ طے یہ پایا کہ افغان حکومت ہندوستان پر حملہ کرے اور مقامی انقلابی قبائل میں بغاوت پھیلا کر انگریزوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ تاہم قبل از وقت اس بغاوت کا راز افشا ہوا اور یوں یہ پالیسی ناکام رہی۔

(ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی: حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، ص ۱۵۰۔۱۵۱)

۱۴۶۔ کلیاتِ حسرت، ص ۳۲۵

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۳۹۹

۱۴۸۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۱۴۹۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۵۰۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۱۵۲۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۱۵۳۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۱۵۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۵۵۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۱۵۶۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۱۵۷۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۱۵۸۔ احمد: کلیم الدین: اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۷ء، ص ۵۱۲

۱۵۹۔ کلیاتِ حسرت، ص ۱۰۰

۱۶۰۔ ایضاً، ص ۲۹۹

۱۶۱۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۱۶۲۔ انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۱ء، ص ۴۶۹

۱۶۳۔ سجاد ظہیر: روشنائی، لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۲
۱۶۴۔ اختر حسین رائے پوری: ادب اور زندگی، مشمولہ: ترقی پسند ادب، مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۹۔۱۶۲
۱۶۵۔ عزیز احمد: ترقی پسند ادب، ملتان: کاروان شعر و ادب، ۱۹۹۳ء، ص ۵۵
۱۶۶۔ خالد علوی، ڈاکٹر: پاکستان میں غزل کے چند اہم رجحانات، مشمولہ: معاصر اردو غزل، مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۴
۱۶۷۔ حفیظ جالندھری: نثرانے، لاہور: مجلس ترقی اردو، ۱۹۷۲ء، ص ۲۵۷
۱۶۸۔ ناسخ، امام بخش: کلیاتِ ناسخ، جلد اوّل، مرتبہ: یونس جاوید، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶
۱۶۹۔ ایضاً ص ۲۴
۱۷۰۔ داغ دہلوی: یادگارِ داغ، ص ۳۲۴
۱۷۱۔ کلیات حسرت، ص ۳۲۵
۱۷۲۔ ایضاً ص ۳۶۵
۱۷۳۔ ایضاً ص ۲۹۱
۱۷۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اندازِ نظر، ص ا
۱۷۵۔ عابد، عابد علی، پیش لفظ: آتش کدہ، از: ایم۔ ڈی۔ تاثیر، ناشر: سی۔ بلقیس تاثیر، س۔ ن، ص ح
۱۷۶۔ تاثیر، محمد دین: آتش کدہ، ص ۱۲۹
۱۷۷۔ ایضاً ص ۱۳۹
۱۷۸۔ ایضاً ص ۱۵۷
۱۷۹۔ ایضاً ص ۱۶۰
۱۸۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھ پوری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء ص ۳۴
۱۸۱۔ جوش ملیح آبادی: روحِ ادب وسیف وسبو، کراچی: الہلال بک سنٹر، ۲۰۰۹ء ص ۵۶
۱۸۲۔ ایضاً ص ۴۰۵
۱۸۳۔ ایضاً ص ۲۳
۱۸۴۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو غزل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۸ء ص ۶۳۳
۱۸۵۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو غزل، ص ۶۸۰
۱۸۶۔ فراق گورکھ پوری: شبنمستان، لاہور: الادب، طبع دوم، ۱۹۷۹ء، ص ۴۳
۱۸۷۔ ایضاً ص ۸۶

۱۸۸۔ ایضاً،ص۱۱۴

۱۸۹۔ ایضاً،ص۱۳۱

۱۹۰۔ ایضاً،ص۱۳۴

۱۹۱۔ ایضاً،ص۱۴۴

۱۹۲۔ ایضاً،ص۲۷۷

۱۹۳۔ ریاض صدیقی: فراقؔ کی شاعری کا سماجیاتی مطالعہ، مشمولہ: ارتقاء (فراق نمبر) ش:۳۶، کراچی، س۔ن،ص۱۰۸۔۱۰۹

۱۹۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھ پوری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۱۳

۱۹۵۔ فیض، فیض احمد: نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن ص۶۳

۱۹۶۔ ایضاً،ص۹۵

۱۹۷۔ ایضاً،ص۸۸

۱۹۸۔ فتح محمد ملک: اندازِ نظر،ص۱۲۷

☆ ایسے ادب دوست خاندانوں میں ڈی سلوا اور ڈی کاستا خاندان (پرتگیزی)، فیلوز خاندان (اطالوی) فانتوم اور لیزا خاندان (فرانسیسی) اور گارڈنر خاندان (برطانوی) شرق شناسی میں نمایاں تھے۔
(ڈاکٹر جواز جعفری: تصورات، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء ص۱۳۶)

۱۹۹۔ علی محمد سردار، دیباچہ: تذکرہ یورپین شعرائے اردو، حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۴ء، ص۹

۲۰۰۔ سہیل احمد صدیقی: اردو کے فرنگی شعرا تحقیق کا ایک دل چسپ باب، مشمولہ: روزنامہ ایکسپریس، ۱۳ مئی ۲۰۱۰ء

۲۰۱۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر: اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات، لاہور، مکتبہ خیابان، ۱۹۸۵ء

۲۰۲۔ عطش درانی، ڈاکٹر: اردو زبان اور یورپی اہل قلم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

☆ مغربی شعرا کا ذکر بالخصوص ذیل کے تذکروں میں ملتا ہے:

i۔ شیفتہ، مصطفیٰ خاں، نواب: گلشن بے خار، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء

ii۔ کریم الدین، منشی: طبقات الشعرا، دہلی: مطبع دہلی، ۱۸۴۷ء

iii۔ باطن، قطب الدین خاں: گلستان بے خزاں، لکھنؤ: مطبع نولکشور، ۱۸۷۵ء

iv۔ رنج، فصیح الدین، حکیم: بہارستان ناز، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء

v۔ علی محمد سردار: تذکرہ یورپین شعرائے اردو، حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعتِ اردو، ۱۹۴۴ء

۲۰۳۔ کلیاتِ انشا، ج: اوّل، ص ۶۳

۲۰۴۔ کلیاتِ میر، ص ۴

۲۰۵۔ میرین مالٹینو: اردو شاعری تک پہنچنے کا راستہ، مترجم: محمد سرور رجا، مشمولہ: اردو ادب کی جستجو، از: رالف سل، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷

☆ شورؔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ پانچ اردو اور "گلشن فرنگ" نامی ایک فارسی دیوان لکھا۔ منشی کریم الدین کے ہاں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ان کی ایک مثنوی جو ۱۸۵۷ء کے غدر دہلی کے تناظر میں لکھی گئی، خاصی اہم ہے۔ اس میں انھوں نے بادشاہ دہلی کے انقلابیوں کے ہاتھوں یرغمال بننے اور پھر فرنگی مداخلت سے غدر فرو ہونے تک کے چیدہ چیدہ واقعات بہ خوبی رقم کیے ہیں، نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہا شہ سے فتویٰ یہ دو ہمیں
فرنگی کا ہم قتل جائز کہیں
لگا مورچہ جب کہ دہلی کے پاس
اڑے سب تلنگوں کے ہوش و حواس
گھسے گورے کشمیری دروزہ سے
کیا حملہ سب نے ایک اندازہ سے
بہا پھر تو وہ خون کالوں کا واں
کہ بازار سب ہو گیا خوں فشاں

مشاہیر دہلی پر ٹوٹنے والے قہر اور نتیجتاً ان کی اندوہ ناک اموات کا ذکر بھی کیا ہے مگر انھوں نے قاتل پر حرف کہیں نہیں آنے دیا۔

(محمد سردار علی: تذکرہ یورپین شعرائے اردو، ص ۳۲۔۳۵)

۲۰۶۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر: اردو شاعری: ۱۸۵۷ء کے بعد، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اردو ادب، ص ۲۵

۲۰۷۔ شورؔ، جارج پیش، سر، منقول از: تذکرہ یورپین شعرائے اردو، ص ۳۲

۲۰۸۔ ایضاً

۲۰۹۔ ایضاً

۲۱۰۔ علی، محمد سردار: یورپین شعرائے اردو، ص ۱۴

۲۱۱۔ آزاد، الیگزینڈر ہیڈرلی، منقول از: تذکرہ یورپین شعرائے اردو، ص ۱۵

۲۱۲۔ ایضاً،ص ۱۷

۲۱۳۔ ایضاً،ص ۱۸

۲۱۴۔ ایضاً،ص ۱۵

۲۱۵۔ شکر، ڈانیال گارڈنر، منقول از: تذکرہ یورپین شعرائے اردو،ص ۲۷

۲۱۶۔ ایضاً

۲۱۷۔ کلیات اقبال،ص ۳۴۹

۲۱۸۔ فراسو، کوئیس کوئینس، منقول از: تذکرہ یورپین شعرائے اردو،ص ۴۶

۲۱۹۔ ایضاً

۲۲۰۔ ایضاً،ص ۴۸

☆ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ موصوفہ کا نام مسیح جان عرف بادشاہ بیگم خفی تھا۔ داغ دہلوی کی والدہ چھوٹی بیگم جب ۱۸۳۷ء میں مارسٹن بلیک سے وابستہ ہوئیں تو وہاں ان کے ہاں ایک بیٹا امیر مرزا اور بیٹی مسیح جان خفی پیدا ہوئے تھے۔

۲۲۱۔ خفی، مسیح جان، منقول از: تذکرہ یورپین شعرائے اردو،ص ۲۴

۲۲۲۔ ایضاً

۲۲۳۔ کلیاتِ اقبال،ص ۳۷۹

۲۲۴۔ میرین مالٹینو: اردو شاعری تک پہنچنے کا راستہ، مشمولہ: اردو ادب کی جستجو،ص ۳۳

۲۲۵۔ گپتا، پی۔سی: ۱۸۵۷ء اور ہندی ادب، مشمولہ: ۱۸۵۷ء ادب، سیاست اور زندگی،ص ۲۵۸

۲۲۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: انداز نظر،ص ۸۸

ماحصل و نتائج

آساں نہیں اقوال سے اخراجِ نتائج

یہ بات ہے کچھ دانشِ آثار پہ موقوف

(حسرتؔ: کلیاتِ حسرت، ص۱۷۹)

ماحصل ونتائج

اُردو غزل کے نوآبادیاتی تناظرات کی اس مبسوط بحث سے جو نتائج سامنے آتے ہیں انھیں پیش کرنے سے پہلے واضح رہے کہ یہ تمام استنباط ''میری قرأت'' کا ماحصل ہے۔ اس ضمن میں جن ناقدین کی موید/مخالف آرا میسر آئیں، ان کے فوری سیاق وسباق سے حتی المقدور واقفیت حاصل کر کے ہی انھیں بہ طور حوالہ مقالے میں استعمال کیا گیا ہے۔ تاہم پھر بھی ع ''کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں''۔ یہ تعبیری اختلافات تفہیمی کج روی یا التباس نظر کے بہ جاے دراصل متن کی اشارتی زرخیزی (Suggestive Richness) پر دال ہیں۔ جدید تنقیدی بصیرت معنی کی وحدانیت کو تعبیری قدر کے طور پر تسلیم نہیں کرتی۔ کسی شاعر یا ناقد کے متعلق دانستہ طور پر کج روی اختیار کرنا ادبی دیانت داری کو اپنے ہاتھ سے دینے کے مترادف ہے۔ نوآبادیاتی صورت حال سے متعلق اردو غزل کے جو مختلف مباحث یہاں اٹھائے گئے ہیں ان کا ملخص یہ ہے کہ:

۱۔ مغربی اقوام کے ورود سے ہی اردو غزل میں ان کا نمائندہ کردار شامل کر لیا گیا تھا۔

۲۔ مغربی تہذیب اور اہل مغرب سے متعلق متغزلین کا فکری رویّہ ہمیشہ معروضی رہا ہے یعنی اس صنف کی علامتی زبان میں اپنا مافی الضمیر تخلیق کرنے کے لیے سماجی دباؤ کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔

۳۔ جب تک یورپی اقوام نے مقامی سیاست سے لاتعلق رہتے ہوئے اپنی تاجرانہ حیثیت قائم رکھی، اردو غزل ان کا استحسان کرتی رہی۔

۴۔ برطانوی دورِ حکومت میں غزل نہ صرف درباری سرپرستی سے محروم ہوگئی بل کہ سرکاری سطح پر اسے مخالفانہ رویے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

۵۔ مقدمۂ شعر و شاعری اور اس سے مطابقت رکھنے والا غزل کا اسلوب نوآبادیاتی کلامیے ہی کا لازمی شاخسانہ تھا۔

۶۔ برطانوی اقتدار اور یورپی تہذیب سے متعلق اردو غزل کا مجموعی طرزِ احساس شدید مزاحمتی ہے۔

۷۔ حکومت انگلشیہ کے بالخصوص پہلے نصف دور میں صنفِ غزل کے اسمائے ضمیر کی نئی معنویت متعین ہوچکی تھی اور غزل کا قاری ان ضمائر کی متعینہ نئی ابعاد کو بہ آسانی محسوس کر سکتا ہے۔

۸۔ برطانوی عہد حکومت میں غزل کی قلبِ ماہیت ہوئی اور ایسی جدید غزل سامنے آئی جو تحریک آزادی کے تقاضوں کو بہ خوبی نبھا سکے۔ جدید غزل نے اپنے یک سطحی اظہاری قرینے کی بنا پر تحریک آزادی کی نظریاتی تشکیل میں بھرپور حصہ لیا تاہم ایسے میں کہیں کہیں اس کا پیرہنِ تغزل مسک ضرور گیا ہے۔

۹۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بنی تو تحریک آزادی اپنے نتیجہ خیز دور میں داخل ہوچکی تھی۔ چوں کہ اس انجمن کا سیاسی منشور بھی کافی حد تک آزادی کی تحریک سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے ترقی پسند شعرا نے نوآبادیاتی شعور سے مملو غزلیں بھی بہ خوبی کہی ہیں۔

۱۰۔ بہت سے مغربی شعرا بھی اردو غزل میں دل چسپی لیتے تھے تاہم ان کی غزلیں محض تقلیدی نوعیت کی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ یورپی طرزِ احساس اور مقتدر کلامیے کے آثار ان غزلیات میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

تمت بالخیر

کتابیات

کتابیات

القرآن

۱۔ آغا سہیل، ڈاکٹر: ادب اور عصری حسیت، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء

۲۔ ابوالکلام قاسمی: مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، ۲۰۰۰ء

۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: لکھنؤ کا دبستان شاعری، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۷ء

۴۔ احمد، محمد جمیل: اردو شاعری پر ایک نظر، کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۶ء

۵۔ اخلاق احمد: یادوں کا سفر، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء

۶۔ ادیب، مسعود حسین رضوی، سید: ہماری شاعری۔ معیار و وسائل، تلخیص و ترتیب: ایس۔ ایم۔ شاہد، لاہور: نذر سنز، طبع دوم، ۱۹۸۶ء

۷۔ السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن: الاتقان فی علوم القران، کراچی: میر محمد کتب خانہ، س۔ن

۸۔ امجد، امجد سلام: نئے پرانے، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۰ء

۹۔ انتظار حسین: علامتوں کا زوال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں، لاہور: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۳ء

۱۱۔ انیس ناگی: تشکیلات، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۶ء

۱۲۔ انیس ناگی: غالب ــــــ ایک شاعر ایک اداکار، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء

۱۳۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت، لاہور: مکتبہ اردو، س۔ن

۱۴۔ تمکین کاظمی: داغ، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۰ء

۱۵۔ جذبی، معین احمد: حالی کا سیاسی شعور، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء

۱۶۔ جعفر احمد، سید، ڈاکٹر: جہات حسرت، کراچی: حسرت موہانی میموریل ٹرسٹ، پاکستان سٹڈی سنٹر، ۲۰۰۸ء

۱۷۔ جواز جعفری: تصورات، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء

۱۸۔ جوش ملیح آبادی: اشارات، دہلی: نگارستان ایجنسی، س۔ن

۱۹۔ حالی، الطاف حسین: مقدمہ شعر و شاعری، لاہور: کشمیر کتاب گھر، س۔ن

۲۰۔ حالی، الطاف حسین: یادگارِ غالب، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۲ء
۲۱۔ حسرت موہانی: قیدِ فرنگ، مہتمم: اقبال فیروز، فیصل آباد: طارق اکیڈمی، ۱۹۷۸ء
۲۲۔ حسن اختر، ڈاکٹر، ملک: اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک، لاہور: یونی ورسل بکس، ۱۹۸۶ء
۲۳۔ حسن اختر، ڈاکٹر ملک: تہذیب و تخلیق، طبع دوم، لاہور: یونی ورسل بکس، ۱۹۸۹ء
۲۴۔ حفیظ جالندھری: نثرانے، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء
۲۵۔ خلیق انجم: غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتہ کے ادبی معرکے، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۵ء
۲۶۔ خلیق انجم: متنی تنقید، دہلی: دہلی یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء
۲۷۔ داؤد رہبر، ڈاکٹر: مشاعرے کا فاتح، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۹ء
۲۸۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر: اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء
۲۹۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر: مولانا ظفر علی خاں حیات، خدمات و آثار، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء
۳۰۔ رضی مجتبیٰ: جدید ادب کا تناظر، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۴ء
۳۱۔ رضیہ نور محمد: اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات، لاہور: مکتبہ خیابان، ۱۹۸۵ء
۳۲۔ ساجد امجد، ڈاکٹر: اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی و ثقافتی اثرات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
۳۳۔ سالک، عبدالمجید: ذکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، س۔ن
۳۴۔ سعداللہ کلیم، ڈاکٹر: اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں (جلد اول)، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
۳۵۔ سعداللہ کلیم، ڈاکٹر: اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں (جلد دوم)، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
۳۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اقبال اور ہمارے تنقیدی رویے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن
۳۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
۳۸۔ سہیل احمد، ڈاکٹر: طرفین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء
۳۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر: تعبیر کی شرح، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء
۴۰۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
۴۱۔ صدیق جاوید: بالِ جبریل کا تنقیدی جائزہ، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء

۴۲۔ صفدر میر: آخرشب، لاہور: کلاسیک، ۱۹۷۸ء
۴۳۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر: اردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س۔ن
۴۴۔ عابد، عابد علی: اصول انتقاد ادبیات، لاہور: سنگ میل پبلشرز، ۱۹۶۶ء
۴۵۔ عابؔد، عابد علی: انتقاد ادبیات (مقالاتِ عابد)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء
۴۶۔ عابؔد، عابد علی: شعر اقبال، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۷۷ء
۴۷۔ عارف ثاقب: انجمن پنجاب کے مشاعرے، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
۴۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر: غزل اور مطالعہ غزل، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء
۴۹۔ عبدالسلام ندوی: شعر الھند، حصہ دوم، طبع: چہارم، اعظم گڑھ: معارف، ۱۹۵۴ء
۵۰۔ عبدالقادر سروری: جدید اردو شاعری، حیدرآباد دکن: کتب خانہ عزیزیہ، ۱۹۳۹ء
۵۱۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید: نقد میر، لاہور: مکتبہ خیابان، ۱۹۶۸ء
۵۲۔ عبداللہ یوسف علی، علامہ: انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء
۵۳۔ عزیز احمد: ترقی پسند ادب، ملتان: کاروان ادب، ۱۹۹۳ء
۵۴۔ عطش درانی، ڈاکٹر: اردو زبان اور یورپی اہل قلم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء
۵۵۔ عظمت اللہ خان: انتخاب مضامین عظمت، راولپنڈی: نور آرٹ پریس، ۱۹۶۵ء
۵۶۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر: تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء
۵۷۔ علی سردار جعفری، ڈاکٹر: نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور: عذرا پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
۵۸۔ عندلیب شادانی: دور حاضر اور اردو غزل گوئی: طبع دوم، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء
۵۹۔ غالب: اردوئے معلیٰ، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۴ء
۶۰۔ غالب: خطوط غالب، مہتمم: غلام رسول مہر، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء
۶۱۔ فتح محمد ملک: اقبال فراموشی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء
۶۲۔ فتح محمد ملک: انداز نظر، لاہور: سنگ میل ۱۹۹۹ء
۶۳۔ فتح محمد ملک: تعصبات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۶۴۔ فخر الحق نوری: آزادی کی گونج، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۶۵۔ فراق گورکھ پوری: اندازے، طبع دوم، لاہور: ادارہ فروغ ادب، ۱۹۶۸ء

۶۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۸ء

۶۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۶۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھ پوری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۶۹۔ فیض: نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن

۷۰۔ کشفی، محمد ابوالخیر، سید: اردو شاعری کا سماجی اور تاریخی پس منظر (۱۷۰۷۔۱۸۵۷ء)، لاہور: نشریات، ۲۰۰۷ء

۷۱۔ مالک رام: ذکر غالب، لاہور: مکتبہ شعر و ادب، س۔ن

۷۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۷۳۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر: مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء

۷۴۔ محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، طبع دوم، لاہور: فیروز سنز، س۔ن

۷۵۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ: اکبر الٰہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء

۷۶۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: جنگ آزادی کے اردو شعرا، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت۔ س۔ن

۷۷۔ مغنی تبسم: فانی بدایونی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۶۹ء

۷۸۔ ملا واحدی: حیاتِ اکبر، کراچی: بزمِ اکبر، س۔ن

۷۹۔ منظور حسین، خواجہ: اُردو غزل کا خارجی روپ بہروپ، لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۸۱ء

۸۰۔ منظور حسین، خواجہ: تحریک جدوجہاد بطور موضوعِ سخن، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۸ء

۸۱۔ نارنگ، گوپی چند: ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۸۲۔ نارنگ، گوپی چند: ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۸۳۔ نارنگ، گوپی چند: سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۸۴۔ ناشاد، ارشد محمود، ڈاکٹر: اردو غزل کا تکنیکی و ہیئتی اور عروضی سفر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء

۸۵۔ ناظر کاکوروی: حالی کا نظریۂ شعری، الٰہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء

۸۶۔ نصیر الدین، ہاشمی: دکنی کلچر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء

۸۷۔ نصیر الدین ہاشمی: دہلی کا دبستانِ شاعری، لاہور: بک ٹاک، ۱۹۹۱ء

۸۸۔ نظیر، اصغر حسین خاں: اکبرالہ آبادی، لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن

۸۹۔ نفیس احمد صدیقی، ڈاکٹر: حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، پٹنہ (انڈیا): خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۸ء

۹۰۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر: مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، کراچی: اوکسفورڈ، ۲۰۱۳ء

۹۱۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر: متن، سیاق اور تناظر، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۲ء

۹۲۔ وحید قریشی، ڈاکٹر: جدیدیت کی تلاش میں، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء

۹۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: تنقید اور جدید تنقید، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۹ء

۹۴۔ وقار احمد، ڈاکٹر سید: تاریخ نقد، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء

۹۵۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو غزل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء

۹۶۔ یوسف حسین، ڈاکٹر: اردو غزل، لاہور: آئینہ ادب، طبع چہارم، ۱۹۶۴ء

دواوین

۹۷۔ آتش، حیدر علی: کلیات آتش، ج: اوّل، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء

۹۸۔ اکبرالہ آبادی: کلیات اکبر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۹۹۔ انشا، انشاءاللہ خاں: کلیات انشا، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۹ء

۱۰۰۔ تاثیر، محمد دین: آتش کدہ، ناشر: بی بلقیس تاثیر، مقام ندارد، س۔ن

۱۰۱۔ جرأت، قلندر بخش: کلیات جرأت، جلد: اوّل، مرتبہ: ڈاکٹر اقتدا حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء

۱۰۲۔ جوش ملیح آبادی: روح ادب وسیف وسبو، کراچی: الہلال بک سنٹر، ۲۰۰۹ء

۱۰۳۔ جہاں دار، مرزا جواں بخت: دیوان جہاں دار، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

۱۰۴۔ حاتم: ظہور الدین: دیوان زادہ، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۵ء

۱۰۵۔ حالی، الطاف حسین: دیوان حالی، لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۱۰۶۔ حسرت موہانی: کلیات حسرت، مرتبہ: بیگم حسرت موہانی، لاہور: علی ہجویری پبلشرز، س۔ن

۱۰۷۔ داغ دہلوی: آفتاب داغ، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۱ء

۱۰۸۔ داغ دہلوی: مہتاب داغ، مرتبہ: سید سبط حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء

۱۰۹۔ داغ دہلوی: یادگارِ داغ، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۲ء

۱۱۰۔ درد: دیوان درد، مرتبہ: عبدالباری آسی، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، س۔ن

۱۱۱۔ ذوق، محمد ابراہیم: کلیات ذوق، مرتبہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء

۱۱۲۔ سجاد دہلوی، نظیر حسن: کلیات مولانا سجاد دہلوی، مرتبہ: ضیاء الحسن نقوی، راول پنڈی: راول پنڈی میسرز بک کمپنی، س۔ن

۱۱۳۔ سودا، رفیع الدین: کلیات سودا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۱۱۴۔ ظفر، بہادر شاہ: کلیات ظفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۱۱۵۔ غالب، دیوان غالب کامل، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع سوم، ۱۹۹۶ء

۱۱۶۔ فراق گورکھ پوری: شبنمستان، لاہور: مرکز الادب، طبع دوم، ۱۹۷۹ء

۱۱۷۔ قائم چاند پوری: کلیات قائم، مرتبہ: اقتدا حسن، جلد اول، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء

۱۱۸۔ محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم، ۱۹۹۳ء

۱۱۹۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیاتِ مصحفی، دیوان اول، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء

۱۲۰۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیاتِ مصحفی، دیوان دوم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء

۱۲۱۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیاتِ مصحفی، دیوان سوم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء

۱۲۲۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیاتِ مصحفی، دیوان چہارم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

۱۲۳۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیاتِ مصحفی، دیوان پنجم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء

۱۲۴۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیاتِ مصحفی، دیوان ششم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء

۱۲۵۔ مصحفی، غلام ہمدانی: کلیاتِ مصحفی، دیوان ہفتم، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۵ء

۱۲۶۔ میر تقی میر: کلیاتِ میر، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز: ۲۰۰۸ء

۱۲۷۔ ناسخ، امام بخش: کلیاتِ ناسخ، ج: اوّل، مرتبہ: یونس جاوید، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء

۱۲۸۔ نظیر اکبر آبادی: کلیاتِ نظیر، مرتبہ: عبدالباری آسی، طبع: دوازدھم، لاہور: مکتبہ شعر ادب، ۱۹۸۶ء

۱۲۹۔ ولا، مظہر علی: دیوان ولا، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور: ادارہ ادب وتنقید، ۱۹۸۳ء

۱۳۰۔ ولی دکنی: کلیاتِ ولی، مرتبہ: نور الحسن ہاشمی، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

فارسی دواوین

۱۳۱۔ اقبال: کلیاتِ اقبال (فارسی)، طبع پنجم، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء

۱۳۲۔ حافظ: دیوان حافظ، مترجمہ: قاضی سجاد حسین، لاہور: پروگریسو بکس، س۔ن

۱۳۳۔ غالب: کلیاتِ غالب (فارسی)، ج: اوّل، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۷ء

۱۳۴۔ غنی کاشمیری: دیوان غنی کاشمیری، بہ کوشش: احمد کرمی، طبع: اول، سلسلہ نشریات "ما" ۱۳۶۲، ح۔ش

تذکرہ جات

۱۳۵۔ شیفتہ، غلام مصطفیٰ خاں: گلشن بے خار، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء

۱۳۶۔ عبدالحئی، مولوی: گل رعنا، لاہور: عشرت پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۶۴ء

۱۳۷۔ قاسم، قدرت اللہ: تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ: محمود شیرانی، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۳۳ء

۱۳۸۔ قائم چاندپوری: مخزن نکات، مرتبہ: ڈاکٹر اقتدا احسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

۱۳۹۔ مصحفی، غلام ہمدانی: ریاض الفصحاء، مرتبہ: مولوی عبدالحق، اورنگ آباد: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۴ء

۱۴۰۔ ناصر، سعادت علی خاں: تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، جلد اول، مرتبہ: مشفق خواجہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء

۱۴۱۔ نصر اللہ خویشگی: گلشن ہمیشہ بہار، مرتبہ: اسلم فرخی، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۷ء

۱۴۲۔ یقین، انعام اللہ خاں: مخزن نکات، مرتبہ: ڈاکٹر اقتدا احسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

مرتبہ/مترجمہ کتب

۱۴۳۔ احمد سلیم (مرتب): ۱۸۵۷ء ادب، سیاست اور معاشرہ، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۱ء

۱۴۴۔ احمد سلیم (مرتب): موج زر، از: فیض احمد فیض، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۰ء

۱۴۵۔ احمد سلیم (مرتب): ہندوستان کا تاریخی خاکہ، از: کارل مارکس، لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۲ء

۱۴۶۔ الیاس میراں پوری (مرتب): جدید شعری روایت، ملتان: بیکن بکس، ۱۰۱۲ء

۱۴۷۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر (مرتبین): آزاد صدی مقالات، لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء

۱۴۸۔ جعفر احمد، سیّد (مرتب): افکار تازہ، از: سبط حسن، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۸ء

۱۴۹۔ رجا، محمد سرور (مترجم): اردو ادب کی جستجو، از: رالف رسل، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۳ء

۱۵۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر (مرتب): اقبال ممدوح عالم، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۷۸ء

۱۵۱۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر؛ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر (مرتبین): ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان ادب، لاہور، کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۰۸ء

۱۵۲۔ عشرت رحمانی (مرتب): اردو ادب کے ساٹھ سال، لاہور: کتاب منزل، س۔ن

۱۵۳۔ کامل قریشی (مرتب): داغ دہلوی، حیات اور کارنامے، لاہور: پروگریسو بکس، ۱۹۸۸ء

۱۵۴۔ کوکب، تفضل حسین: فغان دہلی، دہلی: بدالدجیٰ پریس، ۱۹۸۶ء

۱۵۵۔ محمد احسن بٹ (مترجم): تہذیبوں کا تصادم، از: سیموئیل پی ہنٹنگٹن، لاہور: مثال پبلیشنگ، ۲۰۰۳ء

۱۵۶۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ (مترتب): مکتوبات سرسید، ج: اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء

۱۵۷۔ محمد باقر لکھنوی (مرتب): منظوم خطوط، کراچی: ۱۵۔ڈی رضویہ سوسائٹی، س۔ن

۱۵۸۔ محمد حیات خاں سیال (مرتب): احوال نقد غالب، لاہور: نذر سنز، ۱۹۶۸ء

۱۵۹۔ محمد زکریا، ڈاکٹر، خواجہ (مرتب): نثر اکبر الہ آبادی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء

۱۶۰۔ محمد ہارون، ڈاکٹر (مرتب): کلیات نظم آزاد، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۱۶۱۔ مظفر حسین برنی، سید (مرتب): کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء

۱۶۲۔ مغنی تبسم (مرتب): فانی بدایونی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۶۹ء

۱۶۳۔ مہر، غلام رسول (مرتب): خطوط غالب، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء

۱۶۴۔ ناصر کاظمی؛ انتظار حسین (مرتبین): ۱۸۵۷ء خیال نمبر، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۷ء

۱۶۵۔ نثار احمد فاروقی (مترجم): میر کی آپ بیتی، از میر تقی میر، لاہور: مجلس ترقی ادب، س۔ن

۱۶۶۔ وحید عشرت، ڈاکٹر (مرتب): اقبال ۸۶ء، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء

۱۶۷۔ وہاب اشرفی (مرتب): کاشف الحقائق، از: امداد امام اثر، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء

ادبی تواریخ

۱۶۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: اردو ادب کی تاریخ، (ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۱۶۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، ج: سوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء

۱۷۰۔ عملہ ادارت: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۷، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۱ء

۱۷۱۔ عملہ ادارت: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۸، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء

۱۷۲۔ عملہ ادارت: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۹، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء

۱۷۳۔ عملہ ادارت: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۱۰، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء

غیر مطبوعہ مقالہ جات

۱۷۴۔ امیر، عبدالرؤف: اردو غزل: مخالفت و مدافعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم۔فل اردو مخزونہ: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

۱۷۵۔ شبیہ الحسن سید: لکھنؤ کی اردو شاعری (۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک)، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، مخزونہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور

لغات و تشریحی کتب

۱۷۶۔ الیاس، الیاس انطون (مولف): القاموس العصری، قاہرہ: المطبۃ العصریہ، طبع ہشتم، ۱۹۵۷ء

۱۷۷۔ دھخدا، علی اکبر: لغت نامہ دھخدا، شمارہ حرف ''غ'': 1، تہران: سال ۱۳۳۵ خورشیدی

۱۷۸۔ عملہ ادارت: المنجد، کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۶۲ء، ص ۸۷۵

۱۷۹۔ عملہ ادارت: فرہنگ اصطلاحات، جلد: اول (اے تا ڈی)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء

۱۸۰۔ قاسم محمود، سید: اسلامی انسائیکلوپیڈیا، لاہور: الفیصل، س۔ن

انگریزی کتب

181. Cuddon, J.A: Dictionary of Litrary Terms, London: Penguin Books, 1994.

182. Encyclopedia of Social Sciences, Vol: 3, New York: The Macmillan Company, 1963

183 Encyclopedia of World History, London: Peerag Books, 1985

184. Katherine Mayo: Mother India, London: Jonathon Cape, Edi. VIII, 1936.

185 Muhammad Iqbal: Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore:Sh. Muhammad Ashraf, 1965

186. Muhammad Sadiq: A history of Urdu Literature, London: Oxford, 1960.

187. Oxford English Dictionary, New York: Oxford 2003

188. Oxford English Urdu Dictionary, Karachi : Oxford 2005

189. Philip Drew: The Poetry of Browning (A critical Introduction), London: Methuen and Co. L.T.D. 1970

190. S.Warshaw and C.D Bromwell, India Emerges, SanFrancisco, (California): Confield Press, 1974

191. Water Laqueur: A Dictionary of Politics, London: Weidenfeld and Nicolson, 1960.

اخبارات ورسائل

۱۹۲۔ ادب لطیف (گولڈن جوبلی نمبر)، ج:۵۲، ش:۱۲

۱۹۳۔ ادب وثقافت، فیصل آباد، جنوری ۲۰۰۹ء

۱۹۴۔ ادبیات، اسلام آباد: ج:۳، ش:۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱، اکتوبر ۱۹۸۹ء تا جون ۱۹۹۰ء

۱۹۵۔ ارتقا (فراق نمبر) کراچی، شمارہ ۳۶، س۔ن

۱۹۶۔ اردونامہ، لاہور، ج:۲۶۔۲۷، ش ۱۔۳۔۴، جولائی ۲۰۰۹ء تا مارچ ۲۰۱۰ء

۱۹۷۔ الاقرباء، اسلام آباد: ج:۹، ش:1، جنوری۔مارچ ۲۰۰۶ء

۱۹۸۔ بازیافت، ش:۲۳، لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء

۱۹۹۔ جنرل آف ریسرچ، شمارہ: ۱۵، بی۔زیڈ۔یو، ملتان ۲۰۱۲ء

۲۰۰۔ دنیازاد، کتاب نمبر ۱۶، دسمبر ۲۰۰۵ تا جنوری ۲۰۰۶ء

۲۰۱۔ روزنامہ ایکسپریس، فیصل آباد، جمعرات ۱۳ مئی ۲۰۱۰ء

۲۰۲۔ سویرا، ش:۷۰، مرکز الادب، قوسین

۲۰۳۔ سیپ، کراچی (خاص نمبر)، ش:۷۵، ۲۰۰۶ء

۲۰۴۔ فنون، لاہور (جدید غزل نمبر)، لاہور، ۱۹۶۹ء

۲۰۵ فنون، لاہور: ش ۱۱۱، اگست۔دسمبر ۱۹۹۹ء

۲۰۶۔ ماہِ نو، لاہور: ج:۵۶، ش ۲، فروری ۲۰۰۳ء

۲۰۷۔ نقاط، فیصل آباد، ادبی ادارہ نقاط، ش:۹، ۲۰۱۰ء

۲۰۸۔ نقاط (نظم نمبر)، فیصل آباد، ادبی ادارہ نقاط، ش:۱۰، ۲۰۱۱ء

۲۰۹۔ نقوش (اقبال نمبر)، لاہور، نومبر، ۱۹۷۷ء

۲۱۰۔ نقوش، لاہور (غزل نمبر)، طبع چہارم، اکتوبر، ۱۹۷۵ء

۲۱۱۔ نیادور: کراچی (خاص نمبر)، ش:۵۷۔۵۸

''یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے منفرد نظر آتی ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ارباب ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔''

(پروفیسر ڈاکٹر ابن کنول، دہلی انڈیا)

''یہ کتاب جدید لسانی بصیرتوں سے آگاہ ہو کر ہمارے کلاسیکل ادبی سرمائے کو نئے معنوی امکانات سے ہم کنار کرنے کی ایک کاوش ہے۔ اس میں امکان سہو کا اضطراب بھی ہے اور دلیل و برہان کی شائستگی بھی۔ یہی حضور و اضطراب اس علمی کاوش کا خاصہ ہے۔ میں اسے انہیں کتابوں میں شمار کرتا ہوں جو ولادت میں ہی بلوغت سامان ہوتی ہیں۔''

(ڈاکٹر محمد آصف اعوان، فیصل آباد)

''محمد رؤف نے اپنے مقالے میں داغ کی شاعری کے استعمار مخالف آہنگ کو نمایاں کیا ہے تو ہمیں گمان گزرتا ہے کہ اب تک اردو تنقید نے داغ دہلوی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔۔۔ مجھے امید ہے کہ اس حوالے سے زیرِ نظر مقالے کا داغ کی شاعری پر لکھا گیا تنقیدی شندرہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا۔''

(امجد طفیل، لاہور)

''اردو غزل: مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، اپنے موضوعاتی دائرے میں اولین سطح کے کاموں میں شمار ہوتا ہے جو انتہائی اہم، قابل توجہ اور لائق تحسین ہے۔ اس شاندار تحقیق کے بعد اس موضوع پر جرأت مندانہ اور بے باک تحقیق و تنقید کی بہت زیادہ گنجائش کا امکان ابھرے گا۔''

(ڈاکٹر روش ندیم، اسلام آباد)